شاعر
شاعر
شاعر
شاعر
شاعر
شاعر
شاعر
شاعر
شاعر

نصابِ تعلیم آج کل صرف اس چیز کا نام ہے جو سفارش اور رعایت کے اجزا سے مرکب ہوتی ہے جس میں طلباء کا فائدہ بہت کم اور واضعانِ نصاب کا فائدہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کورس کی اکثر کتابیں جانب داری اور سفارشوں کی سازشوں سے تیار اور منتخب ہوتی ہیں جن پر مصنف، پبلشر اور مصنف کے احباب اپنی مہریں ثبت کر کے سررشتۂ تعلیم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ سررشتۂ تعلیم جو طلباء کی ضرورتوں سے تو واقف ہوتا ہے لیکن اس سازش سے واقف نہیں ہوتا، چند متحدہ آوازوں سے مرعوب ہو کر اس ناقص نصاب کو نافذ کرنے کی منظوری دے دیتا ہے لیکن جب وہ نصاب طلباء کے سامنے آتا ہے تو عملاً ان کی فطری اور اخلاقی تربیت کے لیے اس میں کوئی زندگی نہیں ہوتی۔

[۹ فروری ۱۹۳۴ء، خطبۂ صدارت مشاعرہ انجمن ترقی اردو، سینٹ جانس کالج۔ آگرہ]

سیماب اکبرآبادی

جلد ــــ ۶۷
شمارہ ــــ ۱
فون: ۳۸۲۹۹۰۴

جنوری ۱۹۹۶ء

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۳۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ــ ۱۵ پونڈ

سرورق
پرواز
عمل
سلطان سبحانی

مکتوبات

شمارہ - ١ [جنوری ٩٦ء] جلد ٦٧

نیا سال مبارک ہو ———

سال ۱۹۹۲ کا شمارہ اولین آپ کے مطالعہ کیلئے پیش ہے۔ ہمعصر اردو ادب نمبر کی بے طرح مصروفیات کے باوجود شاعر کے تمام شماروں کو بروقت شائع کرنے کی کوششوں میں ہم کامیاب رہے ہیں۔ ہماری اس کامیابی میں شاعر کے بے شمار قارئین کی دلچسپی تجسس اور بھرپور عملی تعاون شامل رہا ہے۔ شاعر کے تمام قارئین کو نیا سال بہت مبارک ہو۔ ان تمام لوگوں کو بھی دلی مبارکباد جنہوں نے کارڈس اور فون کے ذریعے ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔

یہ شمارہ، خاص شمارہ

شاعر کے تمام شماروں کیلئے نئے سال میں کچھ اور خواب بھی ہیں۔ شاعر کا ہر شمارہ ایک نیا تخلیقی تجربہ ہوتا ہے۔ مضامین نثر نظم سے جہاں حیرت خلق کرنا اور اپنے قارئین کو بصیرتوں سے اور مسرتوں سے سرشار کرنا ہی ہماری انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے۔ شاعر کیلئے ہمارے جو بھی خواب ہیں ان کی خوبصورت تعبیر آپ ہی سے ممکن ہے۔ یہ نیا شمارہ بھی ایک خاص شمارہ ہے۔ یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟

ہمعصر اردو ادب نمبر

ہمعصر اردو ادب نمبر (دو جلدیں) کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر سے پوری اردو دنیا میں انتظار، اضطراب و تجسس کی جو فضا بنی ہوئی ہے وہ اب صبر کی تمام انتہاؤں سے گزر جانا چاہتی ہے۔ ہمیں اس کا شدید احساس ہے لیکن نہ تو ہم اس کیلئے شرمندہ ہیں اور نہ ہی معذرت خواہ۔

دراصل اردو شعر و ادب کے عالمی افق کی ترتیب، تشکیل اور تخلیقی تعبیر کا یہ ایک نادر اور منفرد تجربہ ہے۔ کہ خود ہمیں بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ سب کچھ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اور ہم سانس سانس نت نئے امتحانوں سے گزر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم بھی آپ کے اضطراب میں، آپ کے تجسس میں، آپ کے شدید انتظار میں برابر کے شریک ہیں۔ اور دعووں کے بغیر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خاص نمبر کی اشاعت میں اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

یہ انتظار تو اب ٹوٹنے ہی والا ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ ------

- کیا آپ نے اپنا زر سالانہ ارسال کر دیا ہے؟
- کیا آپ نے شاعر کے بقایاجات کی ادائگی کر دی ہے؟
- کیا آپ نے خاص نمبر (جلد اول) کی رعایتی قیمت ارسال کر دی ہے، اگر آپ سالانہ خریدار ہیں تو۔
- کیا آپ نے اپنی کاپی اپنے شہر یا علاقے کے کتب فروش کے یہاں محفوظ کروالی ہے؟
- کیا آپ نے خاص نمبر میں اپنی کتاب، رسالے، اپنے ادارے یا اپنی نیک خواہشات کا اشتہار ارسال کر دیا ہے؟
- کیا آپ شاعر کے خاص نمبر کیلئے اشتہارات کی فراہمی میں اپنا عملی تعاون دے رہے ہیں؟ کیا آپ نے شاعر کے لئے نئے خریدار بنائے ہیں؟

آپ دنیا کے کسی بھی مقام پر ہوں، ہمیں آپ کے عملی تعاون کی ضرورت ہے۔

آپ کے اپنے رسالے شاعر کیلئے ———

علامہ سیماب اکبرآبادی [۱۸۸۰ء - ۱۹۵۱ء] کی ۴۴ ویں برسی کے موقع پر ان کے تیسرے مجموعۂ نظمیات شعرِ انقلاب مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۷ء سے ایک نظم شاعر کے قارئین کی نذر ہے۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کی یہ نظم ہندوستان کی آزادی سے قبل تخلیق کی گئی تھی۔ مگر یہ نظم آج بھی اتنی ہی تازہ اور زندہ ہے جتنی کہ غلام ہندوستان کے حالات کے مطابق تھی۔ شعرِ انقلاب، بڑے سائز کے ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انقلابی سیاسی ۹۶ طویل نظمیں شامل ہیں۔ سیماب کی نظمیہ شاعری میں موضوعات و مواد، ہیئت و اسلوب اور وزن و آہنگ کا بے پناہ تنوع موجود ہے۔ ۱۹۱۶ء میں تخلیق کی گئی آزاد نظم "عیدِ قرباں" [مطبوعہ نظام المشائخ۔ دہلی] سے "سیاسی غزل" [دسمبر ۱۹۴۷ء] تک نظموں کے کئی مجموعے اور رسائل و اخبارات میں بکھری ہوئی بے شمار نظموں میں کلاسیکی، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور اس سے بھی آگے کے زمانوں کی دھمک موجود ہے۔ سیماب کی نظمیں، زمانوں زمانوں سفر کر رہی ہیں۔ اور یہ وہ شاعری ہے جس کا تاریخ مسلسل دفاع کر رہی ہے۔

میں ہوں اک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی، ہر زمانے میں

پھوٹ کا گیت

بین الاقوامی سازِ شکستہ ہے

فسادوں کی معادن خانہ جنگی کی میں بانی ہوں — دیارِ ہند میں اک بین الاقوامی نشانی ہوں
کرے کیا کام صلح و آشتی کی عارضی کوشش — کہ میں ہر دور میں اک ابتلائے جاودانی ہوں
کبھی مسجد مرا گھر ہے، کبھی مندر مرا مسکن — تقدس کے حجابوں میں تکدر کی کہانی ہوں
نہ جانے شعلۂ خفتہ کی صورت کب بھڑک اٹھوں — وبالِ اتفاقی ہوں، بلائے ناگہانی ہوں
مجھی سے گرمیاں ہیں مجلسِ اقوام کی باقی — بہ ہر عنوان میں ہنگامۂ دنیائے فانی ہوں
تسلط ہے مرا دستِ زبانِ اہلِ محفل پر — کہیں پیغامِ تحریری، کہیں وردِ زبانی ہوں
مرے مسلک میں آزادی ہے اک افسانۂ مہمل — سبق آموزِ محکومی، حریفِ حکمرانی ہوں
ہوئی ہے پرورش میری دماغِ رہنمائی میں — الگ ہوں کارواں سے اور پھر بھی کاروانی ہوں
کوئی ہندوستاں میں میرا ہمسر ہو نہیں سکتا — میں تنہا جانشینِ اتفاقِ آنجہانی ہوں
کمالِ خاص حاصل ہے لگانے اور بجھانے میں — کہیں میں آگ کا طوفاں کہیں میں سیلِ پانی ہوں
مرے سیلِ تعصب سے ابھرنا غیر ممکن ہے — عقائد کا تلاطم ہوں، مذاہب کی جوانی ہوں
عظیمت ہے کہ مجھ پر فتح پا سکتا نہیں کوئی — بہ ایں شورِ فتن معروفِ جشنِ کامرانی ہوں
نہ کیوں مغلوب ہوں یہ نوجوانانِ وطن مجھ سے — مئے دو آتشہ ہوں، مرد افگن ہوں، جوانی ہوں
کئے جائے زمانہ کوششیں میرے مٹانے کی — مرا مٹنا نہیں ممکن کہ جزوِ زندگانی ہوں

کروں میں غور شاید اس وطن سے کوچ کرنے پر
اگر ہر فرد یہ کہہ دے کہ میں ہندوستانی ہوں

۹ ستمبر ۱۹۴۴ء

NO. 786-A.MUL.

ڈاکٹر

علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رشید احمد صدیقی [بنام] گیان چند جین

پروفیسر رشید احمد صدیقی [پ: ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۴ء — م: ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء] کا یوم پیدائش صدی تقریبات کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ رشید صاحب کا یہ خط پروفیسر اخلاق اثر (بھوپال) کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ رشید صاحب کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن نئے خطوں کی بازیافت کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی سو سے زائد خط (پوسٹ کارڈ) قبلہ اعجاز صدیقی کے نام ہیں جو ہزاروں خطوط کے ساتھ جاری بے سروسامانی میں کہیں گم ہیں۔

[ادارہ]

اختر سعید خاں

◆

کوئی صحرا کوئی گھر یاد نہیں
اب کوئی سمت سفر یاد نہیں
وہ اُجالے وہ سحر یاد نہیں
خوب دنیا تھی مگر یاد نہیں
سر جھکائے ہوئے چپ بیٹھا ہوں
بات کرنے کا ہنر یاد نہیں
جگمگاتے تو ہیں کچھ نقشِ قدم
کون آیا تھا ادھر یاد نہیں
کچھ نہ تھا جس کے سوا یاد مجھے
اب وہی راہگذر یاد نہیں
دل سے رُخصت ہوئیں کیوں کیا دیں
یہ بھی اے دیدۂ تر یاد نہیں
اب لہو آنکھ سے ٹپکے بھی تو کیا
اب کوئی زخمِ جگر یاد نہیں
غمِ ہستی کے مقابل اک عمر
کون تھا سینہ سپر یاد نہیں
اور کیا یاد ہے اے دیدہ ورد
رشتۂ درد اگر یاد نہیں
اسی خاکسترِ دل میں اختر
تھا کبھی رقصِ شرر یاد نہیں

◆

جاتی ہوئی رات کا دیا ہوں
بجھتا ہوں مگر سحر نما ہوں
ہر عہد کا خواب ہے مرا خواب
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں
حیراں ہے زندگی کہ کب سے
میں تیرے بغیر جی رہا ہوں
تم کو کیا ہو گیا جو چپ ہو
میں تو آواز کھو چکا ہوں
پوچھو مری زندگی سے پوچھو
نا کردہ گناہ کی سزا ہوں
برپا جب ہو گا حشر ہو گا
میں آج حساب چاہتا ہوں
ہے اپنا بھی نقشِ پا جہاں گم
اس دشت میں خاک چھانتا ہوں
اس دور میں جی رہا ہوں ہنس کر
اختر میں بھی عجب بلا ہوں

● اندرونِ اتوارہ، الزآباد بینک روڈ، بھوپال ۔ ۴۶۲۰۰۱

اویس احمد دوراں

بہت مدت ہوئی صاحب نظر کوئی نہیں آیا
زمانہ منتظر ہے دیدہ ور کوئی نہیں آیا
کبھی کرسی نشینوں کی طرف تحفے لئے دوڑے
جدھر ہیں غمزدوں کے گھر ادھر کوئی نہیں آیا
تری خونریز گلیوں سے بھی آواز آتی رہتی ہے
بجز میرے یہاں آشفتہ سر کوئی نہیں آیا
سب آئے اپنے سامانِ بقا کے ساتھ گلشن میں
مری دانست میں بے بال و پر کوئی نہیں آیا
قیامت کر دی برپا روند ڈالا ساری دنیا کو
یہ سچ ہے تجھ سے بڑھ کر فتنہ گر کوئی نہیں آیا
کبھی قیمت ضمیر اپنا کبھی بیچا نہیں اُس نے
غریبِ انساں کو جینے کا ہنر کوئی نہیں آیا
تمہاری نرگسیت یہ علی الاعلان کہتی ہے
کہ تم سے بڑھ کے اب تک خود نگر کوئی نہیں آیا
ندا ہر سمت سے آئی بڑھو بڑھتے چلے جاؤ
میں کیسے کہہ دوں پیغامِ سفر کوئی نہیں آیا
اندھیری رات میں دوراں وطن کی پاسبانی کو
بہت آواز دی ہم نے مگر کوئی نہیں آیا

● محلہ فیض اللہ خان، پوسٹ آفس، دربھنگہ ۔ ۸۴۶۰۰۴

ظہیر انور

۱۱۰، ہری پوکر، فٹ لین۔ کلکتہ ۷۰۰۰۱۹

ڈراما اور سماجی وابستگی

"THE MOMENT THE WRITER STARTS WORRYING ABOUT CONVEYING SOME MEANING (EXTERIOR TO THE WORK OF ART) LITERATURE STARTS TO RETREAT, TO DIS-APPEAR." ALAIN ROBBE GRILLET.

روزِ ازل سے انسان اظہار کے وسیلوں کی تلاش میں سرگرمِ عمل رہا ہے۔ اظہار کے وسیلے ہی سے اس کی پوری ذات اور پھر یہ کائنات منشرح ہو پاتی ہے۔ کسی نوع کی کیفیت ہو یا جذبہ۔ انسان اظہار کے وسیلے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ اس عمل میں جب وہ سرگرمِ سفر ہوتا ہے تو اس کی تخلیقی صلاحیت کھل کر سامنے آتی ہے اور پھر وہ اپنے اندر کے اس کرب سے نجات پالیتا ہے جس کی وجہ سے اظہار کے وسائل کی اسے تلاش ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور شاید اظہار کی یہی صورت بچوں کے درمیان کھیل کی جبلت کے ذریعہ اپنے امکانات کے در وا کرتی ہے۔ بچوں کے درمیان کھیل کو موجودہ تعلیمی نظام میں اہم گردانا گیا ہے۔ یہ بچے جنہیں ہم معصوم سمجھتے ہیں، اپنے عمل میں، اپنی حرکات و سکنات میں، اظہار کے انہیں نرم گرم راستوں پر محوِ سفر ہوتے ہیں۔ مختلف کھیل کود کے ذریعے اپنی خوشی ناخوشی، پسند اور ناپسند کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ گڑیا گڈے کا کھیل راجہ رانی کا سوانگ، چور پولس کا ڈراما ہندوستانی سماج کے بچوں کا عام کھیل ہے۔ وہ دولہا دولہن بنتے ہیں۔ میکے اور سسرال کے تصورات کو اپنے محدود وسائل کے ذریعے پیش کرتے ہیں، اپنے چہروں پر رنگوں کا لیپ چڑھا کر خود کو مختلف صورتوں اور کرداروں میں منکشف کرتے ہیں۔ ان کھیلوں کی تہہ میں نہ صرف اخلاق کا درس چھپا ہوتا ہے بلکہ مستقبل کے خواب سے ابھرنے والے سماج سے ہلکی سی بشارت بھی ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ نقالی کے ذریعے سماجی وابستگی اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے اظہار کی صورتیں بھی نکل آتی ہیں۔ نقالی کا فن بچپن ہی سے انسان کا دامن تھام لیتا ہے۔ اس طرح ڈراما جو نقالی کا فن ہے۔ درحقیقت بچپن سے لے کر بڑھاپے کی پکی عمر کی اس چوکھٹ تک انسان فکر و خیال کا حصہ بنا رہتا ہے۔ جب تک کہ ہاتھ پاؤں میں حرکت اور آواز میں تابندگی باقی رہتی ہے فن ڈراما کا انتہائی معتبر اور تاریخ ساز ناقد A. NICOLL اپنی معرکۃ الآرا کتاب BRITISH DRAMA کی ابتدا ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"THE MIMETIC INSTINCT IS CONFINED TO NO SINGLE COUNTRY OR NATION; IT IS UNIVERSAL IN ITS APPEAL AND REVEALS ITSELF AS ONE OF THE MOST PRIMITIVE OF HUMAN EMOTIONS"

ڈراما ایک ایسا قدیم فن ہے جو انسانی سرشت میں داخل ہے۔ دنیا کے ادب میں بھی ڈرامے نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈراما ہے کیا۔ اور اس کی سماجی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس ضمن میں MARTIN ESSLIN کا تجزیہ کافی حد تک قابلِ قبول نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"DRAMA IS THE MOST SOCIAL OF THE ART FORMS; IT IS, BY ITS NATURE A COLLECTIVE CREATION; THE PLAWRIGHTS, THE ACTORS, THE DESIGNER, THE COSTUME MAKER, THE PROVIDER OF PROPS, THE LIGHTINGT ENGINEER ALL CONTRIBUTE, AND SO DOES THE AUDIENCE BY ITS VERY PRESENCE. THE LITERARY PART OF THE DRAMA, THE SCRIPT, IS FIXED, A PERMANENT ENTITY BUT EACH PERFORMANCE OF EACH PRODUCTION OF THAT TEXT IS DIFFERENT BECAUSE THE ACTORS REACT DIFFERENTLY TO DIFFERENT AUDIENCE AND OF COURSE TO THEIR OWN MOOD"

STYLE & CHARACTS
(AN ANATOMY OF DRAMA)

مندرجہ بالا حوالہ ڈراما کی سماجی حیثیت کو تکنیکی اور ادبی دونوں سطحوں پر اعتبار بخشتا ہے اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ڈرامے کی سماجی ذمہ داری بھی بڑی زبردست ہوا کرتی ہے۔

سماج ایسے افراد کے ایک اجتماع کا نام ہے جو زبان، رسم، ریت و رواج اور اسطور سے جڑے ہوتے ہیں عام سماجی اصول اور عادت و اطوار انہیں دوسرے سماج سے ممیز کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ آدمی اپنے وجود کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے، اپنے تحفظ اور نشوونما کیلئے شعوری و لاشعوری طور پر سماج کی بنیاد مضبوط کرتا ہے۔ وہ سماج میں زندہ رہتا ہے۔ رشتے ناتے رقم ہوتے ہیں۔ اپنی خلق کی ہوئی فضا میں اسے زندہ رہنا ہے۔ اس لئے معاشیات سے لے کر سیاسیات تک اور فرد کی آزادی سے لے کر اس کی ذمہ داری تک سماج کے اندر پیدا شدہ غلاظتوں اور برائیوں کو ختم کر کے انسان ایک بہتر سماج کی تعمیر کی ذمہ داری بھی اپنے ہی کاندھے پر لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ مختلف طریق ہائے کار کا استعمال سماج کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ادب میں سماج کی آئینہ داری، اس کی تہذیب و ترتیب، اس کی تراش خراش کے لئے مختلف علوم و فنون کی حیثیت مسلم ہے۔ ناول نگار سماج کو وسیع پیمانے پر رقم کر کے بے نقاب کرتا ہے۔ افسانہ نگار کا کینوس مختصر ہوتا ہے۔ غزلیں اور نظمیں بھی سماج کی آبیاری کی صلاحیت رکھتی ہیں ڈرامہ نگار بھی یہی کام کرتا ہے۔ لیکن ڈرامے اور دوسری اصنافِ ادب میں ایک بڑا فرق ہے یہ فرق تحریر تک ہی محدود نہیں بلکہ ڈرامے اور دوسری اصنافِ ادب کے تاثر میں بھی ایک بڑی خلیج دکھائی دیتی ہے۔

ادب کی دیگر اصناف میں ادب کا قاری براہِ راست اپنی تنہائی میں انفرادی طور پر کسی ادبی شہ پارے کی شناخت کرتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے اور انفرادی طور پر ہی اس کے اندر ردو قدح کا عمل شروع ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس PURGATION کا عمل دخل اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ لیکن فن ڈراما کے وسیلے سے اثرات مختلف سطح پر بیک وقت رقم ہوتے ہیں۔ اسکرپٹ کی خواندگی SCRIPT - READING سے لے کر اس کی پیش کش کے پیدا شدہ اثرات تک یہ فن اجتماعی فن COLLECTIVE ART نظر آتا ہے۔ مستثنیات سے قطعِ نظر عموماً ڈرامے میں تاثر مجموعی طور پر ہی ابھرتے ہیں۔ ڈرامے کے ناظرین مجموعی طور پر ہی ڈرامے کو دیکھتے ہیں اور ڈرامے کے مختلف محاسن بالخصوص حرکت و عمل ان کی قوتِ باصرہ پر براہِ راست اپنا جلوۂ صد رنگ بکھیرتے ہیں اور پھر اپنے آزاد ذہن کے ساتھ ناظرین اپنے نئے فیصلہ کرتے ہیں اس طرح کسی ڈرامے کو دیکھنے کے بعد جو بھی ناظرین کا فیصلہ ہوا کرتا ہے وہ اکثر عوامی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ اور بحث ہے کہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا وہ ڈراما جو اسٹیج تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے ادبی فن پارہ ہی کہلائے گا اور اس کا تاثر یا امکان بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا کہ کسی ناول افسانہ نظم یا غزل کا ہوتا ہے۔

ہم جان چکے ہیں کہ ڈراما بقول نیکول ہر نہج پر ہر سطح پر اور ہر قوم و ملت کی تہہ میں پایا جاتا ہے۔ قومیں تہذیب یافتہ ہوں کہ غیر مہذب، اپنی سرخوشی اور دکھ درد کا اظہار کرتی ہیں۔ ڈراما ایسی جگہ پر کھیلا جاتا ہے جہاں لوگ اجتماعی صورت میں اس سے فیض اٹھا سکیں۔ قدیم ہندوستان میں مذہبی مواقع پر یا اہم فصلوں کی کٹائی کے بعد ڈراما کھیلا

جاتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ڈرامے کو دیکھ سکیں۔ یونان میں ڈرامے کو اسٹیج کرنے کے لئے کھلی جگہوں پر اور وسیع و عریض علاقے میں اسٹیج بنایا جاتا تھا۔ جس کی شبیہیں آج بھی کھنڈرات کی شکل میں موجود ہیں۔ یونانی لفظ تھیٹرو THEATRON کا مطلب ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں عوام اجتماعی طور پر کچھ دیکھنے کے لئے جمع ہو سکیں۔ لفظ تھیٹر، کی شروعات سے پیش کش کی اہمیت اور سماجی تصورات ڈرامے کے بنیادی عناصر میں شامل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ڈرامہ بذات خود ایک ایسا ادب پارہ ہے جہاں سوچ و فکر کی لے بہت دھیمی اور پیچی ہے۔ ڈرامہ نگار ڈراما تحریری صورت میں پیش کرتا ہے۔ اداکار اس کے خلق کئے ہوئے کردار کو الفاظ اور حرکت کا جامہ پہناتے ہیں۔ ہدایت کار یا اسٹیج منیجر اپنی شرح اور تکنیکی دروں بینی کے ساتھ اسے اسٹیج تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسٹیج ڈیزائنر لائٹ مین اور بیک اسٹیج کے کارندے بھی اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈرامے کی تخلیق سے لے کر پیش کش تک ایک پورا سماج بنتا نظر آتا ہے۔ اگر ڈراما کسی ایک شخص کا مرہونِ منت ہوتا تو اس کی سماجی ذمہ داری بھی اتنی بڑھی ہوئی نہ ہوتی۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈراما ایک ایسا زبردست وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ہم سماج کی بازیافت کر سکتے ہیں۔ —————— خصوصاً اپنے اس عہد کی بازیافت، جس کے ادب کا بیشتر اور بڑا حصہ ایسا ہے جن میں سماج "گناہوں کے ایک زبردست ڈھیر" کی حیثیت سے منعکس ہوا ہے۔

ڈرامے کے فرائض میں قدروں کی شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ بہتر کار کردگی کی تشکیل بھی شامل ہے۔ اس کی وجوہ سماج کی جڑوں میں ہی پیوست ملتی ہیں۔ یونانی تصور کی رو سے ڈراما اصل کی نقل ہے۔ یعنی آواز، حرکات و سکنات کے ذریعہ اصل کی نقل —— انسانی خیالات و اقدار، سماجی منظر نامے اور نفسیاتی روداد کی نقل اور عمل ڈرامے کی جان ہیں۔ رشتے ناطے، قتل و خون، محبت و نفرت —— ان سب کی ایسی نقالی اسٹیج پر ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر آدمی اپنے تزکیۂ نفس کے عمل سے گزرتا ہے اور بالآخر اس کی ذہنی جذباتی اور تصوراتی تہذیب میں زرخیزی کا عمل شروع ہوتا ہے۔

اس طرح ہمارے سامنے ڈرامے کا یہ پہلو عیاں ہو جاتا ہے کہ ڈراما کوئی خیالی یا غیر حقیقی شے نہیں بلکہ اس کی جڑیں انسانی حالات اور سماجی واقعات کی تہہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ دوسری بحث ہے کہ خیالی ڈراما یا فنطاسیہ صنف ڈراما کی الگ اور منفرد شاخ ہے جہاں اصل اور حقیقی کی حیثیت اکثر ثانوی ہوا کرتی ہے۔ اصل ڈراما ایک ٹھوس حقیقت ہے اور اس میں انسان کی صورتِ حال کا بھرپور جائزہ لیا جاتا ہے۔ ڈراما نگار ناظرین کے سامنے لمحۂ موجود کا عکس پیش کرتے ہیں MARTIN ESSLIN کے خیال میں ڈرامے میں مستقبل اور ماضی نام کی کوئی چیز واقع نہیں ہوتی بلکہ "یہاں" اور "ابھی" اہم ہیں۔ موجودہ صورت حال کی کش مکش اور اس کش مکش سے ابھرتے ہوئے ہزاروں سیاسی سماجی اور نفسیاتی مسائل اور نتائج ڈرامے کو سماجی پس منظر اور بنیادی مقصدیت وافادیت سے جوڑے رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں پیش کش کے لمحات میں ہدایت کار اکثر موجودہ حالات کی مناسبت کو تلاش کرتا ہے۔ مثلاً جو ڈرامے آج سے بہت پہلے بالکل مختلف ماحول میں تخلیق کئے گئے ان کی تہذیب و ترتیب اور تراش خراش میں عہدِ حاضر کے مسائل یا کم سے کم RELEVANCE کی تلاش ہدایت کار کی ذہانت اور فن کارانہ چابک دستی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ ڈرامے کے بطن میں حقیقی زندگی اور موجود دنیا کی مناسب تھرتھراہٹ ڈرامے کو اہمیت کا حامل بناتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈراما اور حقیقت دراصل ایک ہی شئے کا نام ہیں کہ ان میں بنیادی طور پر کہیں کوئی فرق بھی ہے واقعہ یہ ہے کہ ڈراما اصل کی نقل ہے اور نقل میں فن ادراک و امکانات کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ حقیقت کا اظہار اور اس کی آگہی فن کا اہم ترین تقاضہ ہے۔ لیکن اگر بے چہرہ اور غلیظ حقیقت کو پورے کا پورا پیش کریں تو اس کا تاثر لکھ

اور کرپیہ بھی ہو سکتا ہے۔ بس اسی طرح ڈراما [illegible] نقل کرتے تھا ــــ یعنی پہلے اداکاری کرتے ہیں پھر اس کی حیثیت حقیقی بھی ہوا کرتی ہے۔ اگر فنی طور پر غیر متوازن لب و لہجہ میں حالات اور واقعات کو پیش کریں تو غیر مربوط اور تجریدیکا ہونے کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ چونکہ کھیل کی جبلّت انسانی سرشت میں داخل ہے، لہٰذا حقیقی حالات اور واقعات کی نقل اداکار کرتے ہیں، فنی معیار کسی کر انسانی کمزوریوں اور خوبیوں کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسی کے پہلو بہ پہلو ڈراما انہیں حالاتِ حاضرہ سے باخبر کرتا ہے اور پھر ان کے فیصلے کو انہیں پر چھوڑ دیتا ہے۔ بریخت ہمارے عہد میں اس کی زندہ مثال بن کر سامنے آیا ہے ــــ!

موجودہ عہد میں ڈرامے کے موضوعات متنوع اور کافی وسیع رہے ہیں۔ ابسن اور شا کے ڈرامے میں سماجی مسائل کو جگہ دی گئی ہے تو بیکٹ، پیرانڈیلو، کامیو، سارتر اور اسٹرانڈ برگ وغیرہ نے فلسفیانہ بلندیاں سر کی ہیں۔ یہ ایسے اہم اور انفرادی نام ہیں جنہوں نے ڈرامے کو مختلف سمتوں سے جوڑ رکھا ہے۔ ٹھیک اسی طرح عہد قدیم کے ڈراموں اور شکسپیئر کی تخلیقات میں ان کا عہد جھانکتا ہوا ملتا ہے۔ یونانی ڈراموں سے لے کر آج کے بیکٹ اور اینسکو کے ڈرامے تک، سنسکرت زبان کے ڈراموں سے لے کر آج کے ہندی اور اردو ڈرامے تک موضوعات خواہ فلسفیانہ بلندیوں سے آراستہ ہوں یا عام سماجی موشگافیوں سے متصف، ترسیل کی خاطر زبان و بیان پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ کسی نے اسٹیج کرافٹ سے ترسیل کا لہجہ نرم کیا ہے۔ (جیسے کوکٹیو اور گرد توسکی) کسی نے زبان و بیان کی صفائی اور شستگی کے توسط سے ناظرین اور موضوع کے درمیان ربط قائم کرنے کی سعی کی ہے (جیسے سارتر، کامیو اور بیکٹ وغیرہ) بریخت اور گرد توسکی نے ایک سائنٹفک عمل کے طور پر ڈرامے کو برتا ــــ لیکن تمام اکابر فن نے ڈرامے کو سماج کے افراد سے قریب تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی کبھی عوام کو بھی ڈرامے کی سطح پر لانے کی کوشش موجود ہے (مثلاً چیخف) ڈراما کا فن ایک ایسی تجربہ گاہ ہے جہاں انسانی قدروں کی اہمیت اور صداقت کا تعین کیا جاتا ہے خواہ مسئلہ عورت کا ہو یا MERCY - KILLING کا۔ اسی تجربہ گاہ میں قدروں کی بازیافت اور ردوئیدگی ہوا کرتی ہے۔ اسی مقام پر ڈراما کا رشتہ سماج سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔ سماج انفرادی انسانوں کی اجتماعی صورت ہے۔ جہاں مختلف تضادات سے نئے مسائل کی داغ بیل پڑتی رہتی ہے اور پیار، محبت، نفرت، غم، غصّہ، شادی بیاہ، دوستی اور بھائی چارگی کے پہلو بہ پہلو سیاسی کشیدگی، معاشی انقلابات اور نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تمام موضوعات ڈرامے کے دروبست میں سما کر سماج کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ڈراما دوسرے علوم و فنون کی بہ نسبت زیادہ فعال سماجی فن ہے جو اجتماعی صورتِ حال میں ارتقا پذیر ہوتا ہے اور اجتماع ہی میں پیش کیا جاتا ہے اور اسی واسطے سے ناظرین کے اندر دیرپا اجتماعی تاثر کا جنم بھی ہوتا ہے۔ مختلف اور متضاد تہذیبی فکری دھاروں سے گزرتے ہوئے ہر سماج اپنے ارتقا کی منزل طے کرتا ہے اور ڈراما نگار ان ارتقائی منزلوں کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی سماج کے لئے ایک شکسپیئر ہے تو اسی طرح فرانسیسی سماج کے لئے ایک مولیئر، جرمن سماج کے لئے بریخت اور پولینڈ سماج کے لئے گرد توسکی، روسی سماج کے لئے چیخف، اسٹنس لاوسکی اور ہندوستانی سماج کے لئے بادل سرکار، حبیب تنویر، موہن راکیش اور تندولکر ہیں۔ جس سماج کی وہ پیداوار ہیں۔ اس کی مٹی کا رس جس ان کے ڈرامے کے بنیادی عناصر ہوا کرتے ہیں۔ اور آنکھوں کو بھلا لگنے والے مناظر، کمپوزیشن BLOCKING اور آوازوں کی مدد سے وہ اپنے ناظرین کو ایک گہرا سماجی شعور عطا کرتے ہیں۔ انگلستان کی شناخت بقول ESSLIN شکسپیئر کے ڈرامے سے ہوتی ہے اور یہ کہ ہنری پنجم HENRY V ایک قومی رسمیاتی عمل کے طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے سماجی اور سیاسی موضوعات کی شمولیت کی بنا پر وقت کی آوا

اور تاریخ پر پڑتی۔ مگر دکو سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو سارتر اور کامیو کو ڈرامے لکھنے کی ضرورت
پیش نہ آتی اور وہ فلسفیانہ تحریروں پر ہی قناعت کر جاتے ایسا کرنے کے بجائے انہوں نے ڈرامے تحریر کئے۔ اور
اشاراتی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ علامتی فضاؤں میں ڈراموں کو سماجی بہتری، آگہی اور احتجاج کے طور پر برتا اور ڈرامے
کے فن کو ایک موثر سماجی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جرمن تسلط کے موقع پر سارتر کا ڈراما "مکھیاں"
THE FLIES اس کی بہترین مثال ہے۔ تمثیل کی زبان اور اشارے کنائے میں تحریر کئے گئے مکالموں کے پس پردہ
معنی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آتا ہے۔ اس آگہی اور بیداری کا کام سارتر نے ڈرامے سے لیا جو فی زمانہ ناول، —
افسانہ اور فلسفہ سے ممکن نہ تھا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ BEAU - MARCHAIS کے ڈرامے MARRIAGE OF FIGARO
کے ساتھ ساتھ فرانسیسی انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ چیکوسلاواکیہ اور پولینڈ میں تھیٹر کی زندہ تحریک نے سوچ کے دھارے
بدلے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر نئے اور پائیدار لب و لہجے کی بازیافت کی ہے۔

بیسویں صدی میں ڈرامے اور سماج کے مابین یہ رشتہ اور بھی گہرا ہوا۔ ڈرامے کی پیش کش اور اسٹیج اب
صرف ایک انجانی شام کی بے بنیاد ہنسی نہیں ہے اور نہ ہی بے بنیاد کارگزاری کا ذریعہ ہے بلکہ اسٹیج تو اب ایسا
روپ دھار چکا ہے جہاں تصورات ٹھوس شکل میں آراستہ و پیراستہ ہونے لگے ہیں۔ انفرادی مسئلے سے
لے کر فلسفیانہ اور لایعنی موضوعات بھی ڈرامے میں در آئے ہیں۔ جرمن ڈراما نگار بریخت جو مارکسی مکتبہ فکر
کا پروردہ تھا۔ سماجی شعور کو تیز تر کرتا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے ڈرامے اکثر تکنیکی بلندیوں کے باوجود سطحی
پروپیگنڈہ اور سرخ پھریروں کی زیبائش سے بچ نہ سکے۔ سماج کے مسائل کی بنیادی ضرورت ابسن کے ڈراموں
کے ساتھ ابھرتی چلی گئی۔ ابسن نے عورتوں کے مسائل پر خاص طبع آزمائی کی ہے GHOST کا مرکزی خیال
عورت اور مرد کی دہری سطح پر گردش کرتا ہے۔ THE DOLL'S HOUSE (گڑیا گھر) میں بھی عورت کی حیثیت کو
طشت ازبام کیا گیا ہے۔ اس کے دیگر ڈرامے بھی عورت کے اندر بسی ہوئی تخلیقی قوت کا مظہر ہے۔ برناڈ شا
نے اس روایت کو تقویت بخشی۔ شکسپیئر کے سلسلے میں گمراہ ہونے کے باوجود اور بقول ایک معتبر ناقد لافانی
مسائل کو ایک اکاؤنٹنٹ کی طرح برتنے کے بعد بھی برناڈ شا کے ڈرامے سماجی گندگی کا ازالہ کرتے ہیں اور بے بنیاد
روایت پرستی کو بے باکانہ نشانہ بناتے ہیں۔ سماج کی جڑوں میں برناڈ شا کے طنز کے نشتر اترتے چلے جاتے ہیں
اسلحہ اور آدمی ARMS AND THE MAN میں جذباتی محبت اور جنگ کی ہولناکیوں نیز بے بنیاد ہیرو ازم
پر ضرب لگائی گئی ہے تو بشر اور مافوق البشر MAN AND SUPRMAN میں سیاسی اور مذہبی مسئلے در آئے
ہیں۔ MRS WARREN'S PROFESSION میں برناڈ شا نے دنیا کے قدیم ترین دھندے چکلے بازی
کو مزاح کے ذریعہ عریاں کیا۔ بریخت نے بھی سو طرح کے سماجی مسائل کو ابھارا ہے اور معاشرے کی بہتری
اور فلاح کے لئے ڈرامائی ذائقے میں سائنسی آگہی کی آمیزش کی ہے "گیلیلیو" میں سائنسی انکشافات
کے خلاف چرچ کی اجارہ داری کو بڑی شدت سے رقم کیا۔ "مادر ہمت ور" میں عورت کی طاقت اور انقلابی
پس منظر میں سماج کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی طرف نشان دہی کی۔ چونکہ وہ حیرت انگیز ہدایت کار تھا اس لئے
سماج کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی میں اس نے فن کاری کا بے پناہ اظہار کیا ہے۔ اس طرح سارتر کا بن سایہ کا
آدمی، کامیو کا "انصاف"، اور کیلی گولا، ژاں ژینے کا "بالکونی"، ہنری میلر کا "ایک سیلس مین کی موت"،
جان اسبارن کا LOOK BACK IN ANGER بیکٹ کا "گودو کے انتظار میں"، ایسے ڈرامے ہیں جو ایک
طرف جان گالسوردی کے "انصاف"، اور "تنازعہ"، کی طرح سماجی ذمہ داری اور سیاسی تصورات کی فراہمی

کے سلسلے میں ایک خاص نہج اختیار کرتے ہیں تو دوسری طرف انسان کے باطن میں پنپنے والی اس کشمکش کی بشارت بھی دیتے ہیں جس سے آج کا انسان اور ہمارا یہ پورا سماج عبارت ہے اس طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ ڈراما نگار سماج کے جو آئینے خانے سجاتے ہیں۔ ان میں نئی زندگی، نئے پیکر اور نئی تازگی کو جگہ دیتے ہیں اور مناسب موقعوں پر بیداری اور احتجاج کے شعلے بھی بھڑکاتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی ڈرامے کو سماجی موضوعات کی شمولیت کے لئے ایک اہم اور انتہائی موثر فن مانا گیا ہے کالی داس کے زمانے کی سماجی حیثیت مختلف تھی۔ لہٰذا فنونِ لطیفہ کی نازک ترین صنف یعنی شاعری کا عمل دخل میگھ دوت اور شکنتلا میں زیادہ رہا۔ گیت، رنگ رس اور ناچ کے وسیلے سے کلاسکیت اور رومانیت کی حسین ترین روئیدگی ہو سکی ان ڈراموں کے اشعار اور حرکات و سکنات صرف وقت کی نبض پر ہاتھ نہیں رکھتے بلکہ اپنے عہد کے سست قدم اور سکون پرور ماحول کا بھی اعلان بنتے ہیں لیکن جب زندگی پیچیدہ تر ہوئی اور رشتوں میں شگاف پڑنے لگا۔ جب سماج کی جڑیں مسائل کے پہاڑ تلے شکستہ ہونے لگیں تو ڈراما بھی پوری تخلیقی جست کے ساتھ اس سماج کا آئینہ دار ہوا۔ یوں بھی ڈرامے کا تعلیمی پہلو اہم رہا ہے اور اس کے دائرے میں سماج کی ناہمواری اور بہتر سماج کی تشکیل کا شعور ہمیشہ ہی موجود رہا ہے لہٰذا وقت کے معیار کے ساتھ ساتھ یہاں بھی ڈرامے کا معیار اور مزاج بدلتا رہا۔ چوں کہ ڈراما اور ناظرین ایک گہرے رشتے سے بندھے ہیں اس لئے یہ صنفِ ادب دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ فعال رہا۔ ڈرامائی ادب اور اس کے فن پر ہندوستان کی قدیم ترین کتاب و ناٹیہ شاستر، میں اس بات کا پرزور اعلان ہے کہ ڈراما تعلیم کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ڈرامے کے بطن میں تقریباً ہر طرح کے ہدایت نامے شامل کئے جا سکتے ہیں مارٹن ایسلین کے الفاظ میں:

"THERE IS NO···· MAXIM, NO LEARNING, NO ART OR CRAFT, NO DEVISE, NO ACTION THAT IS NOT FOUND IN DRAMA"

اس طرح ڈراما نہ صرف موضوعاتی سطح پر سماجی بہتری اور عوامی فلاح کا کام انجام دے سکتا ہے بلکہ اس کے پیرائے اظہار کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ پیش کش کے ہزار رنگ اور حرکت کے مختلف لہجے ڈرامے کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ ڈراما سے منسلک افراد اب اس بات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ سماجی کیفیات کا مظہر صرف پکچر فریم اسٹیج یا PROSCENIUM نہیں بلکہ بورژوائی تھیٹر کے برخلاف ڈراما اسٹیج سے سڑک اور سڑک سے فیکٹریوں کے دروازے تک سفر کر چکا ہے اور اس کی وسعت و شدت مسائل کے ساتھ ساتھ عوامی شعور اور اس کی تعلیم کو بھی اپنے احاطۂ اثر میں لے چکا ہے۔

پچھلی صدی سے لے کر اب تک سماج کے نئے تصورات کی تعمیر کے علاوہ شعور و آگہی کی پختگی اور اس کی مسلسل تراش خراش کے لئے ڈرامے کو کامیابی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ اگرچہ دو چار صدی قبل بھکتی تحریک کو نئی توانائی عطا کرنے کے لئے اس زمانے کے شعراء نے ڈرامے کے فن کو سماج کی کسوٹی پر کس کر ایک ابتدائی کارنامہ انجام دیا تھا لیکن ڈرامے کی سماجی وابستگی کا سلسلہ میرے خیال میں "نیل درپن" جیسے ڈرامے سے شدت پکڑتا گیا۔ اس ڈرامے کی اہمیت اس لئے بھی کہ اسے قومی سطح پر پیش ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یوں تو صوبائی سطح پر اپنے اپنے مقامی ہیرونز کے توسط سے ڈرامے کے سماجی پہلوؤں کو مختلف انداز میں اجاگر کیا جاتا رہا ہے لیکن دین بندھو کا ڈراما "نیل درپن"، سماج میں پھیلی ہوئی برائی، کسمپرسی اور ہندوستانی کسانوں کی انگریزوں کے ہاتھوں زبوں حالی کا ایک ایسا آئینہ تھا جس کے نتائج قومی اور ڈرامائی سطح پر دوررس ہوئے۔ انگریزی سرکار کی ماتحتی میں زندگی بھیک جیسی تھی۔ ناانصافی، غیر مساوات، ظلم و تشدد اور سماج میں پڑی دراڑیں

سماج کی بنیادوں کو واضح طور پر تہہ و بالا کر رہی تھیں ۔ غلامی کا طوق ہندوستان کی گردن پر گراں بار ثابت ہو رہا تھا ملک میں مختلف انداز کی تحریکیں اور احتجاج کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں ۔ ایسے حالات میں ادب، خصوصی طور پر شاعری اور ڈراما سماج کی نامساوات اور ظلم کی دیواروں کو ڈھانے کے عزم میں شرابور ہوا تھا تھا ادب میں صرف ذاتی آگہی سے ہی کام نہیں لیا گیا بلکہ ان ٹھوس مقاصد کی نشان دہی بھی کی گئی جن کے حصول کے بعد آزادی کا لمحہ میسر آیا۔ یعنی سارے کا سارا ادب بھی اپنی مٹی کی خوشبو سے سرمست نظر آنے لگا۔ اسی لمحے کی زندہ مثال نیل درپن، ہے اور انگریز افسر کے نفرت انگیز کردار کو بہ طریق احسن نبھا کر مشہور زمانہ اداکار گریش گھوش نے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے دی ۔ ایشور چندر ودیا ساگر نے اس رول میں انہیں دیکھ کر اپنا جوتا اچھال دیا تھا جو سماجی بیداری کے شدید احساس کا عملی اعلان تھا۔ قومیت کے اسی جذبے اور بیداری و آگہی کے اسی تناظر میں ماضی کے اہم تاریخی کردار کو ڈرامے کے دروبست میں جگہ دی گئی ۔ ایسے کردار میں ٹیپو سلطان، سراج الدولہ، شیواجی، راجہ پورس، میر جعفر، اور جے چند وغیرہ کافی اہم نام ہیں جو مختلف صوبوں میں سماجی سطح پر ہندوستان کے نئے ہیروز کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کانگریس کی تشکیل کے لمحے میں انہیں مقامی ہیروز کو ڈرامائی ادب میں جگہ دی گئی جو علامتی طور پر انگریز سرکار کی بربریت اور اس کی DIVIDE AND RULE کی پالیسی نیز سیاسی سازشوں کو عریاں کرنے میں کامیاب ہوئے ۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ مہابھارت، رامائن اور پران وغیرہ سے کردار مستعار لے کر موجودہ صورتِ حال پر محاسبہ کیا گیا ۔ رام، راون، سیتا، ابھیمنو وغیرہ ایسے کردار تھے جو وقت کی آواز بن کر تھیٹر کی صورت گری میں سرگرم ہوتے نیز فن کی رمزیت سے بھی آشنائی ہوئی۔ جب ماضی قریب پر نگاہ پڑتی ہے تو انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن I.P.T.A اور کمیونسٹ تحریک کی کارکردگی نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتی ہے جب سے ایم این رائے نے کمیونسٹ تحریک کی بنیاد ڈالی، سماج سے ڈرامے کی وابستگی اور بھی گہری ہوگئی ۔ سوشلزم کی جلا اور فسطائی قوتوں کی سرکوبی کے لئے ڈرامے تحریر کئے جانے لگے ۔ اگرچہ کہیں کہیں پروپیگنڈہ نے ڈرامے کو بہ حیثیت فن نقصان پہونچایا لیکن سماجی تصورات اور معاشرتی ذمہ داریاں ڈرامے کی ہمرکاب ہوگئیں ۔ روسی ڈرامے، خاص طور پر چیخف کے ڈرامے نیز شہرۂ آفاق اداکار و ہدایت کار اسٹنس لاوسکی کے مظاہرے نے ہندوستانی فن کاروں کے دلوں میں کافی جگہ پیدا کرلی ۔ افسانے اور شاعری میں ہی نہیں ڈرامے کی تہہ میں بھی سماجی منظر نامہ صاف صاف جھلکنے لگا ۔ پولینڈ کے لیبارٹری تھیٹر گروتووسکی کی تجسیم کاری اور امریکہ کا گروپ تھیٹر ہندوستان کے لئے فال نیک ثابت ہوئے اور نئے اسٹیج نیز نئے طرز پیش کش نے سماج کو عوام کے روبرو لاکر کھڑا کیا ۔ سماجی وابستگی درحقیقت تھیٹر کے لئے جز ولاینفک قرار پائی ۔ ساتھ ہی پانچویں اور چھٹی دہائی میں اپٹا I.P.T.A کا وجود ڈرامے اور سماج کی وابستگی کے لئے ایک زبردست وجہ بنا ۔ I.P.T.A کے شو صرف دہلی، بمبئی اور کلکتہ تک محدود نہ تھے ۔ گاؤں گاؤں ڈرامے کے کارواں چلے ۔ اپٹا کے لئے خصوصی طرز کے ڈرامے لکھے گئے ۔ ان ڈراموں میں سماجی اور اخلاقی تخریب کاری مذہبی بے راہ روی سیاسی جبر و استبداد اور معاشی استحصال کو موضوع بنایا گیا اور کوشش یہ کی گئی کہ سماج کا ایک نیا، جامع اور زیادہ سائنٹفک تصور دیا جاسکے اور پرانے توہم پرست سماجی منظر نامے کی جڑوں کو درہم برہم کیا جاسکے ۔

ڈراما اس مقام پر پہنچ کر زبردست عوامی فن بن کر ہندوستان کے مختلف مقامات پر اپنا سماجی فرض ادا کرنے لگا ۔ اردو، ہندی، بنگلہ، مراٹھی اور دوسری زبانوں میں ڈرامے تحریر ہوئے ۔ اپٹا نمایاں طور پر سماجی فرض نبھا رہا تھا اس کے منشور سے بھی یہ ظاہر ہے کہ جمہوریت پسند قوتوں کو جلا بخشے اور سامراجیت کے خلاف آواز بلند

کرنے میں اس ادارے نے بڑے معرکے کا کام انجام دیا۔ اب تھیٹر دراصل عوامی تھیٹر تھا جس کی بنیاد ورکروں، کسانوں، نوجوان طلبا اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی عوامی تحریک پر تھی۔ اس کے پروگرام میں یہ درج تھا۔

"IT SHALL BUILD UP A RESISTANCE MOVEMENT AGAINST REACTIONARY VIEWS AND ATTACKS ON CULTURAL MOVEMENT. IT SHALL COMBAT THE ECONOMIC CRISIS IN THE LINES OF THE EXPLOITED PROFESSIONAL ARTISTE AND WRITERS. AND CONSEQUENTLY THEIR TALENT TO REACTIONARY FORCES....."
(MARXIST CULTURAL MOVEMENT IN INDIA - EDITED BY SUDHI PRADHAN)

پروگرام کے یہ نکتے اس بات کا اعلان ہیں کہ اپٹا کے کارنامے سماج کو آگے بڑھانے میں ممد و مددگار ثابت ہوں گے اور یہ منشوری دعوے اہم بھی ثابت ہوئے۔ موسیقی، شاعری، ڈراما اور دوسرے فنون کے لوگوں نے بھی اپٹا سے اپنی قسمت جوڑی جن میں شمبھو مترا، روی شنکر، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، اتپل دت، ملک راج آنند اور رمیش تھاپر جیسے قابلِ ذکر لوگ شامل تھے ان کی شمولیت نے اس ادارے کو اور بھی ہمّت ور بنا دیا اور پورے ملک میں اس کی شاخیں پھیل گئیں۔ ہر صوبے اور ہر گاؤں میں ڈرامے ہوئے اور صوبائی فارک آرٹ سے ڈرامے کو قریب تر کرکے انسانی حالات کا از سرِ نو جائزہ لیا گیا اور ایک صحت مند سماج کی بشارت دینے کی کوشش کی گئی شمبھو مترا نے بجن بھٹا چاریہ اور ٹیگور کے ڈرامے اسٹیج کئے، سجاد ظہیر نے ڈرامے لکھے جس میں، بیمار، کو اہمیت حاصل ہے۔ اڑیسہ اور کیرالا سے بنگال تک ڈرامے اسٹیج ہونے لگے۔ اتپل دت بھی اس کے ممبر تھے اور بحیثیت ہدایت کار و ڈراما نگار انہوں نے نکڑ ناٹک کو فروغ دیا جس میں دپستول بم، اور وجارج شیٹ، شامل ہیں۔ ان کا اب بھی دعویٰ ہے کہ ان کے ڈراموں کے توسط سے مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کو بہت سارے ووٹ ملے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ڈراما سماج کو بدلنے کا ایک زبردست عملی طریقۂ کار ہے۔ آج بھی ان کے ڈراموں میں شاہجہاں، وڑاؤ پوتنک بارہ، انگار اور دوسرے ڈرامے اسٹیج ہو رہے ہیں۔ انہوں نے جاترا کے فارم کو بھی مارکسی اشتہار بازی کے لئے استعمال کیا۔ بالکل اسی طرح اپٹا کے آخری اہم دور میں نعرے بازی اور سیاسی شور کا زور اس قدر بڑھا کہ پورا ادارہ ہی سیاست کا اشتہار بن کر رہ گیا اس سے جو نقصان پہونچا ہے اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔ چوں کہ بقول شخصے اپٹا کو مکمل طور پر مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی اٹھا لے گئی۔ اس لئے ڈرامے کی برگزیدہ ہستیوں نے اپنی اپنی الگ منڈلیاں سجائیں اور سماج کی سطح کو برتنے میں فن کے اشتراک کو اہم جانا۔

جہاں تک اردو ڈرامے کا تعلق ہے، اس کی بہ مشکل سو سال کی تاریخ کی ابتدا اور انتہا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں بے شمار ڈرامے لکھے گئے لیکن ان کے فنّی عروج کی نشان دہی ایک مشکل امر ہے۔ احتشام حسین نے ٹھیک ہی لکھا تھا کہ اردو ڈرامے کو طویل سفر درپیش ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ڈرامے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر، ڈرامے کے شائقین کے لئے راستہ کھلا ہوا ہے۔ خلوص کے ساتھ سفر شرط ہے۔ علاقائی زبانوں کی ترقی یافتہ کاوشیں اور ماضی میں ڈراموں کی توضیحات و تصریحات نیز مغربی اور چینی اندازِ نظر اور تکنیک زادِ راہ کے طور پر کام آ سکتے ہیں۔ اردو ڈرامے کی جو فصل ہمارے سامنے کھڑی ہے اسے ٹٹول کر دیکھنے سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ڈرامے کے توسط سے سماج کی عکاسی اور اس کے رجحانات اور ساخت پر تبصرہ و تنقید موجود ہے۔

سماج کی مختلف سطحوں پر معنویت کی تلاش ہر ادیب کو ہوا کرتی ہے خواہ وہ کسی بھی زبان میں لکھتا ہو

اپنے سماج کے موجودہ منظر سے ناآسودہ ہو کر ہی اپنی تخلیق پیش کرتا ہے، اور اس سے اس کا مقصد ایک بہتر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ (ایسے مواقع پر ادب اور سماجیات کے متضاد رخوں کا احساس نیز ادب بحیثیت ادب کی پاسداری لازم ہے ورنہ نتیجتاً ادب کے نام پر پروپگنڈہ ہاتھ آتا ہے، یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بدبخت جیسے ڈرامانگار کا زوال بھی اسی بنا پر ہوا۔) اگر سماج ہر اعتبار سے تنقید سے بالاتر ہو جائے تو ادب کے ذخیروں کو تکلیف دہ حد تک نقصان پہونچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ڈرامانگار بھی گوشت پوست کے انسان کی تجسیم کاری کے عمل کے ذریعے اپنے لائحہ عمل اور سماجی سطح پر اپنی توضیحات کی ترسیل کرتا ہے۔ ڈراما الفاظ کے ایک ایسے مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے جس کی تہہ میں سماجی معنویت اور اصلاحی رجحانات بھی ہمکتے رہتے ہیں۔ سماج کے دبیز پردوں پر زنگ اور دیمک کی نشاندہی کا سوال ہے تو اردو ڈرامے کا دامن اس قدر خالی بھی نہیں۔ سماجی سطح پر وہی ڈرامے کامیاب کہلا سکتے ہیں جو نہ صرف سماج کی برائیوں اور اس میں پڑے شگاف کی نشاندہی کریں بلکہ نئے سماج کی تعمیر کے ساتھ ساتھ فنی نقطۂ نگاہ سے اس کی پیش کش ایسی ہو کہ اسے دیکھنے یا پڑھنے سے اس سماج کی ایک تصویر آنکھوں میں پھر جائے اس کے تیور اس کے خدوخال اور اس کی نفسیاتی گرہوں کی عقدہ کشائی وقت کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جو بذات خود ایک تاریخی دستاویز بن سکے۔ اردو ڈراموں کا سلسلہ یا کارواں واجد علی شاہ کے رہس، اور امانت کے "اندر سبھا" کے ساتھ سرگرم سفر ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ لیکن راستے میں ایک نہیں، ہزار پڑاؤ آئے۔ کہیں کوئی چھوٹی سی منزل ملی۔ کہیں تو راستہ ہی بند ملا — دھیمی رفتار اور جمود کی گہری تہوں سے پورا سفر اٹ گیا۔ لہٰذا منزل یعنی اردو اسٹیج کی مکمل شیرازہ بندی مشکل نظر آئی۔ جو ڈرامے اردو میں لکھے گئے ہیں وہ سماجی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوتے ہیں اور تصوراتی سطح پر سماج کی قلعی بھی اترتی ہے لیکن ان سارے ڈراموں میں اسٹیج کی اہمیت، کھیل، تماشے کی جبلت اور اس کی تدبیر گری بھی شامل کی گئی ہوتی تو آج ڈراموں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔

پیش نظر ڈرامے کے عنوان کے تحت اردو کے ایسے ڈراموں کا تذکرہ یہاں آئے گا جو سماجی وابستگی کا الزام، اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یا پڑھ کر وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا جا سکے۔ اور جن کے بطن میں سماجی تصورات یا تفکرات کی بنیادی رنگ آمیزی ہو۔ زمانی حدود کی شکلیں اور اس لمحے کے کلچر کی بازیافت ہو مثلاً اگر آپ امانت کی "اندر سبھا" کا مطالعہ کریں تو رقص و موسیقی اور غیر عملی انداز نظر میں بھی اس عہد کی وہ سچائی جھانکتی ہوئی ملے گی جس پر اکثر تاریخ داں کی نظر بھی نہیں رکتی۔

جہاں تک سماجی شعور اور اس کی فنی پیش کش کا سوال ہے تو ڈراما بیسویں صدی میں ہی زیادہ بالغ نظر ہو سکا۔ یہ محاکاتی فن چوں کہ مغرب کی دین ہے اس لئے بیسویں صدی میں جب مغربی ہواؤں نے ہمارے ساحلوں پر دستک دی تو ڈرامے نہ صرف معمولی لفظیات اور لغویات کے جنگل سے آزاد ہوئے بلکہ مکمل تھیٹر کی حیثیت سے بھی آگاہی ہوئی۔ دیومالائی انسلاکات، پند و نصائح کے خیالات اور دل بہلاوے کے پلاٹ اور سب پلاٹ پر ڈراما کے ابتدائی خدوخال تعمیر ہوئے۔ انیسویں صدی کے بیشتر ڈرامے وقت کی نزاکتوں کو مدنظر رکھ کر ہی تحریر کئے گئے۔ سید وقار حسین کے بیان کے مطابق طالب کے ڈراموں میں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرامے کا فن اندر سبھائی دور سے نکل کر آہستہ آہستہ اس مقام پر پہنچ رہا ہے جہاں زندگی کے مسائل اور اس کی فنی پیش کش کی طرف توجہ ہوئی ہے۔ اس کی مثال طالب کا ڈراما "دلیر دل شیر" ہے۔ ماسٹر احمد حسین وافر کا ڈراما "بیمار بلبل" اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تسلیم کیا گیا۔ غیر منقسم بنگال میں بھی ڈرامے کی روایت پروان چڑھی لیکن سماجی ذمہ داری

اور [illegible] کی وجہ سے جو گوش مسوف کو متاثر کرسکے، مفقود تھی۔ تاریخ کے واقعات پر مبنی کسی ڈرامے میں کسی نوع کا سماجی ضمیر [illegible] ہے تو شاید اظہر علی اظہر امرتسری کے ڈرامے "بیداری" میں، جس کو بعد میں ترمیم اور نئی ترتیب کے بعد حکیم حبیب الرحمان نے "عزیب ہندوستان" کے نام سے دوبارہ لکھا۔ دوسری طرف طالب بنارسی کے "نگاہ غفلت" اور "لیل و نہار" میں سماج پر تبصرہ نظر آتا ہے۔ احسن لکھنوی نے شکسپیر کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کرکے ڈرامے کو نیا لب و لہجہ عطا کرنے کی کوشش کی۔ ان ترجموں نے ڈرامے کے فن کو تقویت پہنچائی اور بعد میں آغا حشر کاشمیری نے فن اور تکنیک کی کچھ منزلوں پر عبور حاصل کرکے حالاتِ حاضرہ کو اپنے دائرۂ تحریر میں لیا۔ سماجی بے راہ روی اور بے ڈھنگے پن کے سدباب کے لئے انہوں نے کئی ڈرامے لکھے۔ حشر کے ڈراموں میں اصلاحی پہلو تیزی کے ساتھ ابھرے اور تھیٹر کو حشر کے ہاتھوں ایک نئی زندگی ملی۔ ان کے ڈرامے "خواب ہستی"، "خوبصورت بلا"، "سیتا بن باس"، "مار آستیں"، "اسیر حرص"، اور "دھرمی بالک"، وغیرہ سماج کی مختلف تصاویر پیش کرتے ہیں جن پر ان کے تبصرے صاف نظر آتے ہیں۔!

سماجی معنویت کا رشتہ اس وقت مضبوط ہوتا ہے جب ڈراما نگار یا ادیب کے پیش نظر کوئی مقصد ہو۔ ایسا موقع اردو ڈرامے کو تحریک آزادی کے دوران بھی ہاتھ آیا۔ عشرت رحمانی نے بھی اپنی کتاب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تحریکِ آزادی کے دوران کئی ایسے ڈرامے معرضِ وجود میں آئے اور اسٹیج بھی ہوئے جو سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل پر ہی تخلیق [illegible] گئے تھے۔ اس لئے سیاسی اور سماجی معنویت کو اس دور میں تلاش کرنا مشکل امر نہیں۔ تحریکِ آزادی میں دیگر خیالات و نظریات کے علاوہ اردو ڈرامے کا بھی عنصر رہا ہے اس لئے سیاسی اور سماجی بصیرت اس دور کے ڈرامے میں وافر انداز میں موجود ہے۔ "فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت"، ایسا ہی ڈراما تھا جو انگریزوں کے خلاف ہمارے جذبات برانگیختہ کرتا ہے۔ ڈرامے کا موضوع انگریز حکمراں کا ظلم و جبر تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے "جنگِ روس و جاپان"، کے ذریعہ ہندوستانیوں کے اندر قوم پرستانہ جذبات ابھارے۔ اسی طرح دل لکھنوی کا ڈراما "تاج محل"، ہندو مسلم اتحاد پر روشنی ڈالتا ہے۔ علاوہ برآں شمس لکھنوی کے ڈرامے "مادر وطن"، محی الدین عزم کا "دیش کی پکار"، لالہ کشن چند زیبا کا "شہید وطن"، نور الٰہی کا "روح سیاست"، وغیرہ ایسے ڈرامے تھے جن کا مقصد سماجی اور سیاسی طور پر لوگوں کو بیدار کرنا تھا۔ یہ تمام ڈرامے فنی نقطۂ نگاہ سے کس پایہ اور مرتبہ کے ہیں اس پر بحث نہیں لیکن ان ڈراموں کے بطن میں سماجی بصیرت اور ذمہ داری کی دھمک سنائی دیتی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں بھی بیداری کی لہر سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ سماج کے ہر شعبے میں اس تغیر اور تبدیلی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ نئی تلاش، نئی تحریک اور نئے انقلابات کی خبریں سرحدوں کو پاٹتی ہوئی ہندوستان کی سرزمین تک پہنچیں جہاں شاعری اور افسانے میں تغیرات و تنوع پذیر ہوئے وہاں ڈرامے کا فن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگرچہ باقاعدہ پیشہ ور اسٹیج نہ ہونے کی وجہ سے کوئی منفرد فن کار جنم نہ لے سکا۔ لیکن ذاتی سطح پر اسکولوں اور کالجوں کے اسٹیج پر یا کسی تفریحی شام کو جب اسٹیج سجا تو بامقصد ڈراموں کی دھڑکن سنائی دی۔ رحمت علی کے "باوفا قاتل"، جاگیردارانہ ماحول اور بورژوائی ظلم و تشدد کی واردات میں قلم بند ہیں۔ حکیم احمد شجاع کے "باپ کا گناہ"، "بھارت کا لال"، یا "جانباز" اصلاحی اشارے کنائے سے بھرپور ہیں۔ یہ ایک ایسا پڑاؤ تھا جہاں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ڈراموں کی ساخت میں تغیر و تبدیلی کے آثار واضح طور پر ہونے لگے تھے (یہ اور بات ہے کہ ڈرامے کے فن اور اس کی پیش کش میں اب بھی یک رخے پن کا شدید احساس تھا) زمانہ دو چار قدم اور آگے بڑھا تو موضوع میں گہرائی اور تنوع نیز اس فن کا سلیقہ بھی نمودار ہونے لگا۔ ڈرامائی کش مکش، انفرادی میلانات اور زندہ مکالموں کے امکانات نظر آنے لگے۔ ڈراما "انارکلی" اس کی مثال ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمہ، ڈرامائیت، خود کلامی اور پیش کش یعنی

ڈرامے کی ہر سطح پر کامیاب کوششیں ہوئیں اور ڈرامانگار نے اپنے حدود میں رہ کر بھی موشگافیاں کیں جس کی وجہ سے بعد کی نسل نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ "انارکلی" یوں تو ایک کامیاب ڈراما ہے لیکن اردو کا دوسرا رخ یہ تھا کہ ڈرامے ادب چاشنی سے نکھرنے سنورنے لگے۔ ڈرامے میں بے پناہ ادبیت کے غلبے نے اسٹیج سے ان کا رشتہ کمزور کر دیا اور ڈرامے کے پودے کو سرسبز و شاداب کرنے میں ناکامی ہوئی۔ ماجد دریا آبادی کا ڈراما "زود پشیماں" اور عابد حسین کا "پردۂ غفلت" اسی قبیل کے ڈرامے ہیں۔ وہ ڈرامے جو ترجمے کے وسیلے سے ہمیں ملے۔ ان کا ذکر زیر نظر مضمون میں لاحاصل ہے اگرچہ ان ڈراموں سے تکنیک اور فارم کے علم میں ضرور اضافہ ہوا۔ سماجی سطح پر یہ ڈرامے ہندوستان کے رس جس سے ہم آہنگ نہیں مثلاً شوکت قدوائی کا "قاسم و زہرہ" یا عبدالحلیم شرر کا "شہید وفا"۔

اردو ڈراموں کا ایک عہد جدید بھی ہے۔ یہ دور ۱۹۴۰ء کے بعد کا ہے۔ یہی وہ عہد ہے جب اپٹا I.P.T.A نے سارے ہندوستان میں ایک مثبت اثر ڈالا تھا۔ پروفیسر مجیب نے "آزمائش" اور "کھیتی" جیسے ڈرامے لکھ کر سماجی معنویت کو اعتبار بخشا تھا۔ ہذا جب سجاد ظہیر نے اپنا ڈراما "بیمار" لکھا تو ایک نوع کی ادبی سیاسی اور سماجی بیداری کا احساس ہوا۔ اوپندر ناتھ اشک نے "پاپی" لکھا تو گمراہ سماج کی سطح طشت ازبام ہوئی۔ اسی طرح راجندر سنگھ بیدی نے "سات کھیل" تخلیق کیا منٹو نے "جنازہ" "تین عورتیں" اور "اس منجدھار میں" اور سردار جعفری نے "یہ کس کا خون ہے" لکھا۔ یہ سارے ڈرامے ترقی پسند تحریک اور اس کی سرگرمیوں سے متأثر تھے۔ اپٹا کی تحریک کے دوران ہی حبیب تنویر نے "آگرہ بازار" کے نام کو تھیٹر کی ساری لوازمات کے ساتھ پیش کیا۔ اگرچہ عصری معنویت کی باریابی سے اس ڈرامے کا علاقہ نہیں تھا پھر بھی جس دور کے اظہار میں یہ ڈراما رقم کیا گیا تھا اس کا بھرپور عکس ہمیں ملتا ہے۔ ماضی قریب میں جس شخص نے ڈرامے کو پوری سنجیدگی سے برتا ہے اور اس فن میں اپنی عمر صرف کی وہ ابراہیم یوسف ہیں ان کے یک بابی ڈرامے مثلاً "منتریوں کا کنونشن" "دھوئیں کے آنچل" یا جو "چپ رہے گی زبانِ خنجر" اس فن کو عصری تقاضوں سے ہم آمیز کرتے ہیں ساگر سرحدی کا "بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا" اور "تنہائی" بھی اپنی سماجی بصیرت کی بنا پر کامیاب ڈرامے تھے۔ ابو یوسف نے بہ حیثیت ترجمہ نگار برنارڈ شا کے ڈراموں "آدمی خوش نصیبوں والا" اور "اسلحہ اور آدمی" کو اردو میں پیش کر کے مقصدی ڈراموں کو تقویت پہنچائی ہے۔ اسی طرح قومی سے بین الاقوامی خطوں پر موضوع سفر کرتا ہے اور اردو ڈرامے کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ سماجی مسائل اور عصر حاضر کی تہذیب کی جھلکیاں قمر جلال کے "مٹھی بھر دھول" "ان ٹھکر کے خالی خلنے" اور "چلو ساتھ چلیں" میں صاف دکھائی دیتی ہیں اپنے ترقی پسند نظریوں کی بنیاد پر محمد حسن نے ایک ڈراما "ضحاک" لکھا جو ایمرجنسی کے زمانے کی ایک اہم دستاویز بن گیا۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اور اب تو بمبئی کے جواں سال ادیب و ڈرامانگار اقبال نیازی نے "جلیان والا باغ" لکھ کر اس پہلو کو اور بھی تقویت پہنچائی ہے۔

ادھر بنگال میں نیاز احمد خان کے مختصر ڈرامے "امن" اور "ہمارا ہندوستان" نے ڈرامے کے لئے زمین ہموار کی۔ یہ سلسلہ منقطع ہونے ہی والا تھا کہ کمال احمد نے اس فن کا دامن تھاما اور لمبے وقفے پر ہی سہی، ڈرامے اسٹیج کئے "ایک تھا راجہ" "مور کے پاؤں" "گرداب" اور "الٹی گنگا" وغیرہ ایسے ڈرامے ہیں جن میں عصری معنویت کو بآسانی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف نے بھی ڈرامے کی طرف اپنا رخ کیا ڈرامے "انتظار اور بھی" "قیدی" "صلیب" "سحر ہونے تک" اور "نئے موسم کا پہلا دن" وغیرہ ایسے ڈرامے تھے جہاں سماجی مسائل کی تصاویر بآسانی مل سکتی ہیں۔ اور ترجمے کے وسیلے سے "انصاف" اور "ایک انارکسٹ کی اتفاقیہ موت" میں "آج" اور "ابھی" کا احساس پایا جا سکتا ہے۔ نیز STATE TERRORISM پر بلیغ اشارے بھی موجود ہیں۔ جاوید دانش کے پرومیتھس (ترجمے) میں بھی ایسے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ادھر نئے قافلے نے رغبت سفر باندھا ہے لیکن ڈرامے کا فن جس قدر ڈرامانگار کے عملی اشتراک اور تجربے کا متقاضی

ہے اسی قدر مطالعہ چاہتا ہے۔ زمان حبیب اور حیدر علی کے ڈرامے پیش ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی ان کا امتحان باقی ہے۔

میں نے یہ مقابلہ ایلن روبے گریلے ALAIN ROBBE GRILLET کے ایک بیان سے شروع کیا تھا۔ فاضل ادیب نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ جب فن کار یا ادیب معنوی سطح کو قاری کے اندر منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ادب کی تخلیق نہیں ہوتی اور اس کا عمل بہت ہی COMMITED ہوا کرتا ہے۔ دراصل گریلے کے خیال میں وابستگی کا ادب معمولی ادب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادیب کے لئے اپنی زبان کے موجودہ مسائل کی وابستگی کی چنداں ضرورت نہیں اور یہ کہ فن کوئی لفافہ ENVELOP نہیں کہ ادیب کی مقصدیت کی تزئین کا الزام اٹھائے۔ سارتر نے بھی اسی طرح کے خدشے کا اظہار کیا تھا جب اس نے اخلاقی ادب کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ یہ ادب کے بجائے اخلاقی ادب ہوتا ہے۔ اور قاری یا سامعین سے اس کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ لیکن ادب کا کام تو ہمارے جذبات و احساسات کی شیرازہ بندی بھی ہے اور خصوصاً ڈرامے میں تزکیۂ نفس کے ذریعہ ہمیں ذہن کی شائستگی اور خیالوں کی بالیدگی میسر آتی ہے۔ کوئی بھی ادیب سماجی معنویت سے کٹ کر سماجی نظامِ حیات کا درس کیسے دے سکتا ہے اور یہ کہ درس دینے کا کام ادب کا ہے بھی کہ نہیں۔ یہ سوال اہم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی گراں باری کا احساس جنگ کے ہولناک مناظر، غریبی کا پر درد لمحہ، حالاتِ حاضرہ کے انفرادی اور اجتماعی مسائل، ریپ اور پولس کا ستم، یقیناً شاعر و ادیب کو اسی طرح متأثر کرتے ہیں جس طرح ایک عام آدمی کو، چوں کہ ادیب شاعر یا ڈرامانگار کے احساسات عام آدمیوں سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے ردّ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن ادب کو پروپگنڈہ بنانے والے اپنی وابستگی اور ذمہ داری اپنی پارٹی لائن کے حصار میں محدود کر دیتے ہیں۔ فاؤسٹ کی شاعری ہو کہ مولانا روم کی مثنوی۔ سارتر کے جدید فلسفیانہ ناول ہوں کہ سام شیفرڈ SAM SHEPHERD کے جدید ترین ڈرامے، سماجی معنویت اور عصری حسیات سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکے — اور نہ ہی اپنے فارم اور آرٹ سے منہ موڑ سکتے ہیں۔ اس لئے ان کا کام ایک ایسی تخلیقی بصیرت ہے جو وقت کی تاریخ ہونے کے باوجود ہمیں سرخوشی بھی عطا کرے۔ سام شیفرڈ SAM SHEPHERD کی بات سے مجھے امریکی ڈرامے کا منظرنامہ یاد آتا ہے۔ ویٹ نام کی جنگ کے دوران ہی وہاں کے ڈرامے کا منظرنامہ بدلتا ہے اور فرد کا سماج کی ذمہ داری سے رشتہ مضبوط تر ہو جاتا ہے۔ ویٹ نام کی جنگ اور دورِ حاضر کی عطا کی ہوئی بے مثال بے گانگی اور کرب نے وہاں کے ڈرامانگاروں کا زاویۂ نگاہ ہی بدل ڈالا اور سماج کے سلسلے میں سوچنے کی تحریک دی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد پورا امریکہ اپنی تہذیب میں سیاست کا عمل دخل محسوس کرنے لگا تھا۔ سیاہ فام لوگوں کا مسئلہ شدید تر ہوا۔ عورتوں کی آزادی کی تحریک چلی اور پھر ویٹ نام کی جنگ — ان سبھوں نے مل کر ڈراما کو نئے ذائقے نئی نظر اور نئی توانائی عطا کی اور ڈراموں کے موڈ سماجی معنویت سے قریب تر ہوتے گئے۔ THE OLD GLORY نام کے ڈرامے سے سماجی پہلوؤں کی عکاسی کی ابتدا ہوئی۔ قومی اور ذاتی سطح پر ضمیر کو جھنجھوڑنے کا عمل شروع ہوا MILLER, ELBEE اور O'NIEL کے ڈراموں سے جہاں ڈرامانگار کا منصب اور کردار بلند تھا۔ سماجی مسائل کی طرف راستے مڑ گئے اور بیشتر ایسے ڈرامے لکھے گئے جن میں تاریخ، سیاست اور اخلاقیات کا از سرِنو جائزہ لیا گیا۔ آرٹ اور فن کو ایک ذریعہ MEANS کے طور پر استعمال کیا گیا CIVIL RIGHTS اور ویٹ نام جنگ کی جھلکیاں راستوں اور ہوٹلوں میں دکھائی دینے لگیں۔ اپنی ایک اہم کتاب: TAKE UP THE BODIES THEATRE AT THE VANISHING POINT میں ہربرٹ بلو نے اپنی ذات پر جنگ کے اثرات کا معنی خیز تبصرہ کیا ہے وہ خود ادب میں جمالیاتی حسن اور وجدان کا قائل تھا لیکن اس کی آنکھ کے سامنے گزرتے ہوئے لمحات اسے اندر سے اس قدر کچوکے لگانے لگے کہ وہ یہ کہنے پر بلکہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔

THAT OTHER KIND OF THEATRE MAY HAVE HAD BETTER MOTIVES,

"I INCREASINGLY BELIEVE THAT IF ONE HAS THE CHOICE, AND ONE DOES, IT IS BETTER TO THINK IN TERMS OF PURPOSE, MISSION ACTION, TASK, SERVICE TO OTHERS THAN IN TERMS OF IDENTITY ALIENATION, OTHERNESS, DIVISION, BEING-IN-ITSELF-AD-NAU-SEAM; NOT VALUES BUT DEFAULT OF VALUES."

اس طرح صاف ظاہر ہے کہ انسان اپنے ارگرد سے بیگانہ نہیں رہ سکتا اس کا ضمیر اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ اس کے اندر کا سماجی انسان زندہ رہتا ہے۔ اور اپنے معاشرے سے متاثر ہوتا ہے۔ ڈراما چوں کہ محاکاتی فن ہے اور عملی طور پر اس کی پیش کش ممکن ہے اس لئے یہ انداز نظر کچھ زیادہ ہی ضروری ہے۔ اب تو ڈراما اپنے ناظرین کو بھی INVOLVE کرتا ہے اس لئے سماج سے متعلق ایک واضح یا دھندلا سا خاکہ ڈراما نگار کے ذہن میں ہوتا ہی ہے۔ لیکن چوں کہ بہت ساری باتوں کے علاوہ ڈراما ادب بھی ہوتا ہے اس لئے میں ہربرٹ بلو کے تاثرات کو حتمی قرار نہیں دے سکتا۔ جہاں تک سماجی افراتفری، ہنگامہ خیزی، پیغامبری اور دوسروں کے سلسلے میں بہتر خیال پروری کا تعلق ہے تو یہ باتیں اپنی جگہ پر اہم ہیں لیکن ڈراما کی آفاقیت جہاں مجروح ہوتی ہو۔ جہاں زبان صرف پروپگنڈہ اور اصلاح کے لئے استعمال ہو اور جہاں اس کے حکیمانہ انداز نظر دم توڑ دیں۔ جہاں ڈراما نگار کی نظر صرف اپنے مقصد پر مرکوز رہے تو اسے ادب کی دنیا میں مستحسن نہیں سمجھا جائے گا کوئی بھی ادب منصوبہ بند انداز میں تخلیق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی تخلیق میں اس بات کی امید رکھی جاسکتی ہے کہ سماجی اور معاشرتی سطح پر کوئی بہت عظیم تبدیلی رونما ہوگی یہ تو ایک طویل سلسلے کی کڑی ہے اگر ایسی تبدیلی آ بھی جائے تو بھی ادبی حسن کے بغیر وہ تخلیق بے روح ہوگی اور اس کی جگہ [illegible] اور کھرے ادب کے دامن میں نہیں ہوگی۔ ❖

بقیہ صفحہ ۲۴ بے دست و پا

مجمع چھٹنے لگا۔ اب وہ پنواڑی کی زہر بھری گالیوں کو بھول چکا تھا۔ اسی دوران بہت سارے لوگ دکان کے اطراف میں جمع ہو کر مقررہ وقت کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اب وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ "اجی میاں! ذرا اپنا ریڈیو تو کھولو" سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے کسی صاحب نے پنواڑی کو مخاطب کیا۔ "وقت ہو گیا ہے"

"ابھی کھولتا ہوں" پنواڑی نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ دیکھتے دیکھتے ہی دکان کے سامنے سر ہی سر نظر آنے لگے۔ سب کے چہروں پر آنے والے لمحات کا انتظار ایک نقش بن کر جاگزیں ہو گیا تھا۔

"ابے ادھورت حرام!" پنواڑی نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔ "خبروں کے بعد اگر تو یہاں سے رفو چکر نہیں ہوا تو پھر...."

"بھیا خبروں کی خاطر ہی تو وہاں سے یہاں آیا ہوں۔ وہاں ریڈیو ہوتا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔ "تمہاری طرح میں تازہ حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر میں بھی تو یہاں کا رہنے والا ہوں نا! ویسے اگر تم مارنا چاہتے ہو تو شوق سے مار لو، خدا نے تمہیں طاقت دی ہے۔"

"یہ تو بتاؤ اگر تم بھی طاقت ور ہوتے تو کیا صمدو سے لڑتے؟" پنواڑی کی دوکان کے قریب کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے نے بھی پوچھا

"ہاں ضرور لڑتا۔" اس نے ایک طویل سانس بھر کر کہا "مگر صمدو بھائی سے نہیں۔" "تو پھر کس سے؟" کسی نے سوال کیا۔

"ان بزدلوں سے جنہوں نے چوروں کی طرح ہم پر حملہ کیا ہے" اس کی آنکھیں یکبارگی چمکنے لگیں "سچ کہتا ہوں صمدو بھائی سچ کہتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ پیر ہوتے تو میں آج تمہاری دوکان کے سامنے نہ پڑا ہوتا میں بھی دشمنوں کے خلاف لڑتا جو رات کے اندھیرے میں آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ جنہوں نے ظلم کی حد کر دی ہے میں ان سے لڑتا۔ میں.... میں ——" فرط جذبات سے اس کی آواز کانپنے لگی۔

اس کے جواب پر بے شمار تعجب خیز نگاہیں اس کی طرف اٹھیں پھر سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ سب پہلے کی طرح اب بھی خاموش تھے۔ مگر ان کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی باتوں نے ان سب کے دلوں کی ترجمانی کی تھی۔ —— عین اسی وقت ریڈیو سے اسپیشل نیوز بلیٹن نشر ہونے لگا۔ ❖

ماہ طلعت زاہدی

زاویے

موت کیا ہے
اپنی خواہش سے گذر جانے کا نام

زندگی
شوقِ فراواں کے لئے
آئینہ بندی کا نظام

شوق کیا ہے
دل کی دھڑکن پر سراپا رقص ہونا

دل ہے سیلِ وقت میں
محبوب کی جائے قیام
ہیچ جس کے سامنے دونوں [illegible] جہاں

دو جہاں
اک حسن ہے اک عشق ہے
ایک چپ اک بے قرار
اس تضادِ باہمی پر انحصار
زندگی اور موت کا

آسمانوں میں خدا ہے
جس کو سب ہے اختیار

● ۱۷۸۴، اسٹریٹ ۱۰، آئی-ایٹ-ٹو، اسلام آباد (پاکستان)

زاہدہ زیدی

یہ لمحہ

یہ لمحہ —
نہیں وقت کا منجمد ایک قطرہ
یہ لمحہ تو ہے ایک گہرا سمندر
کہ جس میں
کئی سمت سے آ کے ملتے ہیں
پر شور دھارے

یہ لمحہ —
کہ جس کی رگوں میں رواں ہیں
کئی بیتی صدیوں کے زیر و بم
یہ لمحہ —
کہ جس کے لہو میں
کئی آنے والے زمانوں کے راز و حل
مرتعش ہیں —

یہ لمحہ تو ہے
طائرِ کوہ پیما کی پرواز کا
ایک عکسِ گریزاں
زمیں کے لبوں پر
فلک کا وہ بوسہ
کہ جو لذتِ لمس سے ماورا ہے

یہ لمحہ —
کہ جو ایک رنگین تتلی کی مانند
مائل بہ پرواز ہے
مرتعش ہے، پر اسرار ہے
یہ تتلی، اگر میری مٹھی میں آ کر اپنی آنکھیں کھولے
تو میرے تخیل کی پرواز بھی
برق رفتار لمحوں کی یلغار سے
ماورا ہو

● آبشار-۴، ایچ آئی جی فلیٹس، سر سید نگر، علیگڑھ-۲

جاوید ناصر

مجھ کو بزرگیٔ قوم، دعا بھی تو چاہیئے
تھوڑا غرور، تھوڑی انا بھی تو چاہیئے

تسلیم، دستکوں نے انھیں وا تو کردیا
ان کھڑکیوں کو تازہ ہوا بھی تو چاہیئے

وہ خواب جس کے پیچھے پرندوں کی فوج ہے
اس کو کسی کی چشمِ رسا بھی تو چاہیئے

یہ سچ نہیں کہ مجھ کو گناہوں کا شوق ہے
توبہ کا در کھلا ہے، خطا بھی تو چاہیئے

یہ جان و دل کا راستہ کتنا حسین ہے
لیکن ہمیں بدن کی سزا بھی تو چاہیئے

جاوید اپنی موت سے ڈرتا نہیں کبھی
اس زندگی میں روزِ جزا بھی تو چاہیئے

● آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

بدرِ عالم خلش

دھوپ بستر پہ مستطیل ہوئی
دوپہر اور کچھ طویل ہوئی

سرمئی پتھروں کی راہگذر
آگے نکلی تو گہری جھیل ہوئی

صرف دو میل بھر زمین تھی لاش
وسعتِ آسمان چیل ہوئی

اسمِ اعظم کا وِرد جاری کرو
آج بلقیس پھر علیل ہوئی

میرے پیارے مدینۃ الانصار
میری ہجرت بہت ذلیل ہوئی

دونوں ساحل تھے دونوں مٹھی میں
ریت ناخن میں جیسے تحلیل ہوئی

● مکان نمبر ۲، بلاک نمبر ۳، شاستری نگر، کدمہ، جمشید پور (بہار)

رونق شہری

نہ خشتِ جسم نہ تیشہ بدن سے آتا ہے
کدھر سے خوف کا ملبہ بدن پہ آتا ہے

میں چاہتا تھا کہ دیوارِ دشمنی گرتی
مرے عدو کا ہی لاشہ بدن پہ آتا ہے

کمر میں باندھ کے خنجر سپاہ بیٹھی تھی
مخالفین کے سیدھا بدن پہ آتا ہے

ہنسی کے پھول کو چھونے کی مت حماقت کر
ہر ایک سمت سے کانٹا بدن پہ آتا ہے

ہوس کی آنکھ چمکنے لگی اندھیرے میں
بدل کے بھیس سپیرا بدن پہ آتا ہے

عجیب سایۂ قحط الرجال ہے سر پر
سنگِ خریص بھی ٹوٹا بدن پہ آتا ہے

نہیں ہے سنگِ ملامت بقدرِ ظرف تو کیا
سنبھال اتنا ہی جتنا بدن پہ آتا ہے

● شعبۂ اردو، آر ایس پی کالج جھریا۔ ۸۲۸۱۱۱ (بہار)

رتن سنگھ
۲۴۴ ـــ آدرش نگر، نربدا روڈ جبلپور - ۴۸۲۰۰۸

تسلسل

مرتے وقت ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بابو رام سہاٹے اپنی بیوی کے بارے میں سوچتے جسے وہ بے حد پیار کرتے تھے یا اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچتے جن کی کامیابیوں کا ذکر وہ بڑے فخر سے کیا کرتے تھے لیکن یہ سب نہیں ہوا۔ وہ سب تو اپنے اُداس چہرے لئے ان کے سامنے کھڑے تھے، اور یہی ان کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

گھر والوں نے بالکل غیر شعوری طور پر انہیں اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ وہ آخری دموں پر ہیں اور یقینی طور پر مر رہے ہیں۔ انہیں پلنگ سے اتار کر زمین پر لٹا دیا گیا تھا۔ ان کی ہتھیلیوں پر آٹے کی دیا باتی جلا کر رکھ دی گئیں تھیں۔ کمرے میں دھوپ جلا دیا گیا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا کوئی جنا رامائن پاٹھ کر رہا تھا اور اس کی غم میں ڈوبی اُداس آواز بابو رام سہاٹے کے کانوں میں متواتر پڑ رہی تھی۔ ایسے میں بیمار کو اپنی موت کے قریب ہونے کا یقین ہو جانا قدرتی بات تھی۔ اس لئے وہ ذہنی طور پر خود کو موت کے اس ماحول سے دور لے جانا چاہتے تھے۔

ایسا کرنے کی کوشش میں پہلے تو ان کا دھیان اپنی چتا کی طرف ہی چلا گیا۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا چبوترا ہے۔ اس چبوترے پر چار پانچ فٹ اونچا لکڑیوں کا ڈھیر رکھا ہوا ہے اور اس پر انہیں لٹا دیا گیا ہے۔ موت پھر وہی موت کا ماحول۔ نہیں نہیں تو اس ماحول سے باہر آنا چاہتا ہے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لکڑیوں کا ڈھیر پھولوں کا ڈھیر بن گیا۔ طرح طرح کے پھول۔ ہر طرف ان کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ بلکہ فضا پھولوں کی مہک سے بوجھل ہو رہی تھی۔ اور وہ اس پھولوں کے ڈھیر پر لٹا دئے گئے تھے۔ تو انہیں بڑا مزا آیا۔ ایسے نرم اور خوشبودار بستر پر انہیں لیٹنے کا پہلا موقع ملا تھا۔ اور انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اتنے میں ان کے کانوں میں آواز آئی کوئی کہہ رہا تھا۔

"چتا کو آگ لگا دو۔" انہوں نے گھبرا کر دیکھا کہ کوئی پھونس کے سرکنڈے کے پولے کو آگ جلانے جا رہا تھا۔ ابھی چتا دھائیں دھائیں جلے گی۔ آگ کی لپٹیں اٹھیں گی اور ان کے جسم کے گرد چاروں طرف پھیل جائیں گی۔

"میں ابھی مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں۔ پھولوں کی سیج پر بیٹھا ہوں۔" وہ زور سے چلائے۔ انہوں نے پھولوں کے ڈھیر سے پھول اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لئے اور انہیں چاروں طرف بکھیرنے لگے۔ جیسے وہ سب کو بتانا چاہتے ہوں۔ "دیکھو دیکھو میں چتا پر نہیں پھولوں کے نرم بستر پر بیٹھا ہوں۔"

انہوں نے ڈرتے ڈرتے چور نظروں سے دیکھا۔ سرکنڈے کے پولے کو ابھی آگ نہیں لگی تھی۔ پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ جو ان کی چتا کے گرد کھڑے تھے وہ سب کے سب وہاں سے غائب ہو گئے۔ انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ چتا میں جلنے سے بچ گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد انہیں لگا جیسے نیا دن چڑھ آیا ہو۔ یہ بھی غالباً اس لئے ہوا کہ نیم بے ہوشی کے عالم میں جانے سے پہلے ان کی پلکیں بند ہوئیں تو ان کی نظریں دیوار پر ٹنگی اپنی پوتی کی بنائی ہوئی اس پینٹنگ پر لگی ہوئی تھیں جس میں اُگتے ہوئے سورج کی پہلی کرنیں ایک بہت بڑے برگد کے پیڑ پر پڑ رہی تھیں۔ شاید وہی تصویر والا سورج ان کے تصور میں طلوع ہو رہا تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی بہت تیز ہے۔ عام روشنی کی نسبت دوگنا بلکہ چارگنا روشن لگتا تھا جیسے ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ چار چار سورج طلوع ہو رہے ہوں۔ انہوں نے

غور سے سورج کی طرف دیکھا۔ سورج تو ایک ہی تھا۔ مگر اس کی روشنی زیادہ کیوں ہے؟ انہوں نے سوچا۔ یہ بات میری سوچ سے باہر ہے ایسا سوچ کر انہوں نے خود کو اس سوچ سے آزاد کر لیا اور سامنے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس روشن دھوپ میں، کھیتوں۔ پیڑوں، پہاڑوں اور پہاڑوں پر موجود گھنے جنگل کے پیڑوں کی رنگت یکسر بدل گئی تھی۔ جو ہری تھی وہ گہری ہری ہو گئی تھی۔ لال۔ پیلے پیلے اور دوسرے رنگ سب سے زیادہ گہرے اور زیادہ خوبصورت ہو گئے تھے انہوں نے حیران ہو کر اپنے قدموں میں دیکھا زمین کی جس سوکھی گھاس پر وہ کھڑے تھے اور جس کی طرف زندگی بھر ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس میں انہیں ایک نئی جاذبیت، نئی کشش، نیا حسن دکھائی دے رہا تھا ایسا حسن جسے وہ لفظوں میں بیان کرنے سے خود کو قاصر پا رہے تھے۔ وہ تو بس دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے کہ وہ کس دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

اس نئی دنیا میں ان کے تصور نے انہیں ایک برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچا دیا وہ تصویر والا برگد کا پیڑ نہیں بلکہ اصلی برگد کا پیڑ۔ اصلی اور بہت بڑا۔ اس پر بھانت بھانت کے پنچھی چہک رہے تھے ایک ڈال سے دوسری ڈال تک پھدک رہے تھے ایک دوسرے کی طرف گردنیں گھما کر دیکھ رہے تھے ایک چڑیا دوسری چڑیا سے چونچیں لڑا رہی تھی۔ اس کے پنکھوں میں اپنی چونچ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی بابو رام سہائے کو یہ سب بہت اچھا لگا۔ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ برگد کا اصلی پیڑ انہوں نے زندگی میں پہلے کبھی دیکھا ہے یا نہیں۔ شہر میں پیدا ہوئے شہر میں پلے بڑھے اور اب شہر میں ہی بستر مرگ پر پڑے تھے۔ برگد انہوں نے صرف تصویروں میں ہی دیکھا تھا۔ اب اصلی برگد کے نیچے پہنچ کر انہیں لگا جیسے وہ سورگ پری میں پہنچ گئے ہوں۔ ٹھنڈا میٹھا سایہ انہیں بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا انہوں نے لمبی لمبی سانسیں لیں انہیں لگا ایک نئی طرح کی تازگی اور خوشبو سے لدی ہوا ان کے وجود میں داخل ہو رہی ہے اپنے زندہ ہونے کا یہ سب سے بڑا ثبوت تھا اس سے ان کو بڑی تسکین ملی ذرا سا تازہ دم ہوئے تو ان کے دل نے کہا کہ کہیں لیٹ کر آرام کیا جائے اور آرام کرتے ہوئے پنچھیوں کے چہچہاتے ہوئے سنگیت کو سنا جائے۔ انہوں نے نظریں دوڑائیں۔ برگد کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی پانی کی "آڑ" بہہ رہی تھی۔ اس نالی میں پانی کہاں سے بہہ رہا ہے۔ تبھی ان کی نظر قریب ہی چل رہے رہٹ پر گئی جس کی ریں دیں

کھٹ کھٹ کی آواز کی طرف ابھی ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔ پانی کی نالی کی مینڈھ سے ٹیک لگا کر وہ نیم دراز ہو کر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں اب ان کے کانوں میں برگد کے پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ، پنچھیوں کی چہچہاہٹ اور پاس ہی چل رہے رہٹ کی ریں ریں کھٹ کھٹ کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں کبھی کبھی برگد کا کوئی سوکھا پتہ یا اس کے گول گول پھل پانی کی نالی میں آ کر گرنے تو چھپ کی آواز آتی تو سوئی ہوئی زندگی جیسے جاگ جاتی۔ ایسے ہی موقعے پر بابو رام سہائے نے ایک بار آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گلہری ان کے پاس ہی بیٹھی برگد کے گول پھل کو اپنے اگلے دونوں پنجوں میں تھامے کتر کتر کر کھا رہی ہے۔ وہ کتنی دیر تک گلہری کو پھل کھاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس دوران ان کا دھیان گلہری کے جسم پر بنی ہوئی لکیروں پر چلا گیا۔ لگتا تھا جیسے بھگوان نے اسے پیدا کرنے کے بعد اپنی انگلیوں سے اس کے جسم پر لکیریں کھینچ دی ہوں اس خیال کا آنا انہیں بہت اچھا لگا۔ ان کی نظر میں گلہری اور خوبصورت ہو گئی دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت جانور جسے وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

اس منزل پر پہنچ کر انہیں افسوس ہوا جیسے وہ خود کو موت کے اس ماحول سے دور لے آئے ہوں جہاں ان کے گھر والوں کے اداس چہرے تھے، آنسوؤں سے ڈب ڈبائی آنکھیں تھیں آتے جاتے ہوئے دئے تھے اور رامائن کا پاٹھ کرنے والے کی مدھم سوگوار آواز تھی۔

انہوں نے سوچا۔ ابھی مجھے اس ماحول سے اور دور جانا چاہئے اتنی دور جہاں موت کا سایہ بھی نہ پہنچ سکے۔

اتنا سوچتے ہی اس نے دیکھا کہ ایک آموں کا باغ ہے جس کے نیچے بنجارے کسی خوشی کے موقعے پر ناچ رہے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی ایک بنجارن کی کمر میں ہاتھ ڈالے ناچ رہا تھا۔ بنجارن کا چہرہ گھونگھٹ سے ڈھکا تھا۔ مگر گھونگھٹ کی اوٹ میں اسے لگتا تھا کہ اس کا حسن شمع کی لو کی طرح چمک رہا تھا اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اس لو کی آگ اس کے گھونگھٹ کو آگ نہ لگا دے۔ ناچتے ناچتے وہ تھک کر ایک پتھر پہ بیٹھ گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ناچنے والی بنجارن گھونگھٹ کی اوٹ سے مسکراتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے حسن کی لو اور تیز ہو گئی اور زیادہ روشن اور اسے لگا کہ اس کے گھونگھٹ کی اوٹ میں کوئی نیا سورج طلوع ہو رہا ہے ویسا ہی

سورج جیسا اس نے صبح دیکھا تھا۔

تبھی اسے محسوس ہوا کہ کسی کی انگلیاں اس کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کر رہی تھیں رستے میں دو ایک گرم آنسو اس کی کلائی پر گرے وہ سمجھ گیا کہ اس کی نبض ڈوب رہی ہے۔ تبھی تو کوئی اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکا۔ نہیں ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا۔ موت کے اس ماحول سے اُسے دُور بہت دُور چلے جانا چاہیئے۔ اس نے سوچا۔

تبھی اس نے خود کو اڑتے ہوئے پایا۔ ندی نالوں اور اونچے اونچے پہاڑوں پر اڑتے اڑتے اسے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھا کہ آخر وہ اس موت سے دور چلا آیا ہے جو اس کے کمرے میں پہرہ دے رہی ہے۔

وہ ایک گھاٹی کی ڈھلان پر اترا تو لہنگا چولی پہنے ایک گجر لڑکی اپنے ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ تھامے کھڑی تھی وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی گوری لمبی انگلیوں سے دودھ میں شکر ملاتی جا رہی تھی یہ میٹھا دودھ پی کر اس کے جسم میں تر و تازگی بھر گئی۔ اب وہ پھر ان پہاڑوں کے اوپر اڑا جا رہا تھا جن کی بلند چوٹیوں کو برف کی چادر نے ڈھانپ رکھا تھا پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ انجان دیش کی وادیوں اور بستیوں میں پہنچ گیا وہاں ایک بڑے شہر میں اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس دن کے ہر اخبار میں اس کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں اور لوگ بڑے اشتیاق بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس سے بات کرنے کے لئے اس کو قریب سے دیکھنے کے لئے لوگ اُمڈے پڑے تھے۔ یہ سب دیکھ کر اُسے خوشی اس بات کی نہیں تھی کہ شاید وہ بڑا آدمی بن گیا ہے بلکہ خوشی اس بات کی تھی کہ اس اجنبی دنیا میں اگر اسے رہنا بھی پڑا تو وہ ایک اجنبی بن کر نہیں، اجنبیوں کے بیچ نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے بیچ رہے گا جو اسے اپنا سمجھتے ہیں۔

پھر اس نے اپنے آپ کو ایک فارم ہاؤس میں ایک کسان کے ساتھ کھانے میں شریک پایا اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ کسان کا پریوار بڑا خوشحال تھا۔ بڑی ہی صاف ستھری میزوں پر کھانا پروسا گیا تھا۔ شراب، گوشت، کئی طرح کی سبزیاں، پھل، خشک میوے اور نہ جانے کیا کیا۔ ایک عام کسان کو زندگی کی یہ سہولتیں بھی مل سکتی ہیں یہ جان کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔

کھانا کھا کر جب وہ وداع ہوا تو کسان نے چلتے وقت اُسے بہت سے تحفے تحائف سے لاد دیا وہ سب لے کر وہاں سے چلا تو اس نے خود کو پھر اسی برگد کے پیڑ کی ایک شاخ پر بیٹھا پایا جس پر بھانت بھانت کے پنچھی چہک رہے تھے۔ فرق اگر تھا تو صرف یہ کہ اب اس پیڑ کے پاس ایک دریا بہہ رہا تھا دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا اور جس میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔

پیڑ کی شاخ پر بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ دریا کے پانی نے اس برگد کو چاروں طرف سے گھیر لیا اب اوپر وہ بیٹھا تھا برگد پر اور اس کے نیچے سے دریا کا پانی شائیں شائیں کرتا بہتا جا رہا تھا۔ اس پانی کو اس نے غور سے دیکھا اس میں پانی کے بلبلے بنتے تھے تھوڑی دور تک پانی کے بہاؤ میں بہتے چلے جاتے پھر لوٹ کر اسی پانی کا حصہ بن جاتے تھے۔ لہریں بنتی تھیں۔ اچھلتی کودتی آگے بڑھتی تھیں اور پھر اسی بہاؤ میں جذب ہو جاتی تھیں۔

وہ بہت دیر تک اس کھیل کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ دریا میں اتنا پانی کہاں سے آگیا شاید اس کی بیوی۔ اس کے بچوں اور دوست احباب کے آنسو ہیں، جن کی وجہ سے دریا میں سیلاب آگیا ہے وہ اپنے اس خیال پر دل ہی دل میں ہنسا۔ تبھی کہیں سے چھپ کی آواز آئی، شاید کوئی زمین کا ٹکڑا کٹ کر دریا میں گرا تھا اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا گرا۔ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی اسے لگا جیسے وہ ہوا میں معلق ہو کر نیچے گر رہا ہو۔ یہ کیا ہو رہا تھا وہ کچھ سمجھ نہیں پایا پھر بہت بڑی چھپ کی آواز آئی اور اسے احساس ہوا کہ اس کے تصور کا وہ برگد کا پیڑ ہی پانی میں گر گیا تھا اور ڈوب رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ زندگی کا وہ برگد پانی میں ڈوب رہا تھا اور دریا کا پانی چادر کی طرح اس پر پھیلتا جا رہا تھا۔

ادھر بستر مرگ پر اس کی گردن ڈھلک گئی تھی اور اس کی بیوی نے اس کے بے جان چہرے کو چادر سے ڈھانپ دیا تھا بلبلہ ٹوٹ گیا تھا مگر وقت کا بہاؤ اسی طرح جاری تھا۔ ❁

شاعر کا نیا پتہ

'Shair' Monthly
P.O Box No. 3770
Girgaon H.P.O.
Bombay 400 004

شین کاف نظام

ایک منظر

دیو قامت پہاڑ۔
جن پر کھڑے ہیں
دیودار اور چنار
نیچے، گھاٹی میں
مچلتا، سایوں سے کھیلتا، بہتا
آب
جس کی تاب
پڑتی ہے چہرے پر
چاند کے منہ دھوتے۔

ماہ وماہی

ماہ
ماہی سے خفا ہے
اچھل کر اس نے
کر دیا
منتشر منظر

سورج ماہی کے تعاقب میں
گئی ہے ساحلوں تک

● کلاس اسٹریٹ، جودھپور — ۳۴۲۰۰۱

جبّار جمیل

کینواس

[اعجاز مصوّر کے نام]

تخیّل کی سبھی پریاں تمہاری
تمہارے رنگ
رنگوں کے چناؤ بھی تمہارے
تمہارا برش
مگر یہ سب عناصر
میں نہ ہوں تو
بے دست وپا
کہ میں تو کینواس ہوں ----

● ۲۔ کنیٹ سنگتراش واڑہ گلبرگہ (کرناٹک)

جینت پرمار

دھوپ میں چمکتی ہے
زرد ریت چاندی سی
کھیلتے ہیں کچھ بچے
پھول تتلیاں تارے

سیپیوں سے سجتے ہیں
خواب رنگ برنگی سے
خود ہی توڑ دیتے ہیں
خود ہی پھر جھگڑتے ہیں

ہم بھی ننھے منّے تھے
ریت کے بناتے تھے
گیند، گھر، حسین مندر

تھا مزہ لڑائی میں
تھا مزہ جدائی میں
اتنی ریت اگر اس وقت
ہم کو بھی ملی ہوتی
سورگ پاس ہی ہوتا!

نرم ریت پر بیٹھا
سوچتا ہوں میں کب سے
گیند، گھر، حسین مندر
کس طرح بناؤں میں
فن رہا نہ ہاتھوں میں

زیست نے مزہ کتنا
اُف! چلا گیا سارا!!

● ۳۔ مدھوبن اپارٹمنٹ، نزد گیاتری گیان پیٹھ وڈاج۔ احمد آباد۔۱۳ (گجرات)

شہپر رسول

خمارِ نطق نے اور لفظ کے سبو نے دیا
ترا سُراغ مجھے تیری گفتگو نے دیا

طویل نیند کی راحت مجھے شجر نے دی
شجر کو پھولنا پھلنا مرے لہو نے دیا

اُنّی کے عیب بنے میرے طرّۂ دستار
امیرِ شہر کا رتبہ مجھے عدو نے دیا

زمانے بعد ترے نام پر میں یوں چونکا
جلا دیا ہو اندھیرے میں جیسے تو نے دیا

کوئی صدا تری دوری نے، تیر ہجر نے دی
کوئی پیام نگاہِ ستارہ جو نے دیا

دماغ و چشم بھی قلب و نظر بھی سب کچھ تھے
مگر ثبات تو شہپر رگِ گلو نے دیا

● شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شارق کیفی

بات میری خوشی کی نہیں ہے
خامشی تم پہ سجتی نہیں ہے
وہ خبر مِل گئی جس کا ڈر تھا
اب مجھے کوئی جلدی نہیں ہے
چاندنی کا مزہ لیں تو کیسے
گھر میں اپنے دیا ہی نہیں ہے
جانے کب سے ہوں اگلے قدم پر
ہاں وہ آواز ڈوبی نہیں ہے
کیوں نہیں روٹھتے یار مجھ سے
ایسی حالت تو میری نہیں ہے
اپنی پرچھائیں کھو دی ہے میں نے
بات تاریکیوں کی نہیں ہے
آج تک میں یہی سوچتا تھا
دور تک میری باری نہیں ہے
دوپہر ہو گئی زندگی کی
دھوپ میں اب بھی تیزی نہیں ہے

● ۱۳۲، گڑھی راؤ بہادر سنگھ، بریلی (یوپی)

شاہد جمیل

خود اپنے خوابوں میں، گرتا سنبھلتا رہتا ہوں
میں تیری یاد سے آگے نکلتا رہتا ہوں

وہ میری نیندوں میں اترے تو کیوں نہ تھک جائے
میں اپنے خوابوں کے منظر بدلتا رہتا ہوں

وہ ایک نام جو بے چین کرتا رہتا ہے
اسی کو سوچ کے اکثر بہلتا رہتا ہوں

میں ڈھونڈ لیتا ہوں ہر بار کوئی اوس کی بوند
پھر اس کی یاد کی بھٹی میں جلتا رہتا ہوں

جو اس کا دل ہے، نہ میری ہوس، فقط اک خواب
اسی کھلونے کی خاطر مچلتا رہتا ہوں

● رجسٹریشن آفس، جوگی ہاٹ ضلع ارریہ (بہار)

ناصر بغدادی

ای-۸۰۲/۱۴، معمار اسکوائر، بلاک ۱۴، گلشنِ اقبال، کراچی، پاکستان

بے دست و پا

ابھی بارہ نہیں بجے تھے مگر اس کی بے چینی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ مختلف النوع جذبات کے دائرے میں چکراتا ہوا، وہ بھوک کے احساس سے بھی کوسوں دور نکل گیا تھا۔ جیسے وقت کی ایک تعیّن شدہ حد سے اٹوٹ رشتہ جوڑ کر وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا ہو۔۔۔ دور سے کسی شریف النفس اور سنجیدہ مزاج بابو قسم کے آدمی کو آتا دیکھ کر وہ نہایت لجاجت سے ہاتھ اٹھا کر اس کو روک لیتا اور عاجزانہ لہجے میں پوچھتا۔

کیا بجا ہے بابوجی؟

اور اس کے قریب سے گزرنے والا عجلت میں اس کو وقت بتا کر چند قدم آگے نکل جاتا مگر جوں ہی اس کی زبوں حالی اور معذوری کا خیال آتا تو کچھ سوچتے ہوئے مڑ کر اس پر ہمدردی کی ایک نظر ڈالتا اور چند سکے اس کے آگے زمین پر بچھی اس کی حالت جیسی خستہ دری پر پھینک کر اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے جمِ غفیر میں گم جاتا۔

صبح سے اس نوع کے واقعے کا متعدد بار اعادہ ہو چکا تھا مگر سکوں کی جھنکار جہاں مدھر راگنی بن کر اس کے رگ و ریشے میں سرخوشی کے احساسات کو جنم دیتی، وہاں وقت معلوم کر کے اس کا دل نامعلوم سی بے تابی سے ہم آغوش ہو کر کسی ضدی بچے کی طرح تڑپ تڑپ اٹھتا۔ ابھی ابھی خلیفہ جی کی ہوٹل کا سکڑوہ باہر والا پانچویں مرتبہ کھانے کو پوچھ کر ناک بھنویں چڑھاتے ہوئے واپس لوٹا تھا، اور اس لمحے وہ اس بدتمیزی کے مظاہرے پر جل بھن کر رہ گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ لپک کر اس کا ٹینٹوا دبا دیتا، مگر احساسِ مجبوری نے اس کے دل کے دامن کو تھاما تو اس نے نہایت دکھ کے ساتھ سوچا کہ وہ تو محض ایک آہ بھرنے کے ہی قابل ہے! اور اسی وقت پنواڑی کی قینچی جیسی چلتی زبان۔۔۔ ایک بار پھر بیہودگی کے طوفان کا پیش خیمہ بن گئی تھی۔

"ارے اُو دیکھنے، آخر تو یہاں اپنی قبر بنانے پر کیوں تُل گیا ہے!؟"

پنواڑی کے تیور اچھے نہیں تھے، لہٰذا وہ خاموش ہی رہا مگر اس کی خاموشی پنواڑی کے بے لگام غصے کو خاموش نہ کر سکی۔

"حرام خور کے تخم! تجھے اپنا ٹھیہ چھوڑ کر یہاں مرنے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا یہاں قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔" اتنا کہہ کر پنواڑی زور زور سے کھانستا رہا۔ پھر آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں ایک بار پھر شرافت سے کہتا ہوں کہ یہاں سے چلتا بن!"

اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ جوابی حملے کے طور پر اپنی زبان استعمال نہ کر سکتا تھا مگر موقعہ کی نزاکت کے پیشِ نظر آج خلقِ خدا کے سامنے اتنی ذلت برداشت کرنی پڑ رہی تھی، بس وہ کمزور آواز میں یہی کہہ سکا۔

"صمدو بھیا۔ میرے یہاں بیٹھنے سے تمہارا کیا جائے گا؟"

"دیکھو بھائیو، یہ بھی سنو۔" پنواڑی نے ایک معزز آدمی کے ہاتھ میں کیپسٹن سگریٹ کا پیکٹ تھما کر تنکاتے لہجے میں کہا۔ "اب آپ ہی انصاف سے کہیں کیا یہ بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اس کی وجہ سے میرے کاروبار کا بیڑا غرق ہو رہا ہے۔ گاہکوں کو اس منحوس پر سے پھلانگ کر آنا پڑتا ہے۔"

"اماں چھوڑو بھی ان باتوں کو!" ایک نورانی چہرے والے بزرگ متانت سے بولے۔ "بیچارہ اپاہج ہے کہاں جائے گا؟" ان کا دایاں ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ چند سکے اس کی طرف پھینک کر وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گئے۔

پنواڑی کی دکان پر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ ہر خریدار کی یہی کوشش تھی کہ سب سے پہلے اسی کی فرمائش پوری ہو۔ بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سگریٹ سلگائے جا رہے تھے۔ پان کی جگالی کا سلسلہ جاری تھا۔ ماچس کی تیلیاں نچ رہی تھیں۔ اسی دوران سے لٹکی ہوئی وہ تڑی سی رسی کا آخری کونا چپ چاپ اس کے دل کی طرف بڑھتا

بجا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی گرم پیشانی کو آہستہ
سے دبا لیا۔ اور خاموش نظروں سے راستے کے اس پار شان و تمکنت
سے کھڑے اس ضعیف العمر درخت کو دیکھنے لگا جس کی فرحت بخش
گھنی چھاؤں میں چند معصوم بچے کھیل رہے تھے۔ اور تب اس کے لبوں
پر ایک عجیب سی بے نام مسکراہٹ جگنو بن کر چمک اٹھی۔ ذہن ماضی کے
غبار سے معمور ہو گیا۔ تو اس غبار میں ماضی کی یادیں ننھے ننھے دیئے بن کر جلنے
لگیں اور دنیا والوں سے بے خبر ہو کر وہ ماضی کے ہموار راستے پر
گامزن ہو گیا!!

ان دنوں اس کی عمر یہی کوئی گیارہ بارہ برس تھی اس کھلاڑی کی بنا پر
وہ علاوہ اس کے ساتھی لڑکوں اور گلیوں میں بڑی سنجیدگی سے کرکٹ
کی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ راستے چلتے راہ گیروں اور دوڑتی
بھاگتی گاڑیوں کی وجہ سے کھیل تو نہیں رک سکتا تھا۔ ایک دن جب اس
نے شاندار ہٹ لگا کر خود کو سینیف ثابت کرنا چاہا (گیند پر چوکا یا چھکا
تو نہیں بن سکا لیکن وہ ایک راہگیر کے سر سے ضرور ٹکرا کر گئی۔ اس سے
پہلے بھی اس نوع کے بہت سارے حادثات پیش آ چکے تھے اور لوگ ـــــ
عموماً ایسی معمولی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا کرتے تھے۔ مگر وہ راہگیر
دوسروں سے کچھ زیادہ ہی مختلف تھا۔ نتیجہ میں اس جلاد صفت نے
اس بے رحمی سے اس کی پٹائی کی کہ اس کا مدقوق جسم پنکچر ٹائر کی طرح ڈھیلا
پڑ گیا۔ پہلے تو اس کمبخت نے دو مرتبہ اٹھا کر اس کو کمر کے بل زمین پہ دے
مارا۔ پھر اس کا ایک ہاتھ اس طرح موڑا گیا جیسے کوئی گیلے کپڑے کو نچوڑ
رہا ہو۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک ایسا دھکا دیا کہ وہ سنبھلنے
کی کوشش کے باوجود ناہموار زمین پر لڑھکتی آغوش میں پہنچ گیا۔ پھر اسے
کچھ یاد نہیں رہا۔ جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ اس کا باپ سرہانے
بیٹھا کچا چبانے والی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ چند منٹوں تک
وہ اسے خاموش گھورتا رہا۔ پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ جب واپس لوٹا تو اس
کے ساتھ محلہ کا ایک مشاق جراح تھا جو قصائی ہونے کے ناطے بڑی
بیدردی سے اس کے ہاتھ کی ہڈی کو کھٹ کھٹ بجا کر دیکھتا رہا۔ وہ ذبح
ہونے والے بکرے کی طرح چلا چیخ کر آسمان سر پر اٹھاتا رہا۔ گڑگڑاتے
دیتا اور چلانا تو دور کی بات کوئی دوا اسے دوا دیا پر کان دھرنے
کو تیار نہ تھا۔ جراح تو خیر پڑھا لکھا لاپروا لائے سے اس پر مشق ستم آزمائے
جا رہا تھا مگر اس کا باپ بغیر جانے بوجھے اس پر مغلظات کا ڈھیر لادے
جا رہا تھا۔ پھر اس نے سمجھا کر تن بہ تقدیر ہو کر خاموشی سے سب کچھ

دیکھتا رہا۔ ایک سفاک عمل کے ذریعہ جراح نے اس کے پورے ہاتھ کو
جھٹکے سے کھینچ کر ایک بڑی سی پٹی سے لپیٹ دیا تھا۔

- - - - - - - - - -

کئی روز تک وہ چارپائی پکڑ کر لیٹا رہا۔ پٹی کھلی تو ہاتھ ایک بے جان شے
کی طرح نیچے کو لٹک گیا تھا اس نے پوری قوت صرف کر دی کہ ہاتھ خود سے
ذرا دیر کو اوپر اٹھ جائے مگر اس کی کوشش بار آور نہ ہو سکی صرف درد کا
احساس تھا جو کرنٹ بن کر مردہ ہاتھ کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس بار اس
کا باپ اپنے شدید غصے کے منہ میں لگام نہ دے سکا۔

"او کتے دفان ہو جا" ایک بھرپور تھپڑ اس کے گال پر رسید ہوا
'اب ہاتھ سنڈ منڈ زندگی تیرا مقدر ہے' اس موقع پر اس کی سوتیلی ماں بڑھ
چڑھ کر اس کے باپ کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہی تھی۔ سوتیلے پن کے اس
روپ کی بابت وہ پہلے بھی اپنے خاندانی بزرگوں سے مختلف النوع باتیں
سن چکا تھا۔ مگر کم عمری کے باعث وہ ان پیچیدہ جذباتی تعصبات
کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ مگر آج تو جیسے اس کی ذہنی کیفیت بالکل ہی مختلف
تھی وہ تو ایک جہاندیدہ بڑے آدمی کے ذہن سے اپنی ذاتی زندگی کے
حالات کا تجزیہ کرنے لگا تھا۔ تھپڑ کی تکلیف وہ بھول چکا تھا
اور اب گھبرا کر کندھے سے لٹکا ہوا ہاتھ دیکھ رہا تھا جیسے کوئی
سیاہ ناگ اس کے جسم سے لپٹا ہوا ہو! اور تب پہلی بار اسے
احساس ہوا کہ اس کا ایک ہاتھ اس کو داغِ مفارقت دے چکا ہے!!-

گھر سے باہر نکلا تو ایک بار پھر اس کے اندر کا سویا ہوا کھلنڈرا اور
شرارتی بچہ بیدار ہو گیا کچھ دیر قبل وہ زندگی کو جس تجربہ کار ذہن کے
حوالے سے پرکھ رہا تھا اب وہ ذہن اس کے پاس موجود نہ تھا۔ وہ پھر گیارہ
بارہ برس کا بچہ تھا جس کے نزدیک ایک ہاتھ کے بیکار ہو جانے کا احساس
اتنا شدید نہ تھا کہ وہ اردگرد کے دلچسپ اور رنگارنگ کھیل تماشوں
سے منہ موڑ کر زندگی کی منفی اقدار کو سینے لگا لیتا اور مراقی بن کر رہ جاتا ہے!

جب وہ کچھ ٹھیک ٹھاک ہوا تو پھر اس کو ان گلی کوچوں کی یاد ستانے
لگی جہاں اس کے پرانے ساتھی اس کے منتظر تھے اور جہاں کی فضاؤں
میں ہر طرح دلچسپی کی ہر شے میسر تھی۔ باہر قدم رکھتے
ہی ایک ہاتھ کی دائمی معذوری کے تکلیف دہ احساس نے دم توڑ دیا
تھا۔ اور شرارتوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے کے لیے بیتاب تھا۔

ابھی وہ جشنِ مسرت کا پوری طرح اہتمام بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ایک
بھرے پرے موڑ پر ایک ضعیف العمر بزرگ سے ایسا ٹکرایا تھا کہ ہاتھ
کی سوئی ہوئی تکلیف نے آنکھیں کھول کر اس کے جشن کا دودھ

دلاوالا ایک مرغی سی تعفن زدہ گالی اس کے ذہن میں ابھری مگر اس سے پہلے کہ وہ اس گالی کو استعمال کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کرتا کہ ایک نورانی ہاتھ آگے بڑھا اور اس کی ہتھیلی پر ایک چمکدار سکہ چاند بنکر جگمگانے لگا۔
بڑھا اور اس کی ہتھیلی پر ایک چمکدار سکہ چاند بن کر جگمگانے لگا۔

"بیچارہ! اس عمر میں یہ معذوری! بزرگ نے ایک راہ چلتے نوجوان کو مخاطب کر کے اس کے لٹکتے ہوئے مردہ ہاتھ سے متعارف کرایا۔ "خدا رحم کرے" کا نعرہ بلند کر کے وہ نوجوان تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

اور پھر جب بزرگ نے بھی اپنی راہ لی تو اچانک اس کی زندگی کا اندھیرا راستہ روشنی کے سیلاب سے بھر گیا۔ پہلی بار بالکل اتفاقیہ طور پر اس پر یہ راز آشکار ہوا تھا کہ اس کی مجبوری قدر و قیمت کی حامل تھی۔ پہلی بار وہ یہ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ جس کو وہ اب تک اپنی زندگی کا بدنما ترین داغ سمجھتا رہا تھا در حقیقت وہی اس کی مادی خوشحالی اور فارغ البالی کا اکلوتا ذریعہ بن سکتا تھا! اگلے موڑ پر پہنچ کر اس نے پرانے یاروں کی تلاش کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بے مقصد کوچہ گردی کے پروگرام پر خاک ڈال دی۔ نئے نئے فقیر کو ویسے بھی بھیک کی جلدی ہوتی ہے چند لمحوں بعد جب وہ بھرے بازار میں پہنچا تو اس کے چہرے پر بھرپور مظلومی کا تاثر نمایاں تھا۔ اس نے اس انداز سے لوگوں کو اپنے لٹکے ہوئے مردہ ہاتھ کی طرف متوجہ کیا کہ شقی القلب حضرات پر بھی ایک عجیب قسم کی رقت طاری ہو گئی۔ اور اس کے بے جان لٹکتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر راہ چلنے والوں کے ہاتھ میکانکی انداز میں جیبوں کی طرف بڑھ گئے۔ کافی دیر بعد جب اس کے قدم گھر کی طرف پلٹے تو دبلے پتلے جاپانی جیسے چہرے پر خوشی کے رنگ بچوں کی طرح اچھل کود میں مصروف تھے۔ اس نے محسوس کیا جس قارون کی کہانی اس نے صغر سنی میں اپنی نانی کی زبانی سنی تھی آج جیسے اس کے خزانے کی چابی اس کے ہاتھ آ گئی ہو!

اور پھر اس دن اس نے جو کچھ کیا تھا اس کا اعادہ باقاعدگی کے ساتھ روز ہونے لگا۔ زندگی جس ڈھرّے پر چل نکلی تھی۔ اس سے وہ ہر لحاظ سے مطمئن تھا۔ یوں بیٹھے بٹھائے معقول آمدنی کا انتظام ہو گیا تھا کہ کفران نعمت کی غلطی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سگی ماں تو تھی نہیں کہ اس کے دن بھر کے اعمال کا محاسبہ کرتی۔ باپ نے دوسری شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی طرف سے اپنی آنکھیں پھیر لی تھیں

لہٰذا گھر میں کوئی ایسا فرد نہ تھا کہ اس کی دن بھر کی مصروفیات پر کڑی نظر رکھتا۔ جیسے ہی اس کا باپ صبح کام کے لیے نکلتا وہ تیر کی طرح برق رفتاری سے بس اسٹاپ کی طرف لپکتا اور بس کے انتظار میں کھڑے مسافروں کے آگے پیچھے پروفیشنل مانگنے والوں کے رٹے رٹائے جملے طوطے کی طرح مخصوص انداز میں مسلسل دہرائے جاتا۔
اس کی فقیرانہ صدائیں صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوتیں۔ ان کی گونج کا خاطر خواہ جواب ملتا اور صبح ہی صبح اس کو اتنا کچھ مل جاتا کہ گنتی کرتے کرتے۔ اس کا صحت مند ہاتھ تھک جاتا مگر اس تھکن میں بھی ایک کیف افزا احساس شامل ہوتا۔ اللہ کے بندوں کا دیوانہ وار پیچھا کرنے اور گلا پھاڑ پھاڑ چلانے کے سبب اچانک وہ محسوس کرتا کہ اس کی انتڑیاں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ پھر وہ مطمئن سے قریبی ریستوران میں گھس جاتا۔ اور خوب شکم سیر ہو کر کھاتا کچھ دیر آرام کے بعد کاروبار کی دوسری شفٹ شروع ہو جاتی وہ بس اسٹاپ کی طرف دھیمی رفتار سے آنے والی بسوں پر بندر کی طرح زقندیں بھرتے ہوئے سوار ہو جاتا۔ اور پیشہ ور بھکاریوں کے مخصوص درد بھرے پیرائے میں اپنی زندگی کی مفروضہ غمناک کہانی سنانے لگتا۔ ایسے موقعوں پر اس کے چہرے کے ہر حصے پر یاس، افسردگی اور بیچارگی کے امتزاج سے ایسے نقوش ابھر آتے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اپنی شاندار اداکاری پر اس کو اپنی توقع سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا!
اب اس کی زندگی اس نئے محور کے گرد فرحاں و شاداں چکر کاٹ رہی تھی۔ بسوں کے آگے پیچھے دیوانہ وار بھاگنا اور راہگیروں کے سامنے گڑگڑا کر ہاتھ پھیلانا ہی اس کا مقصد حیات بن گیا تھا۔ اس کے ایک مردہ ہاتھ نے اس کے سارے وجود کو زندہ رکھنے کی ضمانت۔ دے دی تھی۔ مگر ایک دن اچانک اس کے باپ نے اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اور گھر لے جا کر اس طرح پٹائی کی کہ اس کو اپنی جنم پیدائش پر افسوس ہونے لگا۔ چمڑی ادھیڑنے کی حد تک جب وہ اس کی مرمت کر چکا تو اس کے ناتواں جسم پر ایک بھرپور لات مار کر وہ زور سے چیخا۔
"ذلیل کمینے! سر دور! نکل جا ہمیشہ کے لیے اس گھر سے میں نہیں چاہتا کہ محلے والے مجھے بھکاری کا باپ کہہ کر پکاریں۔ پھر کبھی اپنی منحوس شکل دکھائی تو زندہ دفن کر دوں گا!"
باپ نے پھر ہاتھ اٹھایا تھا کہ اس نے بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اس نے پیچھے بھی مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اور ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ہی دم

دیا گیا جو بظاہر معیبت نظر آتی تھی اب اس کے سامنے کوئی رکاوٹ کوئی قدغن نہیں تھی!

دو مہینے دن پھر وہی دھندہ شروع ہوا اور پہلے سے زور و شور سے شروع ہوا۔ اب ایک کے ناطقے میں دھکے دھکے دالی کوئی طاقت حائل نہیں تھی۔ مگر چند ہی مہینے گذرے تھے کہ قسمت نے ایک اور کاری ضرب لگائی۔ ایک بھاگتی ہوئی بس میں سوار ہونے کی کوشش میں شاید کول کی چکنی سڑک پر وہ ایسا گرا کہ اٹھ نہ سکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چند ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اندھیروں میں گم ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ اس کے حواس پر دھند کی چادر پھیلتی گئی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے اتنا ضرور دیکھا کہ ایک کار تیزی سے اس کی طرف چلی آ رہی ہے۔ اس نے اٹھنے کی آخری کوشش کی اور پھر وہ تاریکیوں سے ہم آغوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو پتہ چلا کہ قسمت اس کو اس جنم کے سارے گناہوں کی پیشگی سزا دے چکی ہے۔ ایک ہاتھ تو پہلے ہی دو میلے کار ہو چکا تھا۔ اب ایک ٹانگ نے بھی اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بظاہر وہ زندہ تھا مگر عمل اعتبار سے اس کی اپاہج زندگی کسی کام کی نہیں تھی۔ وہ تو خود اپنے لئے بھی ایک عبرت کدہ بن چکا تھا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ اس حالت میں بھی زندہ رہنے کی امنگ سے وہ محروم نہیں ہوا ہے۔ اس کے جسم کی عمارت تقریباً نم زمین بوس ہو چکی تھی۔ مگر ٹوٹ پھوٹ کے اس عمل کے باوجود وہ ابھی زندگی سے ہاتھ دھونے کیلئے مطلق تیار نہ تھا۔ اس کے سینے کی راکھ میں ایک چنگاری دبی ہوئی تھی۔ جو اس کے بلند آہنگ ولولے کی تیز ہوا پا کر شعلہ تو نہیں بن سکتی تھی۔ مگر اس چنگاری کی ہلکی حرارت نے اس کو اتنی توانائی ضرور مہیا کی تھی کہ وہ اپنی لنگڑی لولی زندگی کو غیر معینہ عرصے تک برقرار رکھ سکتا تھا۔!! اس عالم میں بھی وہ کارزارِ حیات میں کشاکش روزگار سے نبرد آزما ہونے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔

بہت دنوں تک ہسپتال کی تکلیفیں جھیلنے کے بعد جب وہ باہر کی دنیا میں آیا تو اسے پتہ چلا کہ خدا کا کوئی نیک بندہ خود اس کے پاس آئے تو آئے، وہ بنفس نفیس کسی کے پاس بھیک مانگنے نہیں جا سکتا۔ یہ احساس کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا مگر یہاں بھی اس کی صابر طبیعت نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ ایک تناور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر بندگانِ خدا کی فیاضی کا امتحان لینے لگا۔ پہلے ہی روز جب شام ڈھلنے سے پہلے اس نے اپنے آگے پھیلی ہوئی ریزگاری کے ڈھیر کو دیکھا تو شگفت و حیران ہو کر رہ گیا۔ اتنا کچھ تو اسے آٹھ دس روز کی محنت بسیار۔ ذہانت پیشکاری کے باوجود بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی جسمانی بے بضاعتی اس کے لئے خیر و برکت کا پیغام لائی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ مگر اس کا مستقل اپاہج پن تو اس کے لئے نیک شگون ثابت ہوا تھا۔ اب اسے یقین سا ہونے لگا کہ یہی دائمی معذوری آگے چل کر اس کے لئے منفعت بخش روزگار کا مستقل ذریعہ بن جائے گی۔ اب اس کے جذبات ایک خوش حال گھرانے کے فارغ البال فرد کی طرح آسودہ و مطمئن تھے۔!!

دو تین روز بعد تو اس نے اپنی آواز کو زحمت دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ جب کنواں خود ہی پیاسے کے پاس چل کر آ رہا تھا تو پیاسے کو کنویں کے پاس جانے کی ضرورت کیا تھی؟ بچے جوان، بوڑھے اور مرد و زن اس کو ترحم کی نظروں سے دیکھ کر حسب توفیق کچھ نہ کچھ دے دیتے۔ اس نے نہ صرف اس نئی زندگی سے خاموش سمجھوتہ کر لیا۔ بلکہ اس کی ذہنی بے فکری پر جوبن ٹپکنے لگا تھا!

جب ان حالات میں اس نے زندگی کے کئی برس گذار دیئے تو ایک دن درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا کہ شاید اس کی بے دست و پائی ہی اس کی توانائی اور طاقت کا سرچشمہ ہے۔ وہ خود سے کچھ کر سکنے کا اہل نہ تھا مگر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سر پہ آسمان اٹھا کر کسی بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ سکتا ہے۔ جسم کی عمارت مسمار ہونے کے باوجود اس کی مضبوط بنیاد بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔ زندگی پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھی!

اچانک ایک دن شہری زندگی کا نظام ایسا درہم برہم ہوا کہ اس کے بعد تو جیسے ابتری اور انتشار روزمرہ کے معمولات میں شامل ہو گئے۔ لوگوں کے طور طریقے بدل گئے۔ ان کے طرز عمل میں یکایک تبدیلی آگئی۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی کو غیر یقینی حالات اور نامعلوم اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر سوالیہ نشان چسپاں ہو گیا تھا۔ ان دنوں اخبارات کے صفحے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔ شہر کے اس نئے مزاج کا تجارتی کاروباری مصروفیات پر بھی گہرا اثر تھا۔ بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کی سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ آفسوں میں لوگوں کی حاضریاں کم ہو گئی تھیں۔ بازاروں میں آدھی سے زائد دکانیں بند رہتیں۔ اچانک گاہکوں کی ایک بڑی تعداد

خریداری کے سلسلے میں عدم دلچسپی کا شکار ہو گئی تھی۔ جن چکتی دمکتی دکانوں
کے اندر اور باہر شاپنگ میں مصروف خواتین اپنے حسن کی معجز نمائیوں
کے سبب نوجوانوں کا دل موہ لیتی تھیں۔ اب ان کے تابناک چہروں کی
ملکوتی روشنیوں کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ حد نظر تک پھیلی
ہوئی سنسان سڑکیں ان کے حسن کے گمشدہ نظاروں کو تلاش
کرتے کرتے اونگھنے لگتی تھیں۔

اگر کہیں گہما گہمی نظر آتی تھی تو بس ان چھوٹی چھوٹی دکانوں پر
جہاں ریڈیو کی سہولت گاہکوں کے لئے میسر تھی۔ یا جرائد اور اخبارات
کے اسٹالوں پر جہاں مختلف زبانوں اور مختلف شہروں کے اخبارات
کو اس انداز سے سجایا جاتا تھا کہ ان کی سنسنی خیز سرخیوں کو بآسانی
پڑھا جا سکتا تھا جوں ہی خبرناموں کے خاص بلیٹن کا وقت قریب
آنے لگتا ان دکانوں کے ارد گرد لوگ جمع ہونے لگتے اور بے چینی
کے انداز میں خبروں کا انتظار کرتے۔ یہی صورت حال اخبارات
اور رسائل کے اسٹالوں کی تھی۔ یہاں سے گذرنے والا ہر شخص تقریباً
چند منٹوں کے لئے رک کر شہ سرخیوں کو غور سے پڑھتا
تھا اور پھر کچھ دیر کے لئے نہ معلوم کہاں کھو کر رہ جاتا۔ لوگوں میں خبروں
کی دلچسپی اچانک اس حد تک بڑھ گئی تھی۔ جیسے وہ کسی طوفان کی آمد
کے مقررہ وقت کو معلوم کرنا چاہتے تھے۔!!

حالات بگڑنے کے بعد سے اس نے اس بات کو خاص طور پر
نوٹ کیا تھا کہ مختلف وردیوں میں ملبوس اسلحہ بردار جوان دیو ہیکل
گاڑیوں میں سوار نامعلوم منزلوں کی طرف رواں دواں نظر آتے تھے
کبھی کبھی کئی کئی گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے قافلے کی شکل میں
آہستہ آہستہ روانہ ہوتی تھیں۔ ان کی گھن گرج چنگھاڑیں حساس
آدمی کے سماعتی اور اعصابی نظام کو حد درجہ متاثر کرتیں۔ بڑی دیر
تک سمجھ میں نہ آتا کہ ارد گرد کیا کچھ ہو رہا ہے۔ راستہ چلنے والے فٹ
پاتھ پر کھڑے ہو کر چپ چاپ ان گاڑیوں کی روانگی کے منظر کو دیکھتے
اس وقت ان کے چہرے پر مختلف النوع جذبات اور تاثرات اجاگر
ہو جاتے مگر ان کے لبوں پر مہر سکوت ثبت ہوتا۔ وہ یوں بتوں کی
طرح خاموش رہتے کہ آپس میں گفتگو کرنا بھی انہیں گوارا نہ ہوتا۔ جیسے
کسی پراسرار ان دیکھی طاقت نے ان پر زبان بندی کی قدغن لگا دی ہو۔
مگر ان کے چہروں پر برستے ہوئے رنگوں کی نیم مردہ دھنک ان کے
نہاں خانوں کے راز فشت ازبام کر دیتی۔ ہر ایک شخص دوسرے کے
جذباتی رویوں سے واقف معلوم ہوتا اور اس حوالے سے اس کا [illegible]!
کوئی اپنے دل کی بات میں دوسرے کو شریک کرنے سے گریز کرتا وہ بات
جو درحقیقت سب کی مشترکہ بات تھی۔ مگر نہ جانے کس مصلحت کے
تحت سبھوں نے خاموشی کو ترجیح دی تھی!

کئی دنوں سے وہ بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لے
رہا تھا۔ اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ علاقے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور کیا
کچھ ہونے والا ہے سب کی زندگیاں اس وقت پل صراط کے سفر کی
کڑی آزمائش سے گذر رہی تھیں۔ اس نے بارہا محسوس کیا کہ صورت
حال کی طرح اس کے اندر کا موسم بھی لحظہ بہ لحظہ بدل رہا ہے کبھی آتش
فشانی غصے کے سبب وہ جھنجھلا کر آگ بگولا ہو جاتا۔ مگر قہر درویش برجان
درویش کے مصداق غصے کو پی جانا ہی اس کا مقدر تھا۔ کبھی غم و یاس
کی وجہ سے اس کا دل اندر ہی اندر کسی شکستہ ناؤ کی طرح ڈوبنے لگتا
اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جس خوف سے وہ زندگی بھر نا آشنا رہا تھا۔
اب اس خوف کا احساس اس کے ذہن کی طرح کھنچے اعصاب پر تسلط
جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ علاقے کی ہر جاندار شے
کے گرد نامساعد حقائق کا حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ سب لوگ مجبور
محض ہو کر رہ گئے تھے۔ اور اس حصار کو توڑنا فی الحال کسی کے
بس کی بات دکھائی نہ دیتی تھی۔ اگرچہ سب کچھ اس کی توقعات اور خواہشات
کے برخلاف ہو رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے حوصلوں نے ہتھیار ڈالنے
کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

راتوں کو سارا شہر تاریکی میں ڈوب جاتا۔ اس کے چاروں طرف
اس قدر دبیز اندھیرا ہوتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ وہ آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر اس پاس کی چیزیں تو کیا دیکھتا بس خود کو تلاش کر کے رہ جاتا۔
اس کے سر کے اوپر جب درخت کی شاخیں ہوا سے متحرک ہوتیں۔ تو
ان کی سائیں سائیں کرتی آوازیں اس کو ملہم غیب کا ناقابل فہم پیغام
معلوم ہوتیں۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کے اندر کوئی شے اتھل پتھل کے
عمل کو تیز تر کرنے میں سرگرم ہے۔

ایسے وقت میں شہر کے دور افتادہ حصوں میں اعصابی نظام کا
شیرازہ بکھیرنے والے صور اسرافیل جیسے دھماکوں کی دہشت ناک آوازیں
بلند ہوتیں۔ اس کے ساتھ فضا میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے
لگتے۔ آگ کے تہہ دار لہریے ایک بھیانک منظر پیش کرتے ایسا معلوم ہوتا
جیسے بسیط خلاء کے بعض حصے شب خون کے زیر اثر لہولہان ہو کر رہ گئے

بھلا نہ معلوم یہ شہر کا کون سا حصہ تھا جہاں شعلوں کے وحشیانہ رقص میں مہر جانفزا اور بے جان شے بالتخصیص جل کر بھسم ہو رہی تھی جہنم کا دروازہ کھلنے کے بعد دوبدو سے چیخ و پکار اور شورانگیزی کا سیلاب جلد ہی قریب آتا محسوس ہوتا۔ کچھ دیر بعد لے لگتا کہ اسکے وجود کے اندر بے ہنگم شور و غوغا کافی تیزی سے نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا۔ اس کے آس پاس کسی ذی نفس کا کوئی پتہ نہ ہوتا۔ اگرچہ خوف زدگی اسے چھوڑ کر نہ جاتی مگر اس کے باوجود اس کا نحیف و نزار جسم کافی دیر تک یوں تھر تھراتا جیسے اس کے اندر ہزاروں عزادار مصروف ماتم ہوں۔ اسی دوران مسجدوں سے اذانوں کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ آیات و مناجات کے سلسلے شروع ہو جاتے آگ اور خون میں گھرے لوگوں کی چیخیں آسمان تک کو ہلا کر رکھ دیتیں۔ مگر شاید ان کی مدد کو آنے کوئی تیار نہ ہوتا یا ممکن تھا جن راستوں سے مدد آ سکتی تھی وہ مسدود ہو چکے تھے وہ انتشار کے عالم میں درخت کے نیچے بیٹھا قیامت کے بدلتے ہوئے ڈراؤنے مناظر دیکھا جاتا اور رات تازہ انسانی خون پینے والی ایک خوفناک بلا بن کر صبح تک بلا روک ٹوک پوری آزادی کے ساتھ شکار میں مصروف رہتی۔

وہ پچھلے کئی روز سے یہی کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو نہ تو اسے دیکھنا پسند تھا اور نہ جو دیکھنے کے لائق تھا۔ دھماکوں کی آوازیں، بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے، مدد کو پکارنے والی بے بس انسانی صدائیں پھر تیز رفتار ایمبولینسوں کی ڈوبتی ابھرتی بھیانک چیخیں، سڑک پر کاروں کی شکل میں دیو قامت گاڑیوں کے چلنے کی گڑگڑاہٹیں۔ اکثر اوقات اندھیرے میں اس کے قریب سے بھاری بوٹوں کی تیز آوازیں ابھرتیں اور اس کے ساتھ کچھ لوگوں کی ناقابل فہم باتیں سنائی دیتیں۔ وہ دم سادھے چپ چاپ درخت سے ٹیک لگائے آنے والے کسی ناخوشگوار واقعہ کے لئے خود کو تیار کرنے لگتا مگر پھر بوٹوں کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہو کر معدوم ہو جاتیں وہ پھر اپنے منتشر خیالات کے تانے بانے یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ آخر اس پہاڑ جیسی رات گذارنے کے لئے اُسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوتا!! جدید ہتھیاروں کی مسلسل چنگھاڑیں سنتے سنتے جب صبح ہو جاتی تو وہ دور آسمان پر شعلوں کے ساتھ گہرے سیاہ بادلوں کے ٹکڑوں کو بھی ادھر ادھر لڑکھڑاتے ہوئے دیکھتا۔ اور تب اس کا دل بھی اس آگ کی تپش سے جل بھن کر رہ جاتا!!

حالات بگڑنے کے چند روز بعد اس نے دل پر جبر کر کے اس طویل قامت درخت کو خیرباد کہہ دیا جس کے نیچے اس کی زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ بیت گیا تھا۔ اور جس سے اس کی بہت پرانی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ یہ وہ مخلص ساتھی تھا جو برسوں اس کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ کچھوے کی رفتار سے سرکتے کھسکتے اور خود کو گھسیٹتے ہوئے اس نے سڑک پار کی اور پنواڑی کی دکان کے قریب اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ جگہ نسبتاً زیادہ محفوظ تھی کیوں کر پنواڑی کی دکان کے عقب میں کئی زیر تعمیر مکانات کے اونچے نیچے ڈھانچے باہیں پھیلائے ہوئے کھڑے تھے ان میں سے کسی ایک میں وہ سلامتی اور عافیت کے ساتھ رات گذار سکتا تھا اور یوں اس کی بے سروسامانی کو تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔

دن بھر وہ پنواڑی کی دکان کے ایک کونے میں پڑا رہتا۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے اس کے لئے منفعت بخش تھی یہاں لوگ خبرناموں کے مخصوص اوقات میں جمع ہونے لگتے۔ اور اس دوران اسے بن مانگے ہی بہت کچھ مل جاتا تھا۔ اور پھر مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے جو خبریں نشر ہوتیں تھیں ان کے ذریعہ تازہ ترین حالات سے بھی اس کو آگاہی ہو جاتی تھی۔ مگر یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ پنواڑی بلا جواز اس کی جان کے درپے ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا حالانکہ اس کی وہاں موجودگی پنواڑی کے کسی مالی نقصان کا موجب بھی نہ تھی۔ پنواڑی کے ناروا طرز عمل اور اس کے غصے نے اس کے ذہن میں اپنے باپ کی یاد تازہ کر دی جس کے ظالمانہ سلوک کا تصور کر کے وہ آج بھی کانپ جاتا تھا۔

اچانک اس کے خیالات کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے برسوں کی زندگی کا طویل سفر ذہن کی برق رفتار گاڑی میں بیٹھ کر طے کر لیا تھا۔ اس نے دیکھا پنواڑی کسی خریدار کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ پان کی گلوری بنانے میں مصروف ہے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ گاہک سے مخاطب ہوا۔

"کیا وقت ہوا ہے بابوجی؟"

"پانچ منٹ باقی ہیں بارہ بجنے میں" وہ گھڑی پر نظر ڈالے بغیر ہی تیکھی سے ساتھ بولا۔

اور تب اس کا دل طرح طرح کے متضاد احساسات کی آمیزش

[باقی صفحہ ۲۰ پر دیکھیے]

طرب ضیائی

یوں عشق کیا تجھ سے، کہ سوچا بھی نہیں کچھ
سوچا ہی نہ ہو کچھ بھی، ایسا بھی نہیں کچھ

جو کچھ تھا یہاں میرا تھا، اور تھا بھی نہیں کچھ
آنکھوں میں جو رہتا ہے وہ ہوتا بھی نہیں کچھ

اُس پل میں بہت کچھ ہے، لطافت کے علاوہ
جس پل کی، حقیقت کوئی سمجھا بھی نہیں کچھ

اچھا ہُوا، اِس باب میں، کوشاں نہ ہوئے ہم
آنکھوں میں بجز اشک ٹھہرتا بھی نہیں کچھ

جو مجھ میں ہے میرا، میں اُسے ڈھونڈ رہا ہوں
وہ اپنی خبر لے، کہ جدا اپنا بھی نہیں کچھ

لیلا کھوئی، کیا ہجر کے لمحات سنے، لیلا!
مجنوں جو نہ ہو دشت میں لیلا بھی نہیں کچھ

قیمت نہ چکا پائے گا تو، میرے لہو کی
ہاتھوں میں یہ دنیا ہے، یہ دنیا بھی نہیں کچھ

یوں تو مجھے اک شاخ کا سایہ بھی بہت ہے
اور میرے لیے وسعتِ صحرا بھی نہیں کچھ

کیوں خوف ہے سورج کا؟ کڑی دھوپ میں یارو!
اعصاب ہوں فولاد، تو ہوتا بھی نہیں کچھ

امکان کی سرحد سے قدم آگے بڑھاؤ
اب اور یہاں سے تمہیں ملنا بھی نہیں کچھ

کیا کچھ نہ ملا، حلقۂ یاراں سے طربؔ کو
ہاں لمسِ ملامت سے زیادہ بھی نہیں کچھ

● کسٹکوئی، امروہہ ۲۲۴۲۲۱ (یوپی)

اقبال حیدر

محفلوں کے درمیاں تنہائیوں کے درمیاں
زندگی گذرے گی کب تک واہموں کے درمیاں

کچھ ادھورے رنگ ہیں کچھ نامکمل عکس ہیں
خواب زندہ ہیں شکستہ آئینوں کے درمیاں

دوستی اور دشمنی کے دائرے ہیں مختلف
ہم بھی موجود ہیں ان دائروں کے درمیاں

زندگی کارِ مسلسل ہے تو کٹ ہی جائے گی
چند یادوں کے سہارے وحشتوں کے درمیاں

ہم تو سمجھے تھے کہ ہم آسودۂ منزل ہوئے
اک پڑاؤ آگیا ہے ہجرتوں کے درمیاں

رنجشوں کے سلسلے یونہی سدا بڑھتے نہیں
تیسرا کوئی تو ہے دو بھائیوں کے درمیاں

● ۴۳۶۔ اے سیکٹر: ۲/اے۔ ۱۵۔ نارتھ کراچی، کراچی (پاکستان)

رشید امکان

ہاتھ دوزخ میں ڈال کر دیکھوں
اک رسالہ نکل کر دیکھوں

کونگے بچھی ترے گلے میں آ
اپنی آواز ڈال کر دیکھوں

کل نکل آئیں گے زبان کے پر
آج ہی عرضِ حال کر دیکھوں

اپنا ایماں اک طرف رکھ کے
پتھروں سے سوال کر دیکھوں

اب تو کھلنے لگی ہے گمنامی
اک رسالہ نکال کر دیکھوں

● ۳/۵ توپخانہ روڈ۔ اجین۔ ایم پی۔

انور زاہدی
پوسٹ بکس نمبر-۲۴۲۰-اسلام آباد (پاکستان)

ٹومچ

ایسی کوئی خاص بات نہ تھی لیکن پھر بھی بعض شاموں کی اداسی کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے، بالکل جیسے کچھ بیماریوں میں مریض کو بیماری کے حملے سے پہلے ہی علم ہو جاتا ہے، بس کچھ ایسے ہی (آج شام) کی اداسی بھی رگ و پے میں نشہ بن کر اتری جا رہی تھی۔

ہوٹل کے زیر زمین ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین محفل موسیقی کے شوق میں خشک مضامین کو کہانیوں کی طرح سن رہے تھے۔ میرے پیچھے کچھ دیر بعد مضامین کا دور ختم ہوا اور موسیقی کی نشست کے آغاز کا اعلان ہو گیا۔

میں پچھلی قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اعلان کے ساتھ اچانک ہال میں قلم کے دوران ہو جانے والے افراتفری کا سماں تھا۔ کچھ لوگ باہر جا رہے تھے، ایک دوست نے مجھ سے بھی باہر چلنے کو کہا۔ لیکن جانے کیوں میں نے وہیں بیٹھنے میں عافیت جانی اور تب اس لمحے اسٹیج کے نزدیک مجھے وہ صاحب کھڑے ہوئے نظر آئے وہ شاید منتظمین میں سے کسی شخص سے باتیں کر رہے تھے۔

ایک لمحے کو جیسے میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ وہی دیکھا بھالا وجیہہ چہرہ، بلند قامت شخصیت۔ ان کے بدن کا کسرتی تناؤ اب بھی ان کی اصل عمر کو چھپانے میں ان کا ساتھ دے رہا تھا وہ کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ میں جیسے عالم خواب میں تھا۔

"کیا یہ وہی صاحب ہیں"۔ . . . "کسی نے مجھ سے سوال کیا، میں نے پلٹ کر چاروں طرف دیکھا، اگلی پچھلی قطاروں میں سے بیشتر لوگ باہر جا چکے تھے۔ ہوٹل کی رنگ برنگی کرسیاں میرے دائیں بائیں خالی پڑی تھیں۔

میرے جاننے والے ایک دو افراد دو تین قطاروں کے درمیان گھرے تھے۔ سامنے اسٹیج پر سے کرسیاں میز وغیرہ نیچے لائی جا رہی تھیں، بلکہ موسیقی کا پروگرام شروع کرنے والے بھی اسٹیج پر جا کر بیٹھ چکے تھے ہال میں سگریٹ کا دھواں پھیل رہا تھا اور ایرانی عود کی خوشبو سانس میں اتری جا رہی تھی۔

اداسی کے بادل چھٹ رہے تھے وہ خالدی کے ہمراہ ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا، یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ خالدی میرا برادر نسبتی تھا۔ خود پائلٹ آفیسر ہونے کے ناتے ان دنوں میانوالی میں تعینات تھا۔ کسی بھی چھٹی یا ویک اینڈ پر وہ گھر آتا تو مجھے یوں لگتا جیسے میں پھر کالج میں داخل ہو گیا ہوں۔ اور وہ یعنی شکیل خالدی کا ساتھی ہوا باز تھا۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ شکیل کا گھر بھی ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ یوں جب بھی شکیل ویک اینڈ پر اپنی گاڑی میں آتا تو خالدی بھی اس کے ہمراہ آ جاتا۔ اور ان نوجوانوں کی صحبت میں گپیں لگاتے، چائے پیتے یا فلم دیکھتے ہوئے گرمیوں کے دن سہانے لگتے اور سردیوں کے دنوں سے ٹھنڈ غائب ہو جاتی۔

شکیل خالدی کا ساتھی ہونے کے باوجود اپنے چہرے مہرے سے خالدی سے کم عمر لگتا تھا بلکہ اسے دیکھ کر کبھی کبھی تو حیرت ہوتی کہ یہ لڑکا ہوائی جہاز بھی چلا سکتا ہے۔ اس سے باتیں کرنے کے دوران ہمیشہ توانائی اور حرکت کا ایک عجیب احساس رہتا۔ باتیں کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھا ہوا نہیں بول رہا بلکہ اپنے جہاز کے کاک پٹ میں سے ہم سے محو گفتگو ہے۔ وہ باتیں کئے جاتا اور ایسا لگتا جیسے اس کا جہاز کرتب دکھا رہا ہو، کبھی کبھی باتوں کے درمیان اپنے چہرے اور ہاتھوں کے ایسے ملے جلے تاثرات دیتا کہ معلوم ہوتا جیسے ڈاگ فائٹ میں مشغول ہے اور پھر اچانک کوئی قصہ سناتے ہوئے وہ کسی بات پر قہقہہ لگا کر ٹومچ TOO MUCH کہتے ہوئے بریک لگا دیتا اور سب سننے والوں کو احساس دلاتا کہ واقعی بہت بڑی زیادتی ہو گئی ہے۔ ہم سب اکثر اسی کیفیت سے دوچار ہونے کو کوئی کھیلا ہو گیا ہے۔

اور وہ پھر گفتگو میں پینترا بدل کر مجھ سے مخاطب ہو جاتا "بھائی ۔۔۔ یہ ڈرائیونگ میں بعض لوگ بھلا اس قدر سست رفتار کیوں ہوتے ہیں؟ لگتا ہے جیسے سڑک پر ٹہل رہے ہیں"

"بھئی شکیل! اب ہر ایک کی گاڑی کا ماڈل اور رفتار تمہاری گاڑی جیسا تو

ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہو پاتی، کہ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بات کو "ٹوبیچ" کہہ کر کاٹ دیتا۔

شکیل کی شخصیت میں ایک عجب نکھار، منفرد بانکپن اور دلفریب سحر تھا وہ اپنے مخاطب کو چاہے وہ اس عمر میں بڑا ہوتا یا کوئی ننھا منا بچہ ایک پل میں متاثر کر لیتا تھا، یعنی جہاں کہیں اس سے ملکر خوش وقت ہوتا، وہاں میرا چھوٹا بچہ اسے دیکھ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتا اور شور مچانے لگتا۔

"شکیل انکل آگئے، شکیل انکل آگئے"

اور شکیل میرے بچے کو گود میں اٹھائے اپنی عادت کے مطابق ڈھیروں بار "ٹوبیچ" کی گردان کر رہا ہوتا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ خالدی اگر کسی ویک اینڈ پر تنہا آیا تو میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس بار شکیل اس کے ساتھ کیوں نہیں آیا، اور خالد ہمیشہ کی طرح ہنستے ہوئے انداز میں یہ کہہ دیتا کہ یا تو وہ معروف تھا یا اسے اور کہیں جانا تھا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خود خالدی بھی اس کی غیر موجودگی میں اسی کے قصے سنا رہا ہوتا۔ ان قصوں میں اکیڈمی کی ٹریننگ کے وقت سے لے کر پائلٹ بن جانے کے بعد تک کے بے شمار واقعات شامل ہوتے۔

مجھے یاد ہے ایک بار خود شکیل نے ریلوے ریزرویشن کے سلسلے میں ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ایکبار وہ کسی وجہ سے اپنا فارم بھر کر والد کے ہاتھ بھجوانے کے بجائے خود ہی اپنا ٹکٹ لینے اسٹیشن پہنچا تو ٹکٹ ونڈو پر موجود کلرک نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔

"برخوردار اپنے والد کو بھیج دیں، یہاں فارم پر ایک جگہ ان کے دستخط رہ گئے ہیں وہ انہیں کرنے ہونگے"

وہ یہ سب سناتے ہوئے ہنسے جا رہا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا کہ جب میں نے کلرک سے پوچھا کہ کس کے والد کو آنا ہوگا تو اس نے فارم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا "کیا یہ فارم آپکے والد کا نہیں ہے"

اور اس پر بقول شکیل اس نے مسکراتے ہوئے فارم پر بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کر کے ٹکٹ تو وصول کر لیا تھا لیکن اب ٹکٹ دینے والا نہ صرف پریشان تھا بلکہ مجسم حیرت بنا شکیل کو دیکھے جا رہا تھا۔

اسی طرح ایک بار خالدی نے ایر فورس کے کسی بار بردار جہاز کے سفر کا قصہ سناتے ہوئے بتایا تھا کہ سفر کرنے والوں میں جہاں بہت سے افسران اور انکی بیگمات شامل تھیں۔ وہیں ان میں شکیل بھی موجود تھا۔ جس کو دیکھ کر وہاں بیٹھی ہوئی ایک بھاری بھرکم خاتون نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی دوسری خاتون سے شکیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہ کس افسر کا بیٹا ہے؟ اور اس جملے کو سن کر بقول شکیل وہ "ٹوبیچ" کہہ کے رہ گیا تھا لیکن جب کچھ دیر بعد جہاز پر سوار ہونے والوں میں اس کا نام پکارا گیا اور وہ چلنے کے لئے اٹھا تو وہ خاتون اسے دیکھ کر بوکھلا گئی تھیں اور شکیل پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

وہ جب بھی اس قسم کے واقعات سناتا، میں ہمیشہ اس کی شکل کو دیکھ جاتا کیونکہ وہ واقعی اپنے چہرے سے اس قدر معصوم اور کم عمر لگتا تھا کہ اسے دیکھنے والے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ یہی گمان ہو سکتا تھا کہ برخوردار میٹرک پاس کرکے نئے نئے کالج میں پہنچے ہیں۔ اسی پر بس نہیں، خالدی کے ہمراہ جب وہ اپنے فلائنگ کی داستانیں ہنس ہنس کر بیان کرتا تو میں حیرانی سے اُسے تکے جاتا کہ اتنا کم عمر لڑکا فلائٹ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے کیونکہ میرے لئے تو اس کا جہاز اڑا لینا ہی کچھ کم باعث حیرت نہ تھا۔

اچانک جلے پر ابھرتی ہوئی گت اور ہارمونیم کے ہمراہ سارنگی اور ستار کے سُروں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ——— تمام محفل پر وجد کی کیفیت طاری تھی کلام فیض وہ بھی اقبال بانو کی آواز میں ——— سامعین گویا سحر کی حالت میں تھے اور میں وہ صبح یاد کر رہا تھا جب علاقے کی مسجد سے مائیک پر ہونے والے ایک اچانک اعلان نے مجھے گم سُم کر کے رکھ دیا۔ اعلان کرنے والے کی گونجتی ہوئی آواز پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں باتھ روم سے نکل کر صحن میں آیا اور وہاں سے دیوانہ وار سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر چڑھ گیا تھا۔ مجھے یوں پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے دیکھ کر گھر میں موجود سب لوگ کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ میرے کان دھوکہ نہیں کھا رہے تھے ——— فضا میں منتشر آواز کی لہریں اعلان کر رہی تھیں۔

"پائیلٹ آفیسر شکیل ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے ہیں"

مائیک پر بار بار اس کی نماز جنازہ کے وقت کا [illegible] سنا ہو رہا تھا مجھے رہ رہ کر اسکا بچوں جیسا معصوم چہرہ یاد آرہا تھا۔

کم بخت مرنے میں بھی اس قدر تیزی دکھا گیا۔ اتنی کم عمری میں ایک باکمال پائیلٹ بن جانا ہی کیا کم تھا کہ وہ ایک ہی جست میں زندگی کے چمنستان سے موت کی بھیانک وادی میں چھلانگ لگا گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے چاہنے والوں کو بھونچکا کر دیا تھا۔ اسے تو صحیح معنوں میں مرحوم کہتے ہوئے بھی قلق ہوتا تھا ———

شکیل کے گھر میں قیامت کا عالم تھا ——— وہاں موجود کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ جوان مرگ شکیل کے والد کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ ایک ریٹائرڈ سول سرونٹ ہونے کے ساتھ ساتھ دہری

سے بھی شغف رکھتے تھے۔ رو دستے ہوئے کبھی افسوس و وقار کو قائم رکھتے ہوئے خود کو سنبھالتے اور شاعر ہونے کے ناتے سب بھول جانے اور بین کرتے ہوئے باپ کی حیثیت میں بالکل بکھر کر رہ جاتے۔

وہ بیمار تھے۔ اس کی ماں ہمیشہ ڈرا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی شکیل بہت تیز کار چلاتا ہے۔ "میں ہمیشہ اس کی یہ بات سن کر ہنستا اور بات کو ٹال دیتا تھا۔

"آخر میں کیوں اس کی ماں کی بات کو ہنس کر ٹال دیتا تھا؟"

جیسے وہ کسی سے مخاطب ہو کر پوچھتے اور پھر یوں خاموش ہو جاتے جیسے کسی غیبی آواز نے ان کے کان میں کہہ دیا ہو کہ شکیل کی موت کار ڈرائیونگ میں نہیں ہوگی۔

تیسرے دن خالدی بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ پرسے کے لئے آیا تھا، ہم سب ایک بار پھر ان کے یہاں گئے۔ سب اظہار تعزیت کر رہے تھے۔ میں بار بار ادھر اُدھر دیکھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے شکیل اک دم کسی دروازے سے پردہ اٹھا کر کمرہ میں مسکراتا ہوا آ جائیگا۔ اور قہقہہ لگا کر "لو بھئی۔ یار" کہہ دے گا

سب رونا دھونا بھول جائیں گے۔ لیکن یہ شاید اس سے میرے جذباتی لگاؤ کا نتیجہ تھا یا پھر اس کی مقناطیسی شخصیت کا اثر ——

اور واقعی اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اس کی شخصیت میں بے حد مقناطیسیت تھی۔ تبھی تو وہ اپنے ہر ملنے والے کو چند ہی لمحوں میں اپنا گرویدہ کر لیتا تھا

یہی نہیں کار چلاتا تو راستوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ جہاز اڑاتا تو کبھی آسمان کو اپنی سمت بلاتا۔ کبھی زمین کو اپنی کشش میں لے لیتا اور بالآخر کشش کی اسی گردش میں ایک دن اس نے زمین کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

آج کئی سال کے بعد اس شہر کے ہوٹل میں منعقدہ محفل موسیقی میں شکیل کے والد کو دیکھ کر بیتے ہوئے بہت سے دن ایک ایک کر کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ شکیل کی موت کے بعد گھر ہی نہیں شہر بھی چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ آج مدتوں بعد اس اجنبی شہر میں انہیں دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اٹھ کر ان تک جا پہنچا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹھکے۔ جب میں نے انہیں اپنے شہر کا حوالہ دے کر یاد کرایا تو جیسے ان کی شخصیت کا سارا سبھاؤ اک دم صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"ہاں... وہ..... تو......." اور وہ بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکائے ہوئے اگلی نشستوں کی طرف جا کر کہیں یوں بیٹھے کہ پھر مجھے نظر نہ آئے —— شاید وہ سوچتے ہوں کہ میں انہیں محفل موسیقی میں دیکھ کر کیا خیال کروں گا، لیکن میں تو کہیں اور پہنچا ہوا تھا —— اقبال بانو نغمہ سرا تھیں۔ کلام فیض کے خوبصورت بول "

"دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں تری یادوں کے چراغ"

دھنوں کے دوش پر فضا میں بکھر رہے تھے اور مجھ پر اس لمحے شام کی اداسی کے اسرار کھل رہے تھے ——

○ آپ کی مدت خریداری جنوری ۹۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔

اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری دسمبر ۹۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ نئے سال [فروری ۹۶ء تا جنوری ۹۷ء] کے لئے اپنا زر تعاون ارسال کر کے ممنون کیجئے۔

آپ کی طرف شاعر کے بقایاجات

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا زر سالانہ ... کے شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ ازراہ شاعر نوازی اپنے بقایاجات اور خاص نمبر [جلد اول] کی رعایتی قیمت جلد از جلد ارسال کیجئے۔

شاہین مفتی

رابطوں کی دنیا میں

رابطوں کی دنیا میں
لفظ ہی وہ رستہ ہے
جس پہ لوگ چلتے ہیں
حرف اور معنی کی
ریشمی طنابوں پر
ہاتھ جب پھسلتے ہیں
ہاتھ چھوٹ جاتا ہے
دور جا نکلتے ہیں

اجنبی جزیروں کے
بے یقین لوگوں میں
عمر بیت جاتی ہے
حرف اور معنی کے
رشتہ ہائے پیہم کا
کچھ سرا نہیں ملتا
لوٹنا بھی چاہیں تو
واستہ نہیں ملتا

● ابن امیر گورنمنٹ گرلس کالج، جلال پور جٹاں، ضلع گجرات (پاکستان)

نسیم انصاری

تشویش

ذہن جنگل کی طرح جب ہو پراگندہ
گرد احساس پہ جم جائے ہر اک جذبۂ دل
تھک کے سو جائے تصور کے نہاں خانوں میں
خواب آنکھوں کے دریچوں سے بھی کترانے لگیں
دوست احباب بھی جب ملنے سے شرمانے لگیں
دھول اڑنے لگے رشتوں کی گذرگاہوں پر
روز و شب سست قدم لنگڑے سپاہی کی طرح
زندگی حاملہ عورت کی طرح محو خرام
آرزو کوئی نہ ہو کچھ بھی جب اچھا نہ لگے
دشت تنہائی میں جب کوئی بھی اپنا نہ لگے

اجنبی کوئی اگر، لطف و عنایات کرے
خیریت پوچھے، ملے اور یونہی بات کرے
دل کو بہلانے لگے سعیٔ ملاقات کرے
کتنے انجان سے خدشوں کا گماں ہوتا ہے
بے سبب کوئی ملے ایسا کہاں ہوتا ہے

● ۱۵/ا ہاؤسنگ، کوہ فزا۔ بھوپال ـ ۱

رفیق اعظم

سرخ سمندر

شیطانوں کا عروج
بمبئی کا رخ
گلیوں کی کراہ
شاہراہوں کی چیخ
عمارتوں کا کرب
ڈیٹول کی شیشی ایکسپائر

نوچے ہوئے ورق
نئی کتابوں کا الم
رات کی سیاہی
سفید کاغذ کا غم

جیب کی آہ
ٹوٹے ہوئے نوٹ
کنگھی کے پاس
سر صاف

خونریز موسم کی خوشی
ہرا شجر بے لاگ
پانی کا قتل
سرخ سمندر

● نزد اندرا انگلش اسکول، محلہ رتن پورہ ادھباٹولی
چھپرہ (بہار)

سعید انجم
NEBBEJORDET 45, 1266 OSLO-12
NORWAY

جھوٹ سچ

ٹیلی ویژن پر آنے والے پروگراموں کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں جب اسکرین پر بار برو نظر آئی۔ وہ "ٹوٹے ہوئے رشتے" نامی پروگرام میں آ رہی تھی۔ طویل عرصے سے روٹھے ہوئے لوگوں کو اس پروگرام میں بلایا جاتا۔ کئی کئی سال کی ناراضگی کے بعد ٹی وی کے مہمان ناظرین کے سامنے کیمروں کی روشنی میں ایک دوسرے سے ملتے اور اپنے گلے شکوے دور کرتے۔ حقیقی زندگی کے یہ جذباتی خاکے عورتوں میں خاص طور پر مقبول تھے۔

"میں تو یہ پروگرام دیکھوں گی۔" میری بیوی نے کہا۔

"بسم اللہ! ..." کہتے ہوئے میں اپنی اسٹڈی میں پہنچ گیا۔

بار برو کو دیکھتے ہی مجھے نارویجن ہفت روزہ "خواب و خیال" کی وہ کہانی یاد آ گئی جو سچی کہانیوں کے ذیل میں شائع ہوئی تھی۔ اپنی کہانی سنانے کے لئے بار برو نے معلوم نہیں 1995 کیوں منتخب کیا تھا۔ وہ رسالہ مجھے فوراً ہی مل گیا۔ راوی کا کہنا تھا:

میں شمالی علاقے سے آئی ہوں۔ پہاڑوں کی بیٹی۔ میرا باپ ایک کسان ہے۔ دھرتی کا بیٹا اسے زمین سے محبت ہے۔ کاشت کاری کو وہ اپنا اظہارِ محبت کہا کرتا۔ میرا باپ میرا آئیڈیل تھا اور فصل میری سہیلی۔ چشمے میرے ساتھی اور پہاڑ میرے دوست وہاں بلند چوٹیوں کے دامن میں میرے باپ کے کھیت لہلہاتے تو وہ مجھے چومتا۔ میں بھی اپنے باپ کو پیار کرتی۔

میں اسکول بھی جاتی تھی۔ نارویجن لازمی اسکول کی تمام کلاسیں ختم ہونے تک میں وہاں جاتی رہی۔ آگے پڑھنے کے لئے مجھے شہر جانا تھا۔ میں نے اوسلو کے بارے میں سوچا جب اپنے باپ کو میں نے اپنا خیال بتایا تو وہ بولا: "اوسلو ایک بڑا شہر ہے۔" اور وہ اداس ہو گیا۔

میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے پوچھا "پاپا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے نہیں۔ تمہیں کچھ ہوا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم جوان ہو گئی ہو۔ تم شہر جاؤ گی۔ وہاں پر پہلے تم کسی سے پیار کرو گی اور پھر اس کے ساتھ بیاہ۔ شہر میں کسان نہیں رہتے۔ شہر کے لڑکوں کو کھیتوں میں کام کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں دھرتی کا بیٹا ہوں اور تم میری بیٹی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی کسان سے شادی کرو۔ وہ زمین سے پیار کرے۔ تاکہ فصل تمہاری سہیلی رہے۔"

میں نے کہا، "میں پڑھنے جا رہی ہوں۔ پیار کرنے نہیں۔ چشمے میرے ساتھی ہیں اور پہاڑ میرے دوست۔"

میرے باپ نے سر جھکا لیا اور بولا "ٹھیک ہے! ... تم چلی جاؤ مگر ہو گا وہی جو میں نے کہا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے اسے الوداع کہا اور یہ سوچتے ہوئے اوسلو چلی آئی کہ میرا باپ بوڑھا ہونے کو ہے۔ بڑھاپے کے خوف اس پر طاری ہیں۔

میں اوسلو میں رہنے لگی تو مجھے ایک لڑکے سے پیار ہو گیا مجھے شادی کا خیال آیا تو میں نے اپنے باپ کو لکھا۔ اس کا جوابی خط ایک سطری سوال کی صورت میں تھا: "کیا وہ کسان ہے؟" لڑکا کسان نہیں تھا۔ میں اس سے الگ ہو گئی۔

پھر مجھے ایک اور لڑکے سے پیار ہو گیا۔ وہ بھی مجھ سے سچ سچ کی محبت کرنے لگا۔ ہم اکٹھے رہنے لگے۔ اسے پہاڑ پسند تھے اسے چشموں کا پانی میٹھا لگتا تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ کاشتکاری کرے۔ میں نے اپنے باپ کو لکھا۔ اس کا ایک سطری جواب آیا:

"وہ ڑکا جھوٹ بولتا ہے۔"

میرے باپ کا اندازہ شاید ٹھیک تھا۔ وہ کسان کی اولاد ہوتا یا کاشتکاری کا اسے شوق ہوتا تو میرے باپ کی بات کا وہ اتنا برا نہیں مانتا کہ بغیر اطلاع دیئے ہی غائب ہو جاتا۔ میں پھر تنہا رہ گئی۔

تب مجھے وہ ملا جو کسان تھا۔ جس کے کھیت پہاڑوں کے دامن میں تھے۔ چشمے اس کے ساتھی تھے اور پہاڑ اس کے دوست میں خوشی کے مارے جھوم گئی۔ وہ مجھے چومتے ہوئے کہتا "بوائی کے لئے زمین کو تیار کرنا میں جانتا ہوں۔" اس کے ہاتھ مضبوط تھے اور چھاتی چوڑی۔ فصلیں کاٹ کاٹ کر اس کا رنگ سنولا یا ہوا تھا میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔

چھٹیوں میں ہم شمالی علاقے میں گئے۔ پہاڑوں کے دامن میں چشموں کے پاس۔ جہاں فصل میری سہیلی تھی۔ کھیت وہاں لہلہا رہے تھے جن کے بیچوں بیچ میرا باپ کھڑا تھا۔ میں اس کی طرف بھاگی۔ میں چاہتی تھی کہ اسے پیار کروں اور میرا باپ مجھے چومے اس نے مجھے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ میں تو شاید نہ ہی رکتی لیکن میرے باپ کی زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیئے۔ میں ایک اسٹوپین کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ میرا باپ کہہ رہا تھا: "یہ تو میں نے ضرور چاہا تھا کہ تم ایک کسان سے شادی کرو لیکن میرا مطلب ہرگز نہیں تھا کہ تمہارے خاوند کے کھیت کوہ ہمالیہ کے دامن میں ہوں۔"

اپنے باپ کے نسلی تعصب کو باربرد نے اچھے لفظوں میں چھپا لیا تھا۔

میں رسالہ لیئے ڈرائینگ روم میں پہنچا تو ٹی وی پروگرام "ٹوٹے ہوئے رشتے" اپنے اختتام تک پہنچا ہوا تھا۔ باربرد اپنے باپ سے مل رہی تھی۔ دونوں کے سامنے ہال میں بیٹھے ہوئے ناظرین تالیاں بجا رہے تھے اور میری بیوی اپنی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

"تم نے ایک اچھا پروگرام چھوڑ دیا۔" وہ بولی

"شاید؟" میں نے کہا "... لیکن باربرد کی کہانی سے میں واقف ہوں۔

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"اس رسالے میں شائع ہوئی ہے" میں نے "خواب خیال" کا پرچہ میز پر رکھا۔

"اچھا!" وہ بولی۔ "... لیکن پروگرام میں ایک کمی رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا؟؟" میں نے پوچھا

"ٹی وی والوں نے اس کسان کو نہیں بلایا جس کے کھیت کوہ ہمالیہ کے دامن میں تھے۔"

میری بیوی نے بتایا

"کیسے بلاتے؟ باربرد کی اس کسان سے علیحدگی ہو گئی تھی؟"

"ارے! یہ تو پروگرام میں انہوں نے بتایا ہی نہیں۔" میری بیوی بولی۔ "لیکن ان میں علیحدگی کیوں ہو گئی؟"

"اس لیئے کہ باربرد کا خاوند کسان نہیں تھا۔" میں نے بتایا

"تو کیا اس نے جھوٹ بولا تھا؟" اس نے پوچھا

"ہاں!" میں نے جواب دیا

"کیوں؟" وہ حیران تھی

"کسی کے جھوٹ سچ کی وجہ میں کیا جانوں۔" میں نے وضاحت کی۔

اب میں اپنی بیوی کو کیا بتاتا۔ کہ جھوٹ میں نے کیوں بولا تھا۔ ❁

عطا جالندھری

یہ کس کا غم نوید زندگی دینے لگا ہے
مرے اندر کا سورج روشنی دینے لگا ہے

کبھی بھیگی نہ تھیں یہ زندگی کے حادثوں پر
نہ جانے کون پلکوں کو نمی دینے لگا ہے

ادا کیسے کروں میں شکریہ اُس مہرباں کا
مرے نغموں کو جو برجستگی دینے لگا ہے

بظاہر پیار کے لہجے میں کتنی تلخیاں ہیں
مرے دل کو وہ کیسی بے رخی دینے لگا ہے

عجب کیا جو مری پرواز اب افلاک میں ہو
وہ میرے بال و پر کو تازگی دینے لگا ہے

مری فسکر و نظر کو روشنی جس نے عطا کی
وہی مجھ کو شعورِ شاعری دینے لگا ہے

زاہد سعید زاہد

معتبر سمجھا تھا اس نے ریت پر لکھا ہوا
آنکھ سے اس بار بھی پہچان میں دھوکا ہوا

مسخ کر دیتی ہے چہرے کو ضرورت کی تپش
جب بھی دریا پیاس میں تڑپا تو وہ صحرا ہوا

کام جب ٹھہرا پرندے کا خلاؤں میں سفر
یہ بُرا لگتا ہے مجھ کو شاخ پہ بیٹھا ہوا

جب سفر پر چل ہی نکلے ہیں تو پھر کیا سوچنا
کون سی منزل کی جانب کون سا رستا ہوا

وقت نے دریا صفت انساں کبھی چھوڑے نہیں
اور میں تو جھیل کی مانند ہوں ٹھہرا ہوا

سنگ تو شیشے کے گھر پر آخرش گرنے ہی تھے
اب تعجب کس کا آخر جو کبھی ہونا تھا، ہوا

راشد فضلی

کتنی یادوں کا پیکر لیے نام ہیں جو کھدے ہیں شجر تا شجر دور تک
اک کہانی ہے اک نام کتنا رہا جب کیا جنگلوں کا سفر دور تک

اس کڑی دھوپ میں ہم سفر کون ہے میرا سایہ ہے یا خواب ہے ساتھ کا
لمحہ لمحہ مرے جذبات کی آنچ سا ساتھ چلتا ہے کس کو مگر دور تک

سرمئی شام تھی اک تری یاد کی جس میں بادل کھلا بارش ہوا دھوپ کی
مرے جذبات میں جو دھنک رنگ تھا اُس کا پھیلا ہوا تھا اثر دور تک

وہ گلی جس میں ہم بھی کبھی ساتھ تھے اب تو خوابوں کی دہلیز پر رہ گئی
میرے شانے کا ہجرت لیے بوسہ لیا، ساتھ پھر کیوں رہا اپنا گھر دور تک

ہر قدم اٹھتی خواہشوں کا سفر آنکھوں میں حیرتوں کا وہی سلسلہ
یوں تو مشکل تھی راہِ طلب لیت کی لے گئی مجھ کو میری نظر دور تک

میرے اندر کے سارے حسیں رنگ تو تیرے چہرے کے پھولوں کی زینت بنے
اب تو موسم کی رعنائیوں میں تری، اپنا بکھرا ہوا ہے ہنر دور تک

افتخار قیصر

سوال بن کے ملا کرو، جواب بن کے ملا کرو
مہ طلب آ سر سے اب میں بے خواب بن کے ملا کرو

اسے شام کو مرے دوستو! عذاب بن کے ملا کرو
مجھے میکدے میں ملو اگر تو شراب بن کے ملا کرو

مجھے اپنے لوگ بہت ملے، میں تو ان کا قرض سے ہو گیا
اسے ہو سکے تو کبھی کبھی تو خراب بن کے ملا کرو

ابھی سوچتا ہے تو سوچ، ابھی چاہتا ہے تو چھوڑ دو
نئے موسموں میں یہ مجھے آفتاب بن کے ملا کرو

شفیق سلیمی

کبھی منزل کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے

ہمارے درد کی اوقات ہی کیا ہے زمانے میں
کسی کے ہاتھ کا لکھا کوئی کیسے بدلتا ہے

کہانی کے سبھی کردار ہیں سب موم کے پتلے
کوئی کیسے بدل دے گا، کوئی کیسے بدلتا ہے

خس و خاشاک کی صورت جو لے جائیں اُڑا کر بھی
بھلا رُخ اُن ہواؤں کا کوئی کیسے بدلتا ہے

یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اُس نے دکھلایا، کوئی کیسے بدلتا ہے

عابد ودود

زباں پہ آیا ہوا مدعا نہ کہنے دے
مرے خدا تو مجھے مانگنے سے پہلے دے

تہی دست و بازو مشینوں کی نذر کر آیا
وہ میرے ہاتھ میں اب اپنا ہاتھ کیسے دے

مری غریبی مری عمر بھر رفیق رہی
کہاں سے دوست کہاں جیب بھر کے پیسے دے

شمولیت نہیں کرنی تجھے رفاقت میں
تو پھر خلوص کا اظہار کیسا رہنے دے

سفر طویل بھی دشوار بھی ہے اور تجھے
میں ساتھ لے کے چلوں مجھ کو بھی چلنے دے

یعقوب تصوّر

کیسے کیسے صدمے جھیلے بال اور پر کے آتے آتے
سبز زمینیں معدوم ہوئیں پرواز ہنر کے آتے آتے

پتھر اپنے تن پہ اوڑھے گھوما چورا جسم سمیٹا
ملکِ استبداد سے چل کر اس نگر کے آتے آتے

تشنہ لبوں تک پانی کی ترسیل کے سارے وعدے ٹوٹے
اس نے شانے تک کٹوائے چھاگل بھر کے آتے آتے

رُخ بدلا ناؤ کا اور نہ پانی ہی میں کود سکا وہ
اک تدبیر بھی کام نہ آئی پاس بھنور کے آتے آتے

خاک سنہرے خواب تصوّر کیا تخمینہ کر دل جب
محرومِ احساس ہوا تعبیر گہر کے آتے آتے

نسیم سیّد

کہیں میں بھی کرچی نہ ہو کر بکھر جاؤں میرے دل سے یوں نہ خطاب کر
مجھے زندگی کی دُعا نہ دے، میری عادتیں نہ خراب کر

میری ذات بھی تیرے ساتھ ہیں تو کھلی فضاؤں کا فائدہ
میرے پاس بھی ہیں سوال کچھ، تو بیا تو یوم حساب کر

تری سبز آنکھوں کی جھیل میں مری ڈوبنے کو ہے زندگی
کبھی ڈوبتے کو بچا کبھی، کبھی کوئی کارِ ثواب کر

کوئی فلسفہ نہیں عشق کا، جہاں دل جھکے وہیں سر جھکا
وہیں زانو موڑ کے بیٹھ جا، نہ کوئی سوال و جواب کر

ترا مشغلہ بھی عجیب ہے کہ کبھی ہے جب کوئی داستاں
تو ادھوری چھوڑ کے اُٹھ گیا، کبھی پوری کوئی کتاب کر

ریحانہ روحی

حلقۂ دید کو جتنے بھی ہنر آتے ہیں
اتنے ہی اشک مری آنکھ میں بھر آتے ہیں

گھر تو کب کا مرا تبدیل ہوا زنداں میں
پھر بھی کچھ خواب ہیں، آنکھوں میں اُتر آتے ہیں

دن گزر جاتا ہے مقتل میں خموشی اوڑھے
شب ڈھلے صحن میں آسیب اُتر آتے ہیں

روز دو نفل میں شکرانہ ادا کرتی ہوں
بچے اسکول سے جب لوٹ کے گھر آتے ہیں

جب بھی لکھتی ہوں میں حالات کا نوحہ روحی
دل کے کاغذ پہ دُکھے لفظ اُبھر آتے ہیں

خواجہ رحمت اللہ جری

دل کے زخموں سے ہوئی بات سحر ہونے تک
ہم پہ آئی نہ کوئی رات سحر ہونے تک

کوئی خورشید اندھیروں سے ہی نکلے گا ضرور
نہیں بدلیں گے یہ حالات، سحر ہونے تک

بے خیالی میں اندھیروں سے نہ ٹکرا جائے
رہے ہاتھوں میں کوئی ہاتھ سحر ہونے تک

روشنی کی میں علامت ہوں مجھے شب میں نہ ڈھونڈو
مجھ سے مشکل ہے ملاقات، سحر ہونے تک

میں تو سو جاؤں گا دُنیا کو جگا کر اے جری
کوئی تو دے گا مرا ساتھ، سحر ہونے تک

عبدالرحمٰن عبد

عہد نظریہ بلا کے ہوتے ہیں
کچھ تقاضے وفا کے ہوتے ہیں

بجلیاں پوچھ کر نہیں گرتیں
حادثے کب بتا کے ہوتے ہیں

ٹمٹماتے دیئے بھڑک اُٹھیں
یوں بھی جھونکے ہوا کے ہوتے ہیں

بات طے ہے، وفا کی راہوں میں
معرکے کربلا کے ہوتے ہیں

زخم دل کے نظر نہیں آتے
بے صدا بھی دھماکے ہوتے ہیں

عار، سننے میں کچھ نہیں، لیکن
مسئلے کچھ اَنا کے ہوتے ہیں

عبدؔ تم کو بھی مل گئی منزل
فیض بے شک دُعا کے ہوتے ہیں

سعدیہ روشن صدّیقی

گہرے پانیوں میں اب رمزیت نہیں ملتی
بے مثال شہروں میں عینیت نہیں ملتی

جشن ہو کہ میلہ ہو یا ملن کی بیلا ہو
دوستوں کے ہونٹوں پر تہنیت نہیں ملتی

مشرقی زمینوں پر اُگنے والے پودوں کو
مغربی ممالک کی شہریت نہیں ملتی

ہم نے حشر دیکھا ہے کوہسارِ عظمت کا
قد تو اس کا اونچا ہے شخصیت نہیں ملتی

اجنبی دیاروں میں دل ہی اپنا ساتھی تھا
مدّتوں سے اس کی بھی خیریت نہیں ملتی

خواب کے جزیروں پر سبز سرزمینوں پر
شعر ہم بھی کہتے ہیں شعریت نہیں ملتی

ڈگریاں تو لکھتی ہیں نام نام کے آگے
نام کو بڑھانے کی اہلیت نہیں ملتی

کوئی مختصر رستہ، کوئی درس فارسی کا
کار کردگی سے تو حیثیت نہیں ملتی

بارہا یہ سوچا ہے ہم نے یہ اکیلے میں
مل گئے ہیں قسمت سے ذہنیت نہیں ملتی

علی مینائی

ایک دیوانہ یہ کل کہتا تھا بازار کے بیچ
سر سلامت نہ بچے گا کوئی دستار کے بیچ

شاخِ گل ملکیت زاغ و زغن ٹھہری ہے
آج بلبل کا ٹھکانا نہیں گلزار کے بیچ

ہرزہ گویانِ صداقت کو خبردار کرو
مشورہ دیر سے ہے کچھ رسن و دار کے بیچ

میری سچائی کا غمّاز یہی ہو شاید
ہے خموشی کا جو دھارا مری گفتار کے بیچ

کارِ بے مصرف رہا سلسلۂ شام و سحر
اور زمانے ہوئے غارت اسی تکرار کے بیچ

اک بگولا نگراں ہے مرے در کی جانب
اک کھنڈر جاگ رہا ہے مری دیوار کے بیچ

خود سے روپوش ہوئے اس کو بھلانے میں اور اب
کوئی چہرہ نہیں آئینۂ پندار کے بیچ

بتقاضائے ملاقات، بعنوانِ وصال
ذکر آتا ہے یہ کس کا مرے اشعار کے بیچ

عابد جعفری

دل کا خوں کرتے ہیں، آنکھیں پانی کرتے ہیں
وہ موسم جو دریا میں طغیانی کرتے ہیں

بھولتے ہیں پھر اس کی شاخوں پر بیجان بدن
ہم جس پیڑ کے بڑھنے میں آسانی کرتے ہیں

کل جو وعدے کر کے گئے تھے خدمت گاری کے
سنتے ہیں اب محلوں میں سلطانی کرتے ہیں

کیسے رُخ حالات کا بدلے جب ہر بار چناؤ
پیش ہیں شکلیں جانی پہچانی کرتے ہیں

وہ جو عشق کی راہوں پر کل ہوتے تھے قربان
آج وہ اپنے بچوں کی نگرانی کرتے ہیں

پہلے تو وہ دیکھ کے ہم کو دوڑ کے آتے تھے
اب آنے میں کیسی آنا کانی کرتے ہیں

کہہ دے کوئی یہ اہلِ خرد سے اپنا رستہ لیں
اب عابدؔ اہلِ دل کی دربانی کرتے ہیں

باقر نقوی

وہ صدا کا تلخ لب میٹھی خبر دینے لگا
گویا اک سوکھا شجر تازہ ثمر دینے لگا

دھوپ کے نیزوں سے پا ملتی نہ تھی جلتے پناہ
یا تو اب سایہ ہی سایہ ہر شجر دینے لگا

توڑنے کے بعد بازو، نوچنے کے بعد پر
مہرباں ہو کر مجھی کو میرے پر دینے لگا

اس سے اچھا اور کیا ہوگا کسی دُکھ کا علاج
ہم کو اپنے دُکھ بھلا چارہ گر دینے لگا

ایک مٹی کا دیا بھی جس کی کٹیا میں نہ تھا
سب کو اب تحفے میں وہ شمس و قمر دینے لگا

چلّو بھر پانی میں باقر ڈوب کر مر جائیے
ہم کو تلقینِ ہنر اک بے ہنر دینے لگا

● اُردو کی نئی بستیوں سے

یونس شری

وہاں تہذیب کیا ہوگی جہاں فنکار سو جائیں
وسیلوں کے سہارے پر جہاں دربار سو جائیں

فضا کی یہ خموشی اب انھیں سونے نہیں دیتی
کنیزیں اُن سے کہتی ہیں چلو سرکار سو جائیں

گھروں کے بند دروازوں کی زنجیریں کھنکتی ہیں
محافظ جب پتہ گر میں پسِ دیوار سو جائیں

کسی پر بیچ شاخوں سے کہیں کوئی بلاتا ہے
اگر پر پیچ شاخوں پر گھنے اشجار سو جائیں

جو لفظوں کا یقیں کھو کر کتابوں کو جلاتے ہیں
وہ کاغذ کا کفن ہے بس جہاں افکار سو جائیں

جوہر میر

دعا نہیں تو مری بددعا قبول کرے
مرا خدا میرے دشمن کو با اصول کرے

مجھے ہے کیسے یہ بارک اُس طرف بھی سراب
اسیرِ حسرتِ منزل سفر فضول کرے

میں کیسے منع کروں اپنے لوٹنے والوں کو
میں چاہتا ہوں خدا اُن کے اشک قبول کرے

سجا لبوں میں تبسم لبوں پہ تھوڑا سا
مری خوشی نہ اگر آپ کو ملول کرے

چمن اُجڑتا ہے آنکھوں کی جھولیاں بھر لو
جو کام شہر کرے وہ وطن کی دھول کرے

وہ باہنر ہے جو خوابوں کو قتل کرتا ہے
اُسی کا حق ہے مرا خوں بہا وصول کرے

خالد خواجہ

رات محفل کے تمسخر کا نشانہ میں تھا
آپ راوی تھے وہاں اور فسانہ میں تھا

تیرا ہونا مرے ہونے کی تھی معصوم دلیل
تو حقیقت ہے تو کیوں ایک فسانہ میں تھا

اے غم و یاس کی تصویر خبر بھی ہے تجھے
تو گنوا بیٹھا ہے جس کو وہ خزانہ میں تھا

جس طرف بھی نظر اٹھی نظر آئے پتھر
سینکڑوں سنگ زنوں کا جو نشانہ میں تھا

میں نہیں ہوں گا تو کیا گذرے گی اُن پر خالد
اُن دکھی لوگوں کا اک عمر ٹھکانہ میں تھا

خالد سہیل

یہ کس سلیقے سے ہم پانیوں میں زندہ ہیں
حیاتِ خضر لیے بلبلوں میں زندہ ہیں

خوشی کا جشن منائیں نہ غم کا سوگ کریں
یہ کیا عذاب ہے کن بے حسوں میں زندہ ہیں

ہر ایک نسل نئی منزلوں کی خواہاں ہے
سبھی شریکِ سفر ہجرتوں میں زندہ ہیں

گھروندے مٹی کے ہر سال ہم بناتے ہیں
نجانے کب سے یہاں بارشوں میں زندہ ہیں

نئے خیال کنول ہیں ابھرتے آتے ہیں
شعورِ ذات کی ہم دلدلوں میں زندہ ہیں

کیے ہیں دفن گناہ و ثواب کے جھگڑے
دھڑکتے قلب کی ہم لغزشوں میں زندہ ہیں

افضال فردوس

یہ دل تو زرد پتا ہو گیا ہے
ہوا کی چاپ سے ڈرنے لگا ہے

ابھی مت کھولنا گھر کے دریچے
ابھی باہر بڑی ظالم ہوا ہے

ان آنکھوں کی چٹانیں کہہ رہی ہیں
کبھی پانی یہاں ٹھہرا رہا ہے

کہاں کھیلیں مری بستی کے بچے
کہ گلیوں میں لہو ٹھہرا ہوا ہے

فضا خاموش ہے چپ ہیں پرندے
کوئی طوفان شاید آرہا ہے

شجاعت علی راہی

کھو دیے ہم نے زندگی کے خزانے کتنے
کھیل کے بیتا بھی گئے پتوں نہ جانے کتنے

بادِ صرصر کی ہتھیلی پہ نشیمن اس کا
ایک چڑیا ہے مگر اس کے ٹھکانے کتنے

کتنے چہروں سے رہا کیسا تعلق اپنا
لکھنے بیٹھوں تو ہیں لکھ جاؤں فسانے کتنے

یہ یونہی تو نہیں بے شکل شمالی خوشبو
خوب دیکھے ہیں ستارہ نہانے کتنے

پھول سے پہلے تو چہروں کی طرح پھول ہیے
مجھ پہ احسان کیے سبز ہواؤں نے کتنے

جس نے کاٹی ہو وہی مجھ کو بتائے راہی
اک شبِ ہجر میں ہوتے ہیں زمانے کتنے

بخش لائلپوری

کلی میں رنگِ نمو شاخ پر لباس رہے
خزاں کے قہر میں بھی زندگی کا پاس رہے

ہمیں ہر آن بچھڑنے کا احتمال رہا
تمہارے قرب میں جب تک رہے اُداس رہے

میں اُن کی اور وہ میری پکار سن نہ سکے
اگرچہ کوئے ستم میں ہم آس پاس رہے

نیا زمانہ ہے کوئی تو تازہ بات لکھو
فقیہہِ شہر جو رہتا ہے بدحواس، رہے

نہیں بتاؤ کہاں پر وہ زہر نوش کرے
تمہارے جسم کی خوشبو جسے نہ راس رہے

ذکاء صدیقی

چہرہ جیتے پروپ بدلتا رہتا ہے
آئینے میں نقش نکلتا رہتا ہے

دل ہی نہیں روشن تو دن کیا نکلے گا
سورج تو تاریخ بدلتا رہتا ہے

یادیں تنہائی سے باتیں کرتی ہیں
سناٹا آواز بدلتا رہتا ہے

ذہن پہ بڑھتا جاتا ہے صدیوں کا دباؤ
لو کیسے کرب میں ڈھلتا رہتا ہے

اک لمحے کی حقیقت تک جانے کے لیئے
خواب کئی صدیوں تک چلتا رہتا ہے

سعید قیس

چاندنی رات مجھے راس نہ آئی مولا
میرے کس کام کی یہ چیز پرائی مولا

یہ مرا جبر سماعت میری رسوائی ہے
اب مجھے کچھ نہیں دیتا ہے سنائی مولا

کوئی خوشبو نہیں آتی میرے اندر سے مجھے
ابھی زخموں پہ جوانی نہیں آئی مولا

تُو نے جس دشت میں رکھا مجھے سائے کے بغیر
خُوب میں نے بھی وہاں خاک اڑائی مولا

دے بشارت کسی قربت کے حوالے کے بغیر
اب سہی جاتی نہیں مجھ سے جدائی مولا

لوٹ لیتا ہے مجھے کوئی سحر سے پہلے
چھین لیتا ہے مری ساری کمائی مولا

معجزہ قیس مری آگ کے اندر تھا نہاں
جل گیا میں تو آنچ نہ آئی مولا

رشید صدیقی

شہرِ احساس ہے آتش زدگاں ہیں ہم لوگ
یا کوئی خواب جلا اس کا دھواں ہیں ہم لوگ

یا یہ کہیئے کہ اجالوں کی خبر دیتے ہیں
صبح ہونے کو ہے تمثیلِ اذاں ہیں ہم لوگ

یا محبت کی گذرگاہ پہ تنہا تنہا
ہم کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کہاں ہیں ہم لوگ

یا خموشی سے گذرتے ہوئے لمحوں کی طرح
بہتے جاتے ہیں کہ بس آبِ رواں ہیں ہم لوگ

یا یہ سب کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں
وہم کا عکس ہیں تصویرِ گماں ہیں ہم لوگ

وقت یوں جذب کیئے جاتا ہے ہم سب کو رشید
جیسے دنیا کی طبیعت پہ گراں ہیں ہم لوگ

اعتماد صدیقی

اک تعلق سا درمیان میں تھا
میں بچھڑ کر بھی کاروان میں تھا

ہر طرف آفتیں تھیں موسم کی
اک پرندہ مگر اڑان میں تھا

میں نے پانی کی بوند مانگی تھی
کب سمندر مرے گمان میں تھا

خود ہی تہمت خرید لی ہم نے
ورنہ کیا کچھ تری دکان میں تھا

ریزہ ریزہ بکھر گیا آخر
آئینہ جانے کس گمان میں تھا

کچھ بناوٹ بھی داستان میں تھی
کچھ تصنع ترے بیان میں تھا

بے ٹھکانہ وہ اعتماد ہوا
عمر بھر جو تری امان میں تھا

صبیحہ صبا

اس نے پرسشِ غم کی جانے کس مروت میں
عرضِ حال کیا کرتے، رخصتی کی ساعت میں

طعنۂ نمودِ غم پردۂ نصیحت میں
اور ہم کو کیا ملتا، کوچۂ ملامت میں

شوقِ دشت گردی میں جذبِ دل تھا ورنہ
قیس کی تھی ہر خوبی جیسے ہم جماعت میں

آرزو کے پہلو میں، درد کی کسک کیسی
یاد اس رہا کیا ہے، اس طویل مدت میں

بے سبب نہ تھا اس کا، یوں چراغ پا ہونا
ہم نے بھی تو حد کردی، شکوہ و شکایت میں

جو ہوا ہوا لوگو! تذکرے سے کیا حاصل
بات اور الجھے گی، کاوشِ وضاحت میں

ہم صبائے وارفتہ، وہ شمیم گل بستہ
زخم دل چھپا رکھنا، کب بھلا وراثت میں

واصل عثمانی

ہم سے بچھڑ کے تم نے سوچا پاؤ گے آرام بہت
یہ نہیں سوچا دشمنِ جاں ہیں ہجر کے صبح و شام بہت

عشق بتاں کے ہم پر ہی کیوں عائد ہیں الزام بہت
میرؔ و مرزاؔ، حسرتؔ، فانیؔ اور ہیں ایسے نام بہت

میں نے لوگوں کو نہ بتایا کس نے مجھے برباد کیا
لیکن میری خاموشی نے دہرایا اک نام بہت

دشمنِ جاں ہے یوں تو اس کی سادہ نگاہی بھی لیکن
جس سے مخاطب ہوں وہ نگاہیں اُن کیلئے پیغام بہت

ہم تو سب کچھ بھول چکے تھے آج یہ کیسی بات ہوئی
جس میں ہم دونوں بچھڑے تھے یاد آئی وہ شام بہت

الفت کی سرکار سے واصل ہم تو پاتے رہتے ہیں
حسرت و ارماں کی سوغاتیں زخموں کے انعام بہت

کاوش عباسی

مرے اس تپیدہ خوں میں کوئی تیغ سی ڈھلے تو
جو مرض بنا ہے میرا یہی غم دوا بنے تو

یہ جہانِ آتش و خوں یہی رنگ ڈھنگ اس کا
دلِ نرم خو بھی میرا اسی رنگ میں ڈھلے تو

وہ ہزار دشتیں تو مرے خوں میں ناچتی ہیں
کبھی ایک ایسا میرے سرِ بزم بھی سجے تو

مری غمِ روزگاری میرے آڑے تھی وگرنہ
میں بھی کو بہ کو نکلتا مرے پاس طلب تھے تو

سرِ وقت کیا لکھا ہے وہ بھی دیکھ لیں گے کاوش
دلِ بند پر جنوں کے کسی باب وا ہوئے تو

مکتوبات

★ اقبال حسین — پہاڑی، کتاب گھر، نظام آباد (آندھرا پردیش)

تم شاعر کا نمبر نکال رہے ہو یا خود پر قیامت ڈھا رہے ہو۔ تمہاری ہمہ داری، صلاحیتوں کا معترف ہوں لیکن مالی وسائل کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ لوگوں کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن اردو کے تئیں ان کی خست سے دکھ ہوتا ہے۔ مجھے لکھو کہ آخر ان نمبروں کا سلسلہ کہاں ختم ہوگا؟ اور ان کی قیمت کیا ہوگی؟ میں اپنے علاوہ بھی خاص نمبر کی کچھ جلدیں فروخت کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم نے ادیبوں اور شاعروں کی ایک دنیا بسا دی ہے۔ خاص نمبر کی اعزازی کاپی کسی کو نہ بھیجو خواہ وہ کتنا ہی جغادری شاعر یا ادیب ہو۔ یہ لوگ بڑا مال سمجھتے ہیں تو مانتے ہو۔ میں اگر کہیں یہ سن لوں کہ تم نے کسی کو اعزازی کاپی دی ہے تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔ اب جنگ میں یہ کہو، یا تصادم، ہم عصر اردو ادب میرا آیا ہی رہتا ہے کہ تم نے ایک اور بڑی قدم اٹھا دیا۔ اب کتنے ایسے سلسلے ہوں گو سمیٹو گے۔ کتنی محنت کرو گے اور کتنا خرچ کرو گے؟ ابلاغ معانی ہوتے تو خوشی سے بھول جاتے اور جہاں تمہیں لگتا ہوتا، تو کچھ بھی۔ میری گزارش سنو۔ تم نمبر کو حصوں میں تقسیم کر رہے ہو۔ جو چھپ چکے ہیں ان کی نکاسی کی طرف توجہ دو۔ فروخت ہو جانے کے بعد آگے قدم بڑھاؤ۔ سارا اثاثہ حیات ان کے پیچھے لگا دو گے تو پریشان ہو جاؤ گے۔ "شاعر" کو تم نے زندگی دے کر ہی کمال کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد ایسے دھانسو نمبر کے دوسرے سلسلے، رسالوں کے خاص نمبروں کا پڑاہ ہو جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ابلاغ معانی بھی اپنے مالی وسائل سے مطمئن نہیں تھے۔ وزیر آغا اور محمود ایاز، نمبروں کے پشتارے لگا سکتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی بھی جب اتنی بڑی پوسٹ سے وظیفے پر سبکدوش ہوئے تو شب خون کو پابند وقت بنانے کیلئے مالی وسائل کی ہچکچاہٹ کی۔ تم ان سب سے فر میں جھونکنے ہو لیکن تمہارے حوصلے اللہ رکھے، ان سب سے ارفع ہیں۔

★ فیروز احمد — شعبہ اردو، فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور (راجستھان)

آپ نے شاعر کے صفحات سے قصر الادب کا نام کیوں ہٹا دیا؟ آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ قصر الادب اور شاعر لازم و ملزوم رہے ہیں۔ اس نام کو شاعر کے صفحات میں زندہ رکھیے کہ "شاعر"، "پیمانہ" اور "سلاج" تینوں کے منظر عام پر آنے سے پہلے "قصر الادب" وجود میں آیا تھا۔

(قصر الادب، مکتبہ قصر الادب کی اہمیت ایک روشن تاریخ ہے۔ آپ ہی کی طرح اور بھی لوگوں نے اس جانب ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔ قصر الادب کا نام ہٹایا نہیں گیا ہے بلکہ پوسٹ بکس نمبر کی تبدیلی اور بعض دیگر وجوہ کے سبب عارضی طور پر شاعر کے صفحات سے اس نام کو ہٹایا گیا ہے۔ رسالہ مکتبہ قصر الادب ہی سے جاری ہوا تھا۔ سلاج اور "پیمانہ" کے ساتھ رسالہ شاعر "ثریا" اور رسالہ "کنول" (مدیر منتظر صدیقی) بھی مکتبہ قصر الادب کی دین ہیں۔ خاندان سیماب، مکتبہ قصر الادب اور رسالہ "شاعر" ہم عصر ان تاریخی روایات سے کیوں کر صرف نظر کر سکتے ہیں، مکتبہ قصر الادب، کو ایک نعل اور خود مختار ادارہ بنانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ ادارہ)

★ حیدر طباطبائی 28-FAIRFIELD ROAD ILFORD ESSEX IG1 2SL LONDON

دسمبر کے شمارے میں افسانے بہت اچھے ہیں۔ خاص طور پر آغا سہیل جو اب صف اول کے افسانہ نگار اور نقاد بن چکے ہیں۔ ان کی نثر بہت پیاری ہے۔ رشید امجد، مشتاق مومن اور صفیہ صدیقی کے افسانے بھی پسند آئے۔ حصہ غزل میں دانشور، شاعر اور ادیب حسن عابد کی غزل بہت معیاری اور بلند ہے، خاص طور پر یہ شعر

تم کسی مذہب کے ہو اور ہم کسی مسلک کے ہیں
زندگی تو اک لعاب مشترک کی بات ہے

ستیہ پال آنند کا خط بڑا ہی بہجاں مرنج قسم کا ہے، افسوس کہ آپ کا اداریہ نہیں پڑھ سکا جس کی بابت اس خط میں ہے۔ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ سردار جعفری ایک ادارہ ہیں وہ اس صدی میں اردو ادب کے راست قامت مفکر ہیں، آج بھی سردار جعفری، مجروح، جذبی، اور اختر الایمان ایسے بلند مرتبہ شاعر ہندوستان میں موجود ہیں جن کو نہایت ہی دیدہ دلیری کے ساتھ سرحد پار کے ملک، جہاں کی قومی زبان اردو ہے، نظر انداز کیا جاتا ہے۔ لیکن جدید اور ترقی پسند کی حدمت میں عرض ہے کہ یہ درجہ دوم کا شہری کس قدر مدت ہے کہ ہر جگہ درجہ ایک کے شہری پر سبقت لے ہونے ہے۔ آج ہندوستان میں اردو ادب جن ضخام در ادب کے ہاتھوں میں ہے ان میں گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، رام لعل، اور جوگندر پال ایسے درج فرما رہے ہیں جن کے ابروئے چشم کے اشارے سے بھی درجہ ایک کا شہری قلمرو ئے ادب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ جب چاہیں افسانہ ہو یا شاعری، اپنے دربانی نما فرمودات داخل کر دیتے ہیں۔ غالباً پچاس سال قبل کرشن چندر نے ایک مضمون "پانی کا درخت" کے عنوان سے لکھا تھا ہم سب کو یاد ہوگا، آج دانشوران ادب ایلو دھیان، کشمیر پر کیوں کچھ نہیں لکھ رہے ہیں، درجہ دوم کا ادیب کسی بغض میں نہیں لکھ رہا ہے، یہ تو اظہر من الشمس ہے لیکن جدید اور ترقی پسند کا شہر ایسا ہو اور درجہ ایک کا شہری بھی درجہ دوم والوں کے کندھے پر بیٹھ کے میلے نے ہونے اختلاق کا شکار ہے۔ آج اردو ادب پر تعصب کا مافیا حکمراں ہے۔ کاش ہم سب درجہ چہار کے ادیب بن جائیں اور رنج و وحشت و عداوت سے نجات حاصل ہو۔

★ سراج پیامی — جامعہ، ملک ملا (بہار)

ستیہ پال آنند کا طویل خط (شاعر، دسمبر ۹۵ء) مطالعے میں آیا۔ اردو شاعری پر، خاص طور پر اردو غزل کے پس منظر میں ان کے اعتراضات مہمل اور تاریخی حیثیت سے ناقابل قبول ہیں۔ آپ کا اداریہ مثبت اور مدلل ہے۔ افسوس کہ ان کا ذہن اس سے مطمئن نہیں ہو سکا۔

اردو شعرا نے فارسی شاعری کا تتبع کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی اور لسانی حقیقت ہے۔ اردو کے ابتدائی زمانوں میں درباری زبان فارسی تھی۔ دربار سے منسلک ہندو، مسلمان، سبھی فارسی لکھتے، پڑھتے اور بولتے تھے۔ ان کے رشتے دار بھی فارسی زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اردو زبان، کھڑی بولی سے پیدا ہوئی جو دلی کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی۔ فوج میں مختلف زبانوں کے بولنے والے ملازم تھے۔ ان میں زیادہ تر فارسی اور ترکی بولنے والے تھے۔ لیکن اردو زبان، فوجیوں اور دکانداروں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتی تھی۔ اردو کے لغوی معنی ہی لشکری زبان کے ہیں۔ اردو زبان کے افعال اور حرف جار تو ہندوستانی رہے لیکن اسما اور زیادہ تر صفات، فارسی اور عربی کے ساتھ ترکی سے بھی ماخوذ ہیں۔ عربی مذہبی زبان تھی اور فارسی درباری زبان۔ عربی اور فارسی ادبیات کے اعلیٰ نمونے اردو شعرا کے پیش نظر تھے۔ اردو شاعری نے اپنا شعری سفر وہاں سے شروع کیا جہاں تک فارسی شاعری پہنچ چکی تھی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید، سنسکرت میں نہیں ہے۔ لیکن برہمنوں نے سنسکرت زبان کو فروغ دیا اور اسے خاص لوگوں کیلئے مخصوص کر دیا۔ اس طرح اس زبان کا رابطہ عوام سے کٹ گیا اور ایک بڑی زبان مردہ زبانوں میں شمار ہونے لگی۔ سنسکرت زبان کی اعلیٰ تخلیقات مثلاً ویدا اور رزمیہ وغیرہ اردو شعرا کی دسترس سے باہر تھے۔ سنسکرت کے علاوہ اس زمانے میں جو پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں ان کی ادبی، شعری تخلیقات اتنی معیاری اور علامتی نہیں تھیں۔ کہ حالات اور کیفیات کا ساتھ دے سکتیں، لیکن عربی اور خاص طور پر فارسی زبان کی استعاراتی اور علامتی شاعری کے اعلیٰ نمونے اردو شعرا کے سامنے تھے۔ اس لئے انہوں نے فارسی شاعری کی پیروی کی۔ اس کے باوجود اردو شعرا نے ہندوستانی تہذیب کو بھی اپنی شاعری میں سمویا۔

میر اور غالب اور ایسے ہی اردو کے باکمال شعرا نے غزل میں ہندوستان کو اس کی تہذیب کو سماج کو اپنا احساس بنایا ہے۔ فارسی کے بعد اردو شاعری میں جو استعاراتی و علامتی اظہار ملتا ہے وہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتا۔ غزل ایک مہذب ترین صنف شاعری ہے اور غزل کے تہذیبی اور علامتی وصف کے سبب یورپ کی بعض قوموں نے غزل کی بہت تعریفیں کی ہیں۔ ایمرسن نے دیوان حافظ کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر فارسی شاعری کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا اور حافظ کی غزلوں کو بے حد سراہا۔ جرمنی شاعر گوئٹے نے بھی فارسی غزل کو شعرا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس نے پہلی بار غزل کی ہیئت کو پیش نظر رکھ کر اپنی غزلوں کا دیوان مرتب کیا اور اس کا نام سلام مغرب بنام مشرق " رکھا۔ علامہ اقبال اپنے دیباچہ پیام مشرق میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا مکمل ترجمہ شائع کیا اور اس ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار، سعدی، فردوسی، اور عام اسلامی لٹریچر کا ممنون احسان ہے۔

ایک دو جگہ غزل بھی لکھی ہے، اور اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی (مثلاً گوہر اشعار، تیر مژگاں، زلف گرہ گیر) بے تکلف استعمال کرتا ہے۔

دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں مثلاً مغنی نامہ، ساقی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ، حکمت نامہ وغیرہ بعد کے شعرا، پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن اسٹراپٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا، تکمیل تک پہنچایا۔ پلاٹن نے ادبی اغراض کے لئے فارسی زبان سیکھی تا کہ بجز ردیف کے فارسی عروض و قواعد کی پابندی کے ساتھ غزلیں لکھیں۔ رباعیاں لکھیں، اور نپولین پر ایک قصیدہ بھی لکھا۔ گوئٹے کی طرح فارسی استعارات مثلاً عروس گل، زلف مشکیں، اور لالہ زار کو بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے اور شراب کا بھی دلدادہ ہے۔ روکرٹ کی نگاہ میں فلسفہ رومی کی بڑی وقعت تھی اور اس کی غزلیات زیادہ تر مولانا روم ہی کی تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ بوڈن اسٹراپٹ نے اپنی نظموں کو مرزا شفیع کے فارسی نام سے شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ایک سو چالیس مرتبہ شائع کیا۔ خواجہ حافظ کے مقلدوں میں ڈومر، ہرمن، ہیل، لوشکے، اسٹگلٹز، لنشہ ہولڈ اور فان شاک بھی شامل ہیں"

فارسی غزل ہو یا اردو غزل، اس کا ایک خاص وصف ردیف، قافیہ کی پابندی ہے جو دوسری زبانوں میں نہیں۔ فارسی اور اردو میں ہم آواز الفاظ کی کثرت ہیں جن سے دوسری زبانیں محروم ہیں۔ شیکسپیئر ایک عظیم ڈرامہ نگار اور شاعر ہے وہ کہتا ہے

BLOW BLOW THO WINTER
WIND/ BECAUSE THOU ARTH
NOT SO UNKIND.

WIND اور UNKIND ہم صورت الفاظ نہیں۔ یہ صرف دیکھنے اور لکھنے میں یکساں ہیں۔ فارسی اور اردو والے اسے ہرگز قافیہ تسلیم نہیں کریں گے۔ ایک اور اہم شاعر ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے

LET US GO THOU AND I
THE EVENING IS SPREAD AGAINST
THE SKY

یہاں I اور SKY ہم صوت ضرور ہیں لیکن دیکھنے اور لکھنے میں یکساں ہیں اسی لئے فارسی اور اردو میں یہ بھی قافیہ نہیں کہلائیں گے۔ پہلے شعر کا قافیہ خطی اور بصری ہے اور دوسرے شعر کا صوتی ہے۔ فارسی اور اردو میں وہی الفاظ قافیہ کہلائیں گے جو صوتی خطی اور بصری بھی ہوں۔ فارسی میں غزل کیلئے ہمیشہ سرتیدن کا لفظ (یعنی گا کر سنانا) استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے غزل میں قافیہ اور ردیف کا استعمال ضروری ہے۔ کیونکہ مرکبات لفظی اور تکرار کا عنصر خوش آوازوں اور صوتی اثر و دلکشی اور قبولیت کا باعث ہوتا ہے۔ روبن لیوی، فارسی ادب کی مختصر تاریخ میں لکھتا ہے کہ انگریزی زبان مقفیٰ الفاظ کی کم یابی اور علامت نحوی کی کمی کے باعث اس طرز کی مثال (غزل یا قصیدہ) پیش کرنے کیلئے ناموزوں ہے۔ جہاں تک انگریزی زبان کے ترانے کا تعلق ہے وہ بھی ضرور کسی نے لکھوایا ہے۔ اس کا عنوان ہی غلط ہے۔ سعودی عرب، مصر اور مشرق وسطی کے بیشتر مسلم ممالک کی زبان اردو نہیں بلکہ عربی ہے۔ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی زبان بنگلی ہے۔ اردو نہیں خود ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کی زبان اردو نہیں ہے، مثلاً مغربی بنگال کا مسلمان بنگلہ بولتا ہے اڑیسہ کا مسلمان اڑیہ بولتا ہے۔ مہاراشٹر کا مراٹھی، گجرات کا گجراتی، کرناٹک کا کنڑا، کیرالہ کا ملیالم، آندھرا کا تیلگو، تامل ناڈو کا تامل۔ اگر کوئی شخص اردو کو مسلمانوں کی زبان بولتا ہے تو یہ بخیلی اور لسانی کذب بیانی ہے۔

یہ ایک ہندوستانی زبان ہے کیونکہ RICHARD WILDER بھی تسلیم کرتے ہیں
NO DOUBT URDU WAS DEVE-
-LOPED IN INDIA, AND IS AN
INDIAN LANGUAGE.

اردو کو عام ہندو بھائیوں نے اس محبت اور خلوص سے گلے نہیں لگایا جس طرح بنگال کے مسلمانوں نے بنگلہ زبان کو حرز جاں بنایا۔ یہ تو انگریزوں کا چھوڑا ہوا شوشہ تھا جس کی بنیاد فورٹ ولیم کالج کی بنیاد کے ساتھ ہی پڑ گئی تھی۔ ورنہ آج ہندو بھائی بجائے ہندی کے، اردو کو اپنی زبان کہتے۔ آج بھی ہندوستان کے بیشتر علاقوں کے ہندوؤں کی زبان، ہندی نہیں، وہ بنگال میں بنگلہ، اڑیسہ میں اڑیا، تامل ناڈو میں تامل، بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ تامل ناڈو میں تو کوئی شخص ہندی کا نام بھی نہیں لیتا اس لئے اردو کو مسلمانوں کی اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان کہنا بخیلی اور لسانی جہالت ہے۔ اگر شمالی ہندوستان کے ہندو، انگریزی کے دام فریب میں نہیں آجاتے تو آج ان کی زبان بھی اردو ہوتی۔ کسی بھی زبان کو ہندو مسلمان میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے کی طرح آج بھی بیشتر مسلمان، ہندی اور سنسکرت کے عالم اور بیشتر ہندو، اردو اور فارسی میں مہارت رکھتے ہیں۔ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی زبان ہے، جو تقریباً سارے ہندوستان میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔

★ شمس الرحمٰن علوی ــــ ۱۳۱ اے ــ ۲۸ اسلام نگر بھوپال

شاعر، روز بہ روز نکھرتا جارہا ہے اور اب ہم عصر اردو ادب نمبر کا انتظار ہے۔ آپ نے ہم عصر اردو ادب نمبر کی جو قیمت طے کی ہے، کیا وہ زیادہ نہیں ہے، ممکن ہے کہ بہت زیادہ ہو، لیکن کیا ادب کا قاری آج بھی ہندوستان میں اتنی قوت خرید رکھتا ہے؟ کم از کم میری حالت ایسی تو نہیں۔ کیا ادب صرف خواص کے لئے ہے؟ مجھے آپ کی دشواریوں کا علم ہے۔ اس دور میں اتنا ضخیم خاص نمبر شائع کرنا اور اس کی قیمت کم رکھنا آسان نہیں۔ اس مسئلے کا حل کیا ہو جبکہ اتنی ضخامت کے خاص نمبر اور کتابوں کی قیمت عام قاری کی دسترس سے باہر ہے کہ ہم ایسے قارئین کا خیال کرکے ایک انتخاب الگ سے کم قیمت پر شائع کریں تو ہمارا بھی بھلا ہو جائے گا۔

★ اقبال جاوید —— [illegible] کلکتہ

دسمبر ۹۵ء کا شمارہ نظر سے گزرا، مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ تزئین اور تکنیک کے لحاظ سے جاذب نظر اور فکر انگیز ہے۔ روایت اور معیار کے مطابق ہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے "فکر امروز" کا موضوع بے حد موثر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے آج کے دور کو سامنے رکھ کر یہ مثل مکمل بات کہی تھی۔ "شاعر" کا یہ شمارہ اچھے، منتخب اور بامعنی نثر و نظم پر مشتمل ہے۔ اس شمارے کے شعری اور نثری باب دونوں ہی بہت اچھے اور معیاری ہیں۔

نثری حصے میں مشتاق مومن کی کہانی "نظربند" مہدی ٹونکی کی کہانی "بے چاپ کسی جگہ جل کر" ابراہیم اختر کی "گورکنا"، "صفیہ صدیقی کی کہانی" ہوم سیلپ "آنا مکمل کی" فرحت کشور" اور رشید امجد کی "بے منزل مسافریں" سب ہی متاثر کرتی ہیں۔ یہ تمام کہانیاں زبان و بیان کے لحاظ سے اہم ہیں۔ انداز اور پلاٹ کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں۔

اس کا شعری حصہ قابل ستائش ہے۔ محسن جلد، اطہر راز، عاصم صدیقی، [illegible]، احمد کمال پروازی، شاہد کبیر، اسلم عمادی، ساحر شیوی، شوکت بنگرامی، امتیاز نسیم ہاشمی، سید ریاض وغیرہ کی غزلوں نے متاثر کیا ہے۔ ان میں بعض غزلیں تو ایسی ہیں جو دل کو چھو لیتی ہیں۔ ذہن پر نقش مرتب کرتی ہیں، [illegible] کے احساسات و جذبات کے پیکر تراشتی ہیں۔

نظم میں محمد علوی کی "جنگ جاری ہے" بہت ہی معیاری اور معنویت کی حامل ہے۔ بشر نواز کی "ہر سا" بڑی اچھی اور پر اثر نظم ہے۔ جو ذہن سے ہوتے ہوئے دل کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ساز بزمی کی "دو گیت" اور اکرام خاور کی "انتظار" اور "صبح" قابل قبول نظمیں ہیں۔ عین رشید کی شخصیت مختلف خانوں میں بکھری ہوئی ہے، ایک طرف تو وہ اعلیٰ اور قابل احترام پولیس افسر ہیں دوسری طرف ایک اچھے قلم کار اور ادیب ہیں اور تیسری طرف ایک اچھے اور کامیاب شاعر بھی۔ ان کی "شہر" بہت پرانی اور معرکۃ الآرا نظم ہے۔ جو تقریباً ۱۹۸۸ء میں کہی گئی تھی اور یہی نظم ان کے صف اول کے شاعر ہونے کی ٹھوس دلیل ہے۔ آپ کا احسان مند ہے کہ آپ نے نظم "شہر" کو شائع کر کے اردو قارئین کو اس کے مطالعے کا موقع فراہم کیا ہے۔ آج کے اس پر آشوب دور میں ایسی تخلیقات کی ضرورت ہے۔ جو قارئین تک "شاعر" کے ذریعہ پہنچ رہی ہیں۔ جس کیلئے آپ اور آپ کا ادارہ مبارک باد کا حق ہے۔

★ نیاز احمد آسی —— آزاد نگر، جمشید پور

"شاعر" دسمبر ۹۵ء کے شمارے کی کوئی بھی غزل پسند نہیں آئی۔ کہانیوں میں مشتاق مومن کی "نظربند" ایک فکر انگیز کہانی کہی جا سکتی ہے۔ فرحت کشور میں آنا مکمل کا اسلوب تحریر خوبصورت ہے۔ صوفی ازم سے ان کی جانکاری قابل تعریف ہے۔ مہدی ٹونکی کی کہانی "بے چاپ ایسی جگہ جل کر ---" اخباری خبروں پر مبنی ہے۔ ایسی کہانیاں جرائم پیشہ واقعات، اور منوہر کہانیاں، وغیرہ میں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہوم سیلپ کی دو چار سطریں پڑھ کر چھوڑ دیا۔ دل پر کرن گوری اور ابراہیم اختر اپنی کہانی "گورکنا" میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ستیہ پال آنند کا خط، انگریزی ترانے کے حوالے سے غور طلب ہے۔ نظام صدیقی کا خط، خط سے زیادہ لغت معلوم ہوتا ہے۔

دراصل ادبی رسائل کم ہیں، اور اردو والوں کے مسائل ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہیں۔ اردو زبان کے بارے میں سننے کو ملتا ہے کہ یہ زبان دم توڑ رہی ہے۔ ختم ہو رہی ہے۔ دراصل یہ باتیں ان ہی حضرات سے سننے کو ملتی ہیں جو کسی نہ کسی طرح پر اردو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ مگر جن کے بچے اردو رسم الخط سے دور ہیں۔ اردو کا رونا تو ہمیشہ ہی سے رویا گیا ہے۔ اور اسے سیاسی ایشو بنائے رکھا گیا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی اور آزادی کے آس پاس بھی اور اب اس میں کچھ زیادہ ہی شدت آ گئی ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ سب پر سب کچھ عیاں ہے۔ اگر ہم پچاس اور ساٹھ کی دہائی کو دیکھیں تو اردو کے مشاہیر، اخبارات اور رسائل میں اردو رسم الخط کو تبدیل کر دینے کی بحث زیادہ ملتی ہے۔

اس وقت اردو ٹائپ رائٹر بنانے کی راہ میں دشواریاں پیش نظر تھیں۔ مگر آج اردو کے بہت سارے کمپیوٹر موجود ہیں۔ اردو کا وہ دور، جسے لوگ عوامی دور کہتے ہیں یعنی اردو عوام سے جڑی ہوئی تھی تو اردو کے ادبی رسائل کا سرکولیشن کیا تھا؟ ذرا آج سے موازنہ کیجئے۔ ۳۰ روزنامے اردو میں شائع ہو رہے ہیں۔ قومی زبان ہندی کے بعد یہ تعداد دوسرے نمبر پر ہے۔ اور مجموعی سرکولیشن اخبارات و رسائل کا ۳۵ لاکھ سے زائد ہے۔ اگر اس تعداد کو نہ مان کر ۲۵ لاکھ ہی مان لیا جائے اور اردو کو یہ کہہ کر دس فیصد کی اقلیت کی زبان کے اخبارات و رسائل ہیں یہ تو کیا حیرت انگیز اعداد و شمار نہیں ہیں؟ یہ خاتون مشرق، پاکیزہ آنچل، وغیرہ جیسے عوامی رسالے، جن کے ذکر سے ادبی حضرات منہ بناتے ہیں، وہ ان رسائل کی تعداد اشاعت دیکھیں۔ تو اندازہ ہوگا کہ ایک زمانے میں اردو کے بڑے بڑے رسالے نہیں تک پاتے تھے۔ آج ہندی میں کتنے ادبی جرائد شائع ہو رہے ہیں؟ اردو کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ کتنی سخت جان ہے اردو ہماری۔ آج بھی اردو زندہ ہے اور رہے گی انشاء اللہ۔

جب تک دنیا ہے اردو رہے گی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ لکھنؤ میں مولوی گنج کے ۲۲ سالہ لڑکے، جاوید کی نظم، تو ادارہ کا [illegible] ملے، مجھے ملا ہے۔ قصبہ کاکوری میں ایک ۷۰ سالہ بوڑھی [illegible] اور جاورہ (ایم پی) میں کوئی عشقیہ اردو کے نہایت ہی عمدہ اشعار سنائے کہ حیرت ہو۔ یہ ایک دو واقعے نہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے آپ اور ہم گزرتے ہیں۔ اگر ہم بنگلوں میں بیٹھ کر اور ہوائی جہازوں میں سفر کر کے اردو کے مسائل پر غور کریں گے۔ فرسٹ کلاس اے سی میں سفر کر کے مشاعروں کو گرما کر تالیاں اور واہ واہ سمیٹ لائیں تو اس سے اردو کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اردو عوام کی زبان ہے لیکن اب عوام سے دور ہو رہی ہے۔ (آپ کے اداریے کے مطابق) ہمیں ایک بار پھر عوام سے جڑنا ہے۔ اردو کو روٹی روزی سے جوڑنا ہے۔ ہمیں اردو کو زندگی بنانا ہے۔ تب ہی اردو کے مسائل حل ہوں گے۔ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں آج بھی اردو ہے۔ شیر گھاٹی گیا، پرسنی، دربھنگہ، سرونج، مالیگاؤں، ٹیکم گڑھ، بیجاپور، ایسے ہی بہت سارے علاقوں میں اردو ہے۔ ضرورت ہے غور کرنے کی اپنے اپنے ڈرائنگ روم سے باہر آکر عملی طور پر کام کرنے کی ان لوگوں سے ملنے کی ضرورت ہے جو آج بھی اپنی دکانوں کے سائن بورڈ اردو میں لکھتے ہیں۔ ملئیے ان مزدوروں سے جو آج بھی اپنے دستخط اردو میں کرتے ہیں۔ جی ہاں! شہر بھوپال کے مزدور اپنے دستخط اردو میں کرتے ہیں جبکہ انہیں اردو نہیں آتی۔ لیکن انہوں نے دستخط سیکھے تو اردو میں، مولوی صاحبان سے۔ اسی کی دہائی میں جن شہروں میں اردو کے رسائل نظر نہیں آتے تھے آج وہاں کے بک اسٹالوں پر اردو کے رسائل نظر آنے لگے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ خلوص دل کے ساتھ اپنے اپنے مقام پر اردو کیلئے جدوجہد کی ضرورت کل سے کہیں زیادہ آج ہے۔ شاعر کا خاص نمبر ہزاروں لاکھوں اردو ادب کے قارئین تک ضرور پہنچنا چاہئیے۔ لیکن قیمت کم سے کم ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو کے بڑے مخلص لوگ آپ کی مدد کریں۔

طویل خط آپ کے اداریوں کی ہی گونج ہے۔

فروری ۱۹۹۶ء

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے

✽

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۳۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے

۲۵ ڈالر ــ ۱۵ پونڈ

فکر امروز

ادبیات کا منشار و مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مظاہر لسانی میں ایک ندرت، ایک مناسبت اور ایک ترتیب پیدا کر دے۔ ادبیات کی حدود ایک طرف تو لسانیات سے ملتی ہیں۔ دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات سے ایک ادب آشنا صرف زبان کو ذریعۂ اظہارِ خیالات تصور کر کے بحث کرتا ہے مگر ایک ادیب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی حیاتِ باطنی اور جذبات کی غیر آشکار گہرائی کا بھی پتہ لگائے۔ موضوع کے ماخذ کو الفاظ کے طلسم سے ڈھونڈ نکالے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی ماہیت بحیثیت وصفِ انسانی سمجھ سکے اور معلوم کر سکے کہ خیال سے اس کا کیا تعلق ہے اور ترقی و تربیتِ دماغ و علم پر اس کا کیا اثر ہے۔

۱۶۔ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء

[خطبۂ صدارت: بزمِ ادب جہلم (پنجاب)]

— سیماب اکبرآبادی —

شاعر کا یہ شمارہ !

شاعر کا یہ شمارہ اس خصوصی شمارے کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا اور جسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ مذکورہ خصوصی شمارے کی پسندیدگی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور یہ اصرار بھی گونج بنتا رہا کہ اسلامی ممالک کی جو کہانیاں باقی رہ گئی ہیں انہیں بھی شائع کردیا جائے۔ شاعر کے بے شمار قارئین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک اور شمارہ ۱۹۹۴ء میں ترتیب دے لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کئی اور خصوصی موضوعی شمارے بھی ترتیب دیے جا چکے تھے لیکن نامساعد حالات اور ہم عصر اردو ادب نمبر کے عظیم منصوبے اور اس کے پھیلتے ہوئے کار و افکار کے دباؤ نے مجوزہ شماروں کی اشاعت کو التوا میں رکھا۔ اب جب کہ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کی اشاعت قریب تر ہے اور شب و روز لمحوں، سکنڈوں میں سمٹتے ہوئے لگ رہے ہیں کسی اور خصوصی شمارے پر توجہ دینا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم قارئین کے اصرار اور شمارے کی پہلے سے موجود ترتیب نے حوصلہ دیا کہ شمارہ نذرِ قارئین کردیا جائے۔ سو! کچھ اور اسلامی ممالک کی کہانیاں شائع کی جا رہی ہیں اپنی روایتی تخلیقی ترتیب کے ساتھ۔

اس شمارے کی اشاعت کے ساتھ جی چاہتا ہے کہ اس امر کا اعادہ کیا جائے جو ۱۹۳۰ء سے تاحال شاعر کا مزاج رہا ہے یعنی تخلیق کو تنقید و تحقیق پر فوقیت اور نئے قلم کاروں کی سرپرستی ان کی حوصلہ افزائی۔ شاعر کو تنقیدی سنسنی خیزی اور تحقیقی بھول بھلیوں کے بجائے تخلیقی مسرتوں اور بصیرتوں سے سجایا جاتا رہا ہے۔ جب کہ معاصر شعر و ادب پر ناقدین و محققین بے طرح حاوی ہو گئے ہیں اور تخلیقی چکا چوند ماند پڑ گئی ہے آج تخلیق کاروں اور ان کے فن پاروں پر گفتگو نہیں ہوتی بلکہ ناقدین و محققین ہی شعر و ادب کے منظر نامے بنا رہے ہیں اور تخلیق کاران منظر ناموں کے زیر اثر اپنے حرف و لفظ سجانے میں مصروف ہیں اور تخلیقی ادب کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ تنقید و تحقیق کی اہمیت اپنی جگہ کہ فن پارے کی تعیینِ قدر کے لئے یہ ناگزیر ہیں لیکن کیا ہماری تنقید ہماری اپنی ہے؟ کیا ہم اپنی تحریروں سے کوئی گلوبل تھیوری یا کوئی نیا تنقیدی ماڈل بنا رہے ہیں؟ ۲۱ ویں صدی کے ماہ و سال اب ہمارے آس پاس ہی ہیں اور عالمی سطح پر پوری دنیا سرحدوں سے نکل جانا چاہتی ہے۔ لفظ مر رہے ہیں، شور بڑھ رہا ہے ہم کہاں ہیں؟ شاعر کے ابتدائی شماروں سے تاحال، ۶۶ سال کے طویل سفر میں زیادہ سے زیادہ تخلیقی ادب کی پیش کش میں نئی تنقیدی تہذیب کے اپنے اشاریے روشن کئے ہیں۔ ہم آج بھی اپنے اسی مزاج میں زندہ ہیں اور شاعر کے ہر شمارے کو تخلیقی شمارہ بنانے کی سعی کرتے ہیں لیکن شاید ہم اپنے اس مزاج میں تنہا ہیں مگر اسی مزاج کو زندہ رکھنے والے تو شاعر کے بے شمار قارئین ہیں جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۶ء تک شاعر پڑھتے آئے ہیں۔ ہمارے خوابوں، خواہشوں اور کوششوں کا سفر جاری ہے کہ شاعر کا ہر شمارہ صوری و معنوی، ہر دو اعتبار سے تخلیقی اور صرف تخلیقی روپ ہو۔

● ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل)

ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) جلد متوقع ہے۔ شدید ترین انتظار کے ان صبر آزما لمحوں میں لفظ اُداس ہیں قطعی کمزور اور بے معنی سی لگ رہی ہیں بس یوں سمجھئے کہ ہم تقریباً آپ کے آس پاس ہی ہیں۔ مارچ ۹۶ء کا عام شمارہ اور اس کے بعد خاص نمبر کی جلد اوّل کی اشاعت۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود خاص نمبر کی اشاعت بروقت نہیں ہو سکی اس کا ہمیں اعتراف ہے اور شدید احساس بھی۔ ہمیں اندازہ ہے کہ پوری اردو دنیا شاعر کے خاص نمبر کا نہایت ہی بے چینی اور بے صبری سے انتظار کر رہی ہے۔ پوری اردو دنیا میں طرح طرح کی سرگوشیاں بھی گونج رہی ہیں لیکن اب خاص نمبر کی تکمیل کے آخری مراحل میں ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ ہماری کاوشیں جب بھی خاص نمبر کے روپ میں سامنے آئیں گی۔ ہر سوال کا آپ ہی جواب بن جائیں گی۔ استدعا ہے کہ ہمارے حق میں دعا کیجئے کہ ہم اپنے ہرگز رنج سے ڈرتے ہیں لیکن اپنے کام پر یقین و اعتماد بھی رکھتے ہیں۔

خدا یقین سے امیدیں کم نہیں رکھتے
ہم انتظار کے خانے میں غم نہیں رکھتے

[اجام ۱۵]

اعتراف

مجھے تسلیم ہے اپنی جہالت
کہ میں نے منتشر دخوبہکے ذہنوں کی رفاقت میں بسر کی زندگانی

مجھے تسلیم ہے اپنی حماقت
کہ ہر اک احمق و جاہل سے میں دنیا کی بازی ہار جاتا ہوں

مجھے تسلیم ہے اپنی شقاوت
کہ دل ٹوٹے کسی کا، میرا دل فریاد کرتا ہے

مجھے تسلیم ہے خود ذات سے اپنی محبت
کہ میں نے عمر کے اک ایک لمحے کا لہو اپنے عزیزوں کو پلایا ہے
خود اپنی فاقہ کشی جہد و کشاکش کا ثمر ان کو کھلایا ہے

مجھے تسلیم ہے اپنی دنایت
کہ روئے آنکھ کوئی میری پلکوں پر ستارے ٹوٹتے ہیں

مجھے تسلیم ہے اپنی بغاوت
کہ میری تشنگی جام مجازی کو نہیں کہتی حقیقی عشق کا نشہ
کہ میری معصیت ایمان کو دھوکا نہیں دیتی

مجھے تسلیم ہے اپنی انانیت
کہ وہ جادے، نشاں ہیں جن پہ اوروں کے قدم کے، مجھ کو ڈستے ہیں
میں ہر نقش قدم کو راہ کا پتھر سمجھتا ہوں
مٹایا اس کو تب آگے بڑھا ہوں
اگر اضافِ کہنہ کو چھوا ہے تازہ کار ان کو بنایا
اگر پژمردہ پھولوں کو اٹھایا تو بہار ان کو بنایا

مجھے تسلیم ہے اپنی خیانت
کہ میں تجھ اک کی محرومی کو اپنا ہی مقدر جانتا ہوں
جو غم اوروں کے ہیں ان کو بھی میں اپنی ملکیت مانتا ہوں

مجھے تسلیم ہے اپنی گنہ گار آدمیت
خدایا!

اپنے ان سارے گناہوں کا اٹھا کر بوجھ تیرے سامنے حاضر ہوا ہوں
سرافگندہ حضورِ مجمعِ روزِ جزا ہوں
میں سراپا خطا ہوں، مستحقِ ہر سزا ہوں

کراماً کاتبین نے کیا لکھا اعمال نامے میں
نکیرین آ کے اس عاصی کا کیا محضر سنائیں گے
وہ جانیں اور تو جانے

غفور و رحیم و آمرزگارا
میرا تو یہ عقیدہ ہے
شفیعِ روزِ محشر رحمتِ عالم ہیں
جام ساقیٔ کوثر مداوائے عطش ہے
شفاعت اُن کی، اِن کا جام مل جائے
تو میرے سب معاصی نیکیوں کے خالی پلڑے میں بھر کر
تیرے انصاف کا میزان کو میرے حق میں کر دیں گے

مجھے تسلیم ہے اپنی یہ بدعت
پرستش مصطفیٰؐ کی کر رہا ہوں، بندۂ شاہِ ولایت ہوں
تیری حمد و ثنا کو چھوڑ کر مدّاحِ سلطانِ شہادت ہوں

کالی داس گپتا رضا

*

کچھ ایسی کھری جنس کا بیوپار کیا ہے
ہر بیچنے والے کو خریدار کیا ہے
پل پل کی جو دستک ہے در دل پہ اسی نے
لفظوں کو رواں، فکر کو بیدار کیا ہے
اے جانِ غزل! گوشہ نشیں رہ کے بھی ہم نے
گوندھی ہے تری زلف، تجھے پیار کیا ہے
بیڑی ہو تو کاٹوں، کوئی زنداں ہو تو توڑوں
آزاد ہواؤں نے گرفتار کیا ہے
تاریخ شہیدوں کو سجانا نہیں بھولی
ہر سر و سر دار کو سردار کیا ہے
اب دیکھیے کس کنج قفس میں ملے بستر
دل نے تو کھلی چھت ہی پہ اصرار کیا ہے
ذہنوں نے اڑادی ہے تمیز ارض و فلک کی
تمنا پرواز کا دشوار کیا ہے
صدیوں کی تھکن ڈالے ہوئے ہے وہی شکنیں
ہموار رہ شوق کو ہموار کیا ہے
بے شک میں ہی مجرم ہوں رضا ضبط و وفا کا
نیلام انھیں کا سر بازار کیا ہے

توریج فرازمند

معینے نظامی

بچی اور سمندر

ہم گرمیوں میں ساحل سمندر پر گئے۔ میری بچی نے کہا: "ابو! سمندر کو اپنے ساتھ گھر لے چلتے جائیں۔" واپسی پر ہم نے سمندر کو بس کی چھت پر سوار کر لیا۔ صرف مجھے اور میری بچی کو پتہ تھا کہ ہم سمندر کو ساتھ لا رہے ہیں۔

راستے میں، سمندر میں طوفان آ گیا۔ پانی، بس کی کھڑکیوں سے اندر آنے لگا۔ مسافر سمجھ رہے تھے کہ بارش ہو رہی ہے۔ صرف میں اور میری بچی جانتے تھے کہ ہمارے سروں پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

ہم نے سمندر کو اپنے چھوٹے سے صحن کے ایک کونے میں جگہ دے دی۔ شام کو میں اور میری بچی اس کے کنارے بیٹھ جاتے، موجوں کو دیکھتے اور ہنستے رہتے۔

"ابو! آپ سمندر کو دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"موجوں کی آوازیں سن رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"آپ کو بادبانی کشتیاں نظر آ رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"ابو! جیسے! دیکھتے ہیں!"

ایک دن اس کی ننھی منی بلی سمندر میں گر پڑی۔ بلی صحن کے ایک کونے میں مری پڑی تھی۔ میری بچی رو پڑی۔ میں بھی دل ہی دل میں رو دیا۔ صرف مجھے اور میری بچی کو پتہ تھا کہ بلی سمندر میں ڈوب کر مری ہے۔

ایک رات بچی نے بے حوصلگی سے کہا:

"ابو! "مازندران" کے بچے سمندر کے بغیر رہ گئے ہیں؟"

"ہاں!"

"وہاں کی مچھلیوں سے سمندر چھن گیا ہے؟"

"ہاں!"

وہاں کی کشتیاں سمندر سے محروم ہو گئی ہیں؟"

"ہاں!"

"ابو سمندر کو واپس چھوڑ آئیں!"

اس رات کو ہم موجوں کی آوازیں سنتے رہے۔ اگلے دن صرف مجھے اور میری بچی کو پتہ تھا کہ سمندر، پہاڑوں کے اس پار چلا گیا ہے!

ترسیل زر کا پتہ

وزیر آغا

ممکن نہیں کچھ اور تو پھر ایک کام کر
سورج بجھا، چراغ جلا اور شام کر

شب کا حصار توڑ، دھندلکوں کو راہ دے
تو اے مہِ تمام مجھے ناتمام کر

کیڑوں کے ساتھ چل کبھی پیڑوں کے پاس بیٹھ
بے نام ہو کے تو بھی ذرا اپنا نام کر

خوشبو کے رنگ کھینچ نہ ریکھا کمان سی
رخشِ صبا ہے اس کو نہ چھیڑ اور رام کر

آنسو سا بن کے پھیل نہ آنکھوں میں رات کی
شبنم کی طرح نوکِ سحر پہ قیام کر

دل کی کھلی بات تبسم میں مت چھپا
ہونٹوں کی درز کھول اسے بے نیام کر

اس بیکراں کو چھو نہ سکے لب ترے تو کیا
پھر سعیِ خام اے لبِ تشنہ کام کر

۵۸۔ سول لائنز سرگودھا (پاکستا

غلام حسین نظری
معین نظامی

رات اور پروانے

میں نے انھیں اپنی آمد کا پتہ نہیں چلنے دیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں وہ تین افراد بیٹھے تھے۔ میری ماں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بازوؤں کی خشک ٹہنیاں کھل گئیں۔ مجھے ایک بار پھر یوں لگا جیسے میں وہی سکول سے بھاگا ہوا بچہ ہوں اور اس کی گود میں پناہ لینے آیا ہوں! میں نے اپنے آپ سے کہا: "تم بڑے ہو گئے ہو!" لیکن میں کبھی بڑا نہیں ہوں گا۔ ہرگز بڑا نہیں ہوں گا۔

میں نے اپنے بھائی اور بہن سے ہاتھ ملایا اور ان کے ماتھے چومے۔ پھر ہم مل کر بیٹھ گئے۔ ماں میرے چہرے سے نظریں ہی نہیں ہٹا رہی تھی:

"بتاؤ کیسے ہو؟"

میں نے تھوک نگلی۔

"بھئی کچھ بتاؤ تو سہی' دو سال کہاں رہے؟ کیا کرتے رہے؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"تھکے ہوئے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا بھائی میرے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ کا کنارہ سرخ ہو چلا تھا اور اس کی آنکھیں —————— جیسے انھیں ذرا دبا گیا ہو! میں نے اس سے پوچھا: "تم کیا کرتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں!"

میں نے اپنی بہن سے کوئی بات نہ کی۔ بس ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ چپ چاپ!

تخت پر وہی پرانا لیمپ جل رہا تھا اور کچھ پروانے اس کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ کوئی چیز بھی نہیں بدلی تھی: دروازے' دیواریں' کھڑکیاں' پردے' چھت کے شہتیر' کوئی چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ صرف ماں زیادہ بوڑھی ہو چکی تھی' بھائی کی آنکھوں کو ذرا دبا گیا تھا اور بہن —————— بہن کسی خوبصورت گڑیا کی طرح' تخت پر تھوڑی ٹکائے' اپنی بلوریں آنکھوں سے لیمپ کے شعلے کو تکے جاتی تھی۔ ماں نے کہا: "تمھارے منہ میں زبان نہیں ہے؟"

"کیا کہوں؟"

"یہی کہ دو سال کہاں تھے؟ کیا کرتے رہے؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"تھکے ہوئے ہو' تمھارے لیے چائے بناتی ہوں۔"

نہیں' کوئی چیز بھی نہیں بدلی تھی: "دروازے' دیواریں' کھڑکیاں' پردے' چھت کے شہتیر۔ سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ہمارے دلوں میں کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ ہمارے دلوں میں کسی چیز کو توڑ دیا گیا تھا۔

لیمپ جل رہا تھا۔ کچھ پروانے اس کے شیشے سے چپٹے ہوئے تھے۔ سماوار میں پانی ابل رہا تھا۔ بہن کا سر کسی گڑیا کے جھکے ہوئے سر کی طرح تخت کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی اور ہم ایک خاموش غم میں ایک دوسرے کو دیکھے جاتے تھے۔

اکبر حیدرآبادی

شاخ پر پھول کھلا، جشن کا آغاز ہوا
دفعتاً سارا چمن گونج کے آواز ہوا

جھانک کر دیکھ لیا لوگوں نے دل کا منظر
اک تبسم بھی کبھی درد کا غماز ہوا

سنگ ریزوں کو رعونت سے کچل کر گزری
موجِ سفاک میں پیدا نیا انداز ہوا

کس کے پرتو کی تھی آہٹ سرِ آئینۂ جاں؟
آنکھیں روشن ہوگئیں، دروازۂ دل باز ہوا

نہ ملا اور کسی کو خلشِ غم کا سراغ
میری قسمت کا ستارہ مرا ہمراز ہوا

دوزخ کام و دہن جس کی سزا تھی اکبر
ایک لقمہ بھی اسے دعوتِ شیراز ہوا

30 FUFFLEY ROAD
BRISTOL BS10 5EW
WESTBURY ON TRYM
AVON (U.K)

پشتو۔ قلندر مومند
عبدالکافی ادیب

حبیب بنام سرکار

بارش بدستور برس رہی تھی۔

گزشتہ دو روز سے بارش نے آفت بپا کر رکھی تھی۔ خنکی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ دفتر کا عملہ سلگتی ہوئی انگیٹھی کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔ ایسے موقع پر صاحب کی گھنٹی کا بجنا صورِ اسرافیل سے کم نہیں ہوتا۔ دفتر کا بوڑھا چپڑاسی صاحب کے دفتر کے باہر بغلوں میں ہاتھ دبائے بوسیدہ کوٹ کے کالر میں اپنے کان اوڑھائے ہوئے تھا۔ ٹائپ رائیٹر کی کھٹ کھٹ کے ساتھ بوڑھے چپڑاسی کے دانتوں کا جبڑا بھی بج رہا تھا۔ انگیٹھی کے گرد بیٹھے ہوئے بابو لوگ لمحہ بہ لمحہ پہلو بدل رہے تھے اور کمرے میں سگریٹ کے تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بو گولڈ فلیک سگریٹ کی تھی۔ میری نظروں نے اس مرغولے کا تعاقب کیا تو ہیڈ کلرک پر جا رکی ـــــ اور یہ کیپسٹن کی بو؟" یہ ہیڈ اسسٹنٹ کی جانب سے آرہی تھی۔ اور قینچی؟ میرے ذہن میں سیکنڈ کلرک کا سراپا گھوم گیا۔ اور رفتہ رفتہ بو کی درجہ بندی میں کمی آگئی۔ پاسنگ شو فورتھ گریڈ ہوکر دفتری کے اور 'بیڑی' انگیٹھی کے گرد بیٹھے چپڑاسی لوگوں کے حصے میں آئی ہوئی تھی۔ سگریٹوں سے اٹھتے ہوئے مرغولوں نے اوپر فضا میں سات رنگ کا سماں پیدا کیا تھا۔ یہ مرغولے آپس میں گڈمڈ ہوگئے تھے۔ اور تمام برانڈ کے مرغولے اس میں دست و گریباں تھے۔ کہ ـــ اچانک دروازہ کھل گیا ـــــ "او بیڑہ غرق۔ جلدی کر۔ دروازہ بند کر ـــ وقت بے وقت منہ اٹھائے چلے آتے ہو۔" سلگتا ہوا گولڈ فلیک ایش ٹرے میں پڑا ہوا تھا۔ اور ہیڈ کلرک کے منہ سے خرافات کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

اور جب میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ تو دروازے کے وسط میں ایک سفید پوش بوڑھے کو کھڑا دیکھا جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس کے کپڑے بارش سے شرابور ہو چکے تھے اور پانی کی بوندیں نیچے فرش کو گیلا کر رہی تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آؤ حبیب ملا۔" میری آواز سن کر اس کا حوصلہ کچھ بڑھا۔ وہ میرے قریب آیا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے خاموشی سے پھٹے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بوسیدہ کاغذ نکالا اور میری طرف آگے بڑھاتے ہوئے منمنایا۔ "اس میں ذرا دیکھنا پیشی کی کون سی تاریخ ہے۔" کاغذ کافی حد تک گیلا ہو چکا تھا اور اس پر لکھے ہوئے حروف گڈمڈ ہو چکے تھے۔

"قربان جاؤں قدرت کے کارناموں کے" اس کے منہ سے نکلا۔ "میری نسوار کی پڑیا جیب میں پڑے پڑے بارش سے گھل کر بہہ گئی ہے، ساری جیب گندی کر دی ہے۔" اس دوران گولڈ فلیک اور کیپسٹن کا ملا جلا مرغولا آیا۔ اور حبیب ملا کے منہ میں گھس کر اسے کھانسنے پر مجبور کر دیا۔

میں حبیب ملا کو بڑی دیر سے جانتا ہوں، جب گاؤں میں اس کی ہل ہوا کرتی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا ابھی لام پر نہیں گیا تھا۔ جب اس کا چھوٹا بیٹا جھوٹے مقدمے میں پھانسی کی سزا پا گیا تھا اور جب اس نے اپنی زرعی زمین ہالی نامی ہندو سیٹھ کے پاس گروی نہیں رکھی تھی۔ اور مجھے وہ دن یاد ہے جب لام کے میدان میں اس کے بڑے بیٹے کی موت کی اطلاع دی گئی۔ اور جب چھوٹے بیٹے کو پھانسی کی سزا ہوگئی تھی تو ہل تب سے بند پڑی ہے۔ ایک صبح میں کالج جا رہا تھا، مجھے کسی نے بتایا کہ حبیب ملا اپنے بال بچوں سمیت راتوں رات گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں میں چلا گیا ہے اور جب میں کالج سے واپس آیا تو میں نے ہالی ہندو سیٹھ کو سپاہیوں سمیت حبیب ملا کے مکان کے قریب کھڑے دیکھا جس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور پھر مجھے

ادا جعفری

صبر آیا نہ تاب آوے ہے
نہ دعا کا جواب آوے ہے

اب خدائی ہے تیرے بندوں کی
روز یوم حساب آوے ہے

جب سے بچھڑے ہوئے شجر میرے
شاخ مژگاں گلاب آوے ہے

دشت ہجراں سے دست ہجراں تک
دل کو سارا نصاب آوے ہے

ہیں اندھیروں کو اوڑھ بھی لیتی
راہ میں ماہتاب آوے ہے

دل انھیں راستوں سے گزرے ہے
جن پہ نس دن عذاب آوے ہے

اس کو اذن سخن نہیں ملتا
جس کو طرز خطاب آوے ہے

اس کے ہوتے بھی دل دکھا ہے بہت
اس سے کہتے حجاب آوے ہے

۲۴۳ / ۸ / بی بلاک - ۶ - پی - ای سی - ایچ سوسائٹی، کراچی - ۲۹ (پاکستان)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

وہ دن بھی یاد ہے جب ملک تقسیم ہوا۔ حبیب ماما اپنے گاؤں واپس آگیا اپنے آبائی مکان کو حاصل کرنے۔ جب یہ لوگ یہاں سے جارہے تھے تب کشی ساتھ تھی مگر اب جب دوبارہ واپس آئے تو کشی ساتھ نہیں تھی البتہ حبیب ماما کے چہرے پر زخم کا ایک گہرا نشان بنا ہوا تھا۔ اور جب میں نے کشی کے بارے میں دریافت کیا تو جواب میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ بہتے ہوئے چہرے کے زخم خوردہ حصے میں جمع ہونے لگے۔ آنسوؤں میں مجھے کشی کا ہیولا نظر آگیا۔ اور جب میں نے کشی کو پانچ سال بعد دیکھا تو حسب عادت وہ مسکرائی تھی اور "تا" کرتے ہوئے اس نے چہرہ چھپا لیا۔

حبیب ماما اپنے گھر پر قبضہ کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ مگر وہ اسے نہ اپنا سکا کیونکہ بالی ہندو سیٹھ ہندوستان کو جاتے ہوئے حبیب ماما کے مکان کو سردار خان کو رشوت میں دے گیا کہ وہ اسے اپنی حفاظت میں لے کر بالا حصار قلعے تک پہنچا دے۔ تب سے سردار خان حبیب ماما کے مکان پر قابض ہے۔ حبیب ماما نے اس کی منت کی بہت فریاد کی مگر سردار خان کا دل نہ پسیجا۔ تب حبیب ماما نے حاکم کے نام درخواست لکھی مگر حاکم نے بھی اس کی نہ سنی۔ اور جب میرا تبادلہ مہاجرین کے محکمے میں ہوگیا تو ایک شام کو وہ میرے پاس آیا۔ "چھوٹے خان" وہ منمنانے لگا۔ "اب اللہ نے چاہا تو حیات خان کے بھوسے والی کوٹھڑی میں رہائش سے میری جان چھوٹ جائے گی۔"

دراصل وہ مجھ سے مدد کا خواہاں تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "حبیب ماما تو پرواہ نہ کر اللہ نے چاہا اور مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکا وہ میں کرتا جاؤں گا۔"

اور پھر وہ میری کوششوں کا باقاعدہ جائزہ لینے کے لئے ہر ہفتے میرے پاس آنے لگا اور میں ہر بار اسے کل کے وعدے پر رخصت کرتا رہا۔

"حبیب ماما۔۔۔ تحریر تو پڑھی نہیں جاتی۔ میرا خیال ہے یہ اکیس تاریخ ہے۔۔"

"اکیس۔ اکیس کب ہے؟"

"کل۔۔ بس بس یہ اکیس ہی ہے۔ بالکل صحیح تاریخ ہے۔ کل پیشی کا دن ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ہیڈ کلرک نے مجھے گھور کر دیکھا۔

میں نے خود کو بڑا بے بس محسوس کیا۔ میں نے کاغذ اس کی طرف لوٹاتے ہوئے کہا۔ "بس حبیب ماما تم جاؤ"۔۔ اس نے ہیڈ کلرک کی جانب اپنی پیٹھ موڑتے ہوئے نہایت رازداری کے ساتھ کہا۔ "صاحب کا حل خوان (ریڈر) مجھ سے رشوت مانگ رہا ہے۔ اور میں بھی جانتا ہوں کہ میرا یہ کام بغیر رشوت دیئے نہیں ہو سکتا۔ جبھی تو آیا ہوں کہ تم میری سفارش کرادو"۔۔ اور میں اس کے منت آمیز لہجے کے سامنے ٹھہر نہ سکا آہستہ سے کہا۔ "کل آجاؤ کل ویسے بھی پیشی کا دن ہے" میں آگے نہ بول سکا۔

"بیٹا اب کہاں جاؤں واماکل کو دوبارہ آنا پڑے گا۔" حبیب ماما کی صورت رونی بن گئی میں کانپ گیا اس نے کاغذ کو جیب میں ٹھونس دیا۔۔ اور چپکے سے نکل گیا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور گراؤنڈ فلیک کے دھویں کے مرغولے کو اپنے ساتھ لے اڑا۔ بابوؤں نے دروازے سے حبیب ماما کو نکلتا ہوا دیکھا۔ ہیڈ کلرک کی پیشانی سے بل ہٹ گئے اور جب چھٹی ہوئی تو مجھے فکر ہوئی کہ اس برستی بارش میں نہ جانے حبیب ماما کہاں ٹھوکریں کھاتا ہوگا کاش میں اسے کچھ دیر کے لئے روکتا۔ تو اسے اپنی سائیکل پر بٹھا کر گھر پہنچا آتا۔ مگر ہیڈ کلرک کی گھورتی ہوئی نظروں سے میں اس قدر بدحواس ہوگیا تھا کہ میں حبیب ماما کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہ کرسکا۔

اور جب میں گھر پہنچا۔ تو مغرب کی اذانیں ہورہی تھیں۔ گلی میں اکا دکا راہگیر دکھائی دے رہے تھے۔ اور جب میں گھر میں داخل ہوا تو حبیب ماما کی بیوی کی آواز سنائی دی "ٹھیک ہے میں پھر آؤں گی" اور جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو کمل اٹھی تیزی سے آکر مجھ سے پوچھا "بیٹا وہ تیرا حبیب ماما تیری طرف آیا تو نہیں تھا"۔ "وہ آیا تھا" میں نے فوراً جواب دیا۔ "مگر وہ کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلا گیا۔ کیا وہ اب تک نہیں پہنچا؟"

"بیٹا وہ اب تک نہیں پہنچا۔ اللہ خیر کرے۔" وہ جاتے جاتے کہہ گئی۔ باقی صفحہ ۱۵ پر دیکھئے

باقر مہدی

اب کہاں تابِ سخن اور کہاں بیداری ہے
چند سانسیں ہیں، یہی بوجھ بہت بھاری ہے
کون سی چال چلوں، آخری بازی ہے مری
کھیل تو ختم ہے، لیکن بڑی دشواری ہے
راکھ کا ڈھیر سمجھتے ہیں مجھے سارے لوگ
کیا پتہ ان کو، کہ پنہاں کوئی چنگاری ہے
خون تو بہتا ہے، پھر بھی میں سنبھل جاتا ہوں
کیسے بتلاؤں کہ مرا زخم سی فن کاری ہے
دیکھتا ہوں کہ نہیں کوئی بھی ہمدم، لیکن
شہر میں، گھر میں، بڑے دھوم کی غمخواری ہے
مٹ گئے، ٹوٹ گئے بت میرے صنم خانے کے
ایک سرکش ہے مگر میری وفاداری ہے
کوئی منصف ہے، نہ مجرم ہے سوالی میں سبھی
ہند میں چھائی ہوئی ہر طرف عیاری ہے
کیوں اندھیرے میں کھڑے ہو، کہیں پاگل تو نہیں
اپنے سائے سے بھی بات نہیں بیزاری ہے

ارشاد مہدی درشن۔ آف کارٹر روڈ، باندرہ (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۰

سندھی:- امر جلیل
افاق صدیقی

سفر سے سفر تک

یہ اس شام کا ذکر ہے جب صدر میں گولی چلی تھی اور لوگ رستوں پر اپنے بوٹ، چپلیں اور ٹوپیاں چھوڑ کر ادھر ادھر کی دکانوں اور ہوٹلوں میں جا چھپے تھے۔

جان محمد عرف جانو اور میرے علاوہ کچھ دوسرے راہ گیروں نے ایک نصف تعمیرشدہ عمارت میں پناہ لی تھی۔ ہوش و حواس بجا ہوئے تو میں نے چھپتے چھپاتے ایلفی اسٹریٹ کی طرف دیکھا۔ بوٹوں، چپلوں اور ٹوپیوں کے بیچ میں سڑک پر کسی بچے کی دودھ پینے والی بوتل بھی پڑی تھی۔ سورج کے گولی لگ چکی تھی اور وہ گولی کا گھاؤ لیے آسمان کی دستوں میں خون کی لکیر چھوڑتا ہوا ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔

ایک شکستہ حال عورت، جس نے اسی نصف تعمیرشدہ عمارت میں پناہ لی تھی، ٹکٹکی باندھے دودھ کی بوتل کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ پریشان اور خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "جوتیوں، ٹوپیوں اور چپلوں کے بیچ میں سڑک پر پڑی ہوئی دودھ کی بوتل تمہارے بچے کی ہے؟" وہ غم زدہ عورت میری طرف متوجہ ہوئی۔ مجھے دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ چہرے مہرے سے وہ بڑی تھکی ہاری لگ رہی تھی۔ اس کے وجود کی بے پناہ غم انگیز پرچھائیاں اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھیں۔ میں نے اپنے سوال کو پھر دہرایا: "میرا خیال ہے سڑک پر پڑی ہوئی دودھ کی بوتل تمہارے بچے کی ہے؟"

"ہاں!" وہ دکھ بھری آواز میں بولی: "سڑک پر پڑی ہوئی دودھ کی بوتل میرے بچے کی ہے۔"

جان محمد عرف جانو جمائیاں لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک فلمی گانے کے بول مچل رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا "جانو! بوٹوں اور ٹوپیوں کے بیچ میں سڑک پر دودھ کی بوتل پڑی ہے۔" جواباً اس نے فوراً پوچھا: "تمہاری تو نہیں ہے؟" — میں نے بگڑتے ہوئے ٹوکا: "بکواس نہ کرو۔"

وہ بولا: "تو پھر اس کا مطلب ہے کہ سڑک پر پڑی ہوئی دودھ کی بوتل میری ہے؟"

میں نے اس کے شانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "وہ سامنے ایک بدحال عورت دیکھ رہا ہے؟"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔" اس نے اپنے کاندھے کو میری گرفت سے آزاد کراتے ہوئے جواب دیا۔ تب میں نے اسے بتایا: "سڑک پر پڑی ہوئی بوتل اس عورت کی ہے۔"

اس نے پوچھا: "اٹھا لاؤں" — "نہیں اس عورت سے پوچھے بغیر نہیں۔"

میں اور جان محمد اس شکستہ حال عورت کے قریب گئے اور میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اسکا نام جان محمد عرف جانو ہے۔ یہ میرا عکری دوست بہت بہادر ہے۔ موت سے بے خوف ہو کر گولیوں کی بارش میں تمہارے بچے کی دودھ پینے والی بوتل سڑک سے اٹھا کر لانے کے لیے تیار ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ عورت کوئی جواب دیتی، پکی داڑھی والا ایک بوڑھا جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا بیڑی پی رہا تھا اچانک جانو سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا: "ارے میاں! تم موت کے کنویں میں موٹرسائیکل تو نہیں چلاتے ہو؟"

ہم سب نے بوڑھے کی طرف گھور کے دیکھا۔ جان محمد کچھ برا فروختہ سا ہو گیا لیکن میں نے بوڑھے سے کہا: "یہ جان محمد سرکاری باغیچے کے ایک خالی پنجرے میں مرے ہوئے ریچھ کی کھال پہن کر بیٹھتا ہے، اور روزانہ پانچ روپیہ کماتا ہے۔"

بوڑھے نے اپنی پکی داڑھی لہراتے ہوئے ہمیں گھورا: "میاں! یہ تو بڑے راز کی بات بتائی۔"

پھر پوچھا: "تمہارا اس ریچھ سے کیا تعلق ہے؟"

"ریچھ سے ملا ہوا ایک گیدڑ کا پنجرا ہے۔ میں ایک مرے ہوئے گیدڑ کی کھال پہن کر اس پنجرے

میں بیٹھ جاتا ہوں اور میں بھی روزانہ پانچ روپیہ کماتا ہوں۔"

بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں جوت جاگ اٹھی۔ اس نے جلتی ہوئی بیڑی کو دیوار سے مسل کر بجھایا اور پوچھنے لگا: "ارے میاں! پھر تو تم اس عورت سے ضرور واقف ہو گے جس کا جسم لومڑی کی طرح ہے؟"

"ہاں"۔ میں نے اثبات میں جواب دیا: "وہ میرے اور جانو کے پنجروں کی پشت پر بچوں سے ڈھکے ہوئے تمبو میں رہتی ہے۔ تماشائی آٹھ آنے دے کر اس کو دیکھنے جاتے ہیں۔ وہ تماشائیوں کو اپنا نام ممتاز محل بتاتی ہے۔"

بوڑھے نے کریدا: "کیسی لگتی ہے؟"

"مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "میں اس سے محبت کرتا ہوں"

بوڑھے نے عجیب سے جوش میں آتے ہوئے دریافت کیا: "کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟"

"نہیں' وہ اپنے سات بچوں سے محبت کرتی ہے۔"

بوڑھے نے سوالیہ لہجے میں پوچھا: "کیا اس کے بچوں کا چہرہ بھی آدمیوں جیسا اور جسم لومڑی کی طرح ہے؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ممتاز محل کے ساتوں ہی بچوں کا جسم بھی آدمیوں جیسا ہے۔"

"تعجب ہے" بوڑھے نے اپنی داڑھی میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہا: "تو ممتاز محل کا جسم لومڑی جیسا کیوں ہے؟"

"کیماڑی سے دوبئی جانے والی لانچ کو جب امیدوں کے سمندر میں ڈالا گیا اس وقت ممتاز محل کا جسم عام عورتوں جیسا تھا۔ اس لانچ میں اس کا شوہر موجود تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد ممتاز محل کا جسم لومڑی جیسا ہو گیا۔ اس وقت سے وہ اب تک سرکاری باغیچے میں تمبو کے نیچے رہتی ہے۔ لوگ آٹھ آنے دے کر اسے دیکھنے جاتے ہیں اور وہ سب کو اپنا نام ممتاز محل بتاتی ہے حالانکہ اس کا اصل نام 'مجیداں' ہے۔"

"ارے! کچھ تو شرم کر گیدڑ!" جانو نے میری پیٹھ پر مکہ جماتے ہوئے کہا۔

"تیری بکواس سن کر پبلک کیا سوچتی ہو گی؟"

"سڑکوں پر جوتیاں اور ٹوپیاں چھوڑ کر ادھوری عمارت میں پناہ لینے والی پبلک کچھ نہیں سوچتی ہے ہر ایک بکواس خاموشی اور صبر و تحمل سے سنتی ہے اور یہ بوڑھا تو کوئی بڑا حکیم ہے جو ترچھی آنکھوں سے چوری چوری شکستہ حال عورت کو تاکے جا رہا ہے۔"

"اس تباہ حال عورت پر مجھ کو بڑا ترس آ رہا ہے۔" جان محمد بولا: "سڑک سے میں بوتل اٹھا لاتا ہوں۔"

جان محمد عرف جانو میرا جگری یار ہے' ہم دونوں سدرہ اسٹار الیون کی طرف سے گکری گراؤنڈ پر فٹ بال کھیلتے ہیں اور فرصت کے اوقات میں ریچھ اور گیدڑ کی کھال پہن کر سرکاری باغیچے کے پنجروں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دوسرے پنجروں میں بھی ہماری جیسی مخلوق مختلف جانوروں کی کھالیں پہن کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہم پر بولنے چالنے کی بندش ہوتی ہے بس حکم کے بموجب ہم تماشائیوں کو کرتب دکھاتے ہیں۔

جانو نے پھر پوچھا: "میں دودھ کی بوتل اٹھا لاؤں؟" میں نے جواباً کہا: "جانو! مجھے وہم ہو رہا ہے۔"

"کس بات کا وہم؟" جانو نے میری طرف دیکھتے ہوئے معلوم کرنا چاہا: "تم سمجھتے ہو کہ گولی کھا کر میں سڑک پر مر جاؤں گا؟" میں نے اثبات میں اپنے شانوں کو جنبش دی۔

"میں سڑک پر گولی کھا کر نہیں مروں گا' یہ سعادت تمہارے اور میرے نصیب میں لکھی ہوئی نہیں ہے۔ ہم تم تو پنجروں میں ختم ہو جائیں گے۔ مرتے وقت تمہارے جسم پر گیدڑ کی اور میرے جسم پر ریچھ کی کھال ہو گی۔"

"جانو! ذرا ٹھہرو۔" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا: "جانے کیوں میرا دل تمہیں روکنے پر مصر ہے؟"

جان محمد میرے سامنے آ گیا اور کاندھوں کو جھنجوڑتے ہوئے بولا: "بہت پہلے جب میری ماں کا سینہ سوکھ گیا تھا اور وہ مجھے بوتل میں دودھ پلاتی تھی تب ایک دفعہ گولی چلی تھی اور میری ماں دودھ کی بوتل اٹھائے آسمان کی طرف پرواز کر گئی تھی۔"

حمایت علی شاعر

میں سو رہا تھا اور کوئی بیدار مجھ میں تھا
شاید ابھی تلک مرا پندار مجھ میں تھا

وہ کج ادا سہی' مری پہچان بھی تھا وہ
اپنے نشے میں مست جو فنکار مجھ میں تھا

میں خود کو بھولتا بھی تو کس طرح بھولتا
اک شخص تھا کہ آئینہ بردار مجھ میں تھا

اپنے خلاف ہو کہ کسی کے خلاف ہو
میرا وجود برسرِ پیکار مجھ میں تھا

شاید اسی سبب سے توازن سا مجھ میں ہے
اک محتسب لیے ہوئے تلوار مجھ میں تھا

اپنے کسی عمل سے ندامت نہیں مجھے
تھا نیک دل بہت جو گنہگار مجھ میں تھا

● سی بی' ۲۵۔ الفلاح' شاہ فیصل کالونی۔ کراچی — ۲۵۔ (پاکستان)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

میں نے جان محمد کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں جکڑ لیا۔ وہ گلوگیر سی آواز نکالتے ہوئے مجھ سے ایک مرتبہ پھر اجازت مانگنے لگا "میں سڑک سے بوتل اٹھا لاؤں۔ یہ بیچاری عورت بہت اداس ہے۔" دفعتاً وہ میری گرفت سے نکل کر پلک جھپکتے ہی سڑک سے دودھ کی بوتل اٹھا لایا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے لمبی داڑھی والے بوڑھے نے تالیاں بجائیں۔

جانو نے بوتل اس غم زدہ عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ لو اپنے بچے کو دودھ پلانے والی بوتل۔" عورت نے اپنی آنکھیں جان محمد کے چہرے پر گاڑ دیں۔ تب جان محمد نے اپنا ہاتھ اور آگے بڑھا کر بوتل اس کے ہاتھ میں دینا چاہی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہے۔ میں نے اس افسردہ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا: "جان محمد اپنی جان کی بازی لگا کر تمہارے بچے کی بوتل لے آیا ہے۔"

عورت نے آہستہ آہستہ ہاتھ آگے بڑھا کر جان محمد سے وہ بوتل لے لی۔ اسوقت ادھوری عمارت میں پناہ لینے والوں کی نگاہیں ادھر اٹھنے لگیں مگر وہ سب کے سب ایک عجیب سی الم انگیز حیرت میں ڈوب گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عورت کی گود تو خالی ہے۔

جان محمد نے ڈرتے ڈرتے معصوم سی آواز میں پوچھا: "تمہارا بچہ کہاں ہے؟"

"گولی چلنے سے پہلے میری گود میں تھا۔" عورت نے رک رک کر اپنا دکھ ظاہر کیا: "گولیاں برسنے کے بعد وہ میری گود خالی کر کے آسمان کی طرف اڑ گیا ---- اور ---- جاتے جاتے اپنی دودھ پینے والی بوتل سڑک پر چھوڑ گیا۔"

جان محمد کے لبوں پر غمناک تبسم کی لکیر ابھر آئی۔ وہ ادھوری عمارت سے تیر کی طرح باہر نکل گیا۔ پھر قمیض کے بٹن کھول کر اپنے دونوں بازو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے بیچ سڑک پر بے خوف کھڑا ہو گیا۔

آپ کی مدّت خریداری فروری ۹۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری فروری ۹۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ نئے سال [مارچ ۹۶ء تا فروری ۹۷ء] کے لئے اپنا زرِ تعاون ارسال کر کے ممنون کیجئے۔

آپ کی طرف شاعر کے بقایاجات

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا زرِ سالانہ .... کے شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ ازراہِ شاعر نوازی اپنے بقایاجات اور خاص نمبر [جلد اوّل] کی رعایتی قیمت جلد از جلد ارسال کیجئے۔

ندا فاضلی

✽

...چھت تھی دیوار و در تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے
...بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا، وہ دیا دیر سے

...کوئی کام معمول سے، گزارے شب و روز کچھ اس طرح
...چاند چمکا غلط وقت پر، کبھی گھر میں سورج اگا دیر سے

...رک گئے راہ میں بے سبب، کہیں وقت سے پہلے گھر آئی شب
...بند دروازے، کھل کھل کے سب جہاں جہاں میں گیا دیر سے

...اتفاقات کا کھیل ہے، یہی ہے جدائی، یہی میل ہے
...مڑ مڑ کے دیکھا کیا دور تک، بنی وہ خموشی صدا دیر سے

...دن بھی، روشن ہوئی رات بھی، بھرے جام لہرائی برسات بھی
...ساتھ کچھ ایسے حالات بھی، جو ہونا تھا جلدی، ہوا دیر سے

...تی رہی یونہی ہر بندگی، ملی نہ کہیں سے، کوئی روشنی
...چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی، خدا مجھ پہ روشن ہوا دیر سے

● ۳۰۳، امر اپارٹمنٹس، ڈاکٹر پاڑہ - اکھاڑ، بمبئی ۵۲
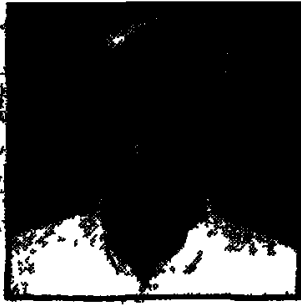
ناصر شہزاد

سبد کے انگ سے رنگ جھنجھوڑا
میں نے غزل کو گیت سے جوڑا
پیچھے رد کے بابل کی کج
آگے کھینچے پیار نگوڑا
آزادی کی پہلی حکایت
خیمے ، ماتم ، خالی گھوڑا
"میں زردوشت ہوں مان ہری ادھان"
"اس مورکھ نے ہاتھ نہ چھوڑا"
بچے ماس نے مٹی پہنی
اوپر رنگ رتوں کا اوڑھا
سپتی گگن کے سادہ قصے
گجرا توڑا ، مٹکا پھوڑا
ضد.... انکار.... اقرار ملن کا
لیکن کم کم.... تھوڑا تھوڑا
ساری سجل وہ ، ساری سندر
ناک میں تیلی ، پاؤں میں توڑا
میں اور پی — تنہائی توبہ
انگ بھریر کو مسلا ، مروڑا

● محلہ اسلام آباد، ساہیوال پنجاب (پاکستان)

بلوچی: نعمت اللہ گچکی
غوث بخش صابر

کیا یہی زندگی ہے

ایک جہاں سرما کی شدت نے گھیر رکھا تھا' شمال ہوا میں تلوار کی کاٹ آگئی تھی' ہوا کے جھکڑوں نے طوفان بپا کر رکھا تھا۔ درختوں نے خزاں کی کالی چادر اوڑھ لی تھی یوں لگتا تھا جیسے گئے موسموں کا سوگ منا رہے ہیں۔ کوئی کیا جانے یہ کیوں سوگوار ہیں۔ راتیں تو تاریک تھیں ہی دن بھی اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پرندے ہوں کہ رینگتی مخلوق' اپنے گھونسلوں اور بلوں میں پناہ لیے ہوئے اپنی جمع کی ہوئی پونجی پر زندگی بسر کر رہے تھے۔

بوڑھی نانی اماں نے اپنے خستہ لحاف سے جھانکتے ہوئے آواز دی "گلو جان' دیکھنا تو سائے اگر پلٹ پڑے ہوں؟ کہیں ایسا نہ ہو میری نماز سردی کی بھینٹ چڑھ جائے۔" گلو جان نے جواب دیا "بڑی اماں سائے لوٹ رہے ہیں۔ اٹھئے۔ ہوا کا زور بھی ٹوٹ رہا ہے۔ آپ کی نماز کا وقت ہو چکا ہے۔" "ہاں بیٹے سرما کی شدت گھٹنے لگی ہے تو بادلوں نے سر اٹھا لیا ہے۔ خدا رحم کرے گھروں' کپڑوں لتوں سے محروم انسانوں پر رحم فرمائے۔ کٹیا کی گلی ہوئی چھت تو ابھی سے ڈرانے لگی۔" نانی اماں نے غم آلود لہجے میں کہا۔ پوتے نے ایک زوردار قہقہہ بلند کرتے ہوئے بتایا۔ "نانی جان آپ کا ٹخنہ تو لحاف سے باہر جھانک رہا ہے آپ نے یہ لحاف کب بنوائی تھی؟" — "اف — چندا تم کیوں ایسی باتیں پوچھتے رہتے ہو' میرا دل ایسی باتوں سے دکھتا ہے یہ میری پرانی سنگی ہے' تیرے دادا نے اپنے بیاہ کے دنوں میں بنوائی تھی۔ ہم دونوں نے اپنی جوانیاں اسی کی اوٹ میں بسر کیں' وہ تو اپنی راہ چلدیا۔ سوچتی ہوں یہ مجھے بھی قبر تک پہنچانے میں رفاقت کرے گی۔ تیرے بابا کے پاس ایسی حیثیت نہیں کہ نئی بنوا دے۔ دن بھر بھاگ دوڑ کرتا ہے جان پر بن آئی ہے تو کہیں جا کر روکھی سوکھی سے بچوں کا پیٹ پلتا ہے' ایسے میں بھلا میرے لحاف کی قسمت کیسے جاگ سکتی ہے۔ اس کی کمائی تو دوسروں کے اللے تللے کی نذر ہو جاتی ہے کبھی کسی کی بھنگ' کسی کی چھالیہ۔ آرام وہ گدے بن کر کٹتے ہیں جو اسے اپنے سوئم پر لٹاتے ہیں۔" ایک سانس میں نانی اماں نجانے کیا کیا کہہ گئیں۔

نانی نے پھٹے پرانے لحاف کو خیرباد کہا' ساتھ ہی اسے بھوک کا احساس ہوا۔ "صدو جان' دیکھنا تو دسترخوان میں بچی کچی روٹی پڑی ہو شاید میرے دل میں کچھ توانائی آجائے۔" "نانی جان دسترخوان تو پہلے میں نے آپ کے سامنے ہی جھاڑ دیا تھا۔ تھوڑا سا ٹکڑا بچ گیا۔ میں نے جو دو تین چپاتیاں پکائی تھیں گلو جان نے توڑ توڑ کھا ڈالیں۔ دو ایک نوالے میں نے لئے اور بس — ہاں ایک چپاتی تہ کر رکھی ہے گلو جان کے والد کے لیے وہ کام پر گئے ہوئے ہیں بھوکے ہوں گے۔" صدو نے جواب دیا "اری رہنے دے۔ مجھ چڑیل کی بجائے وہ آکر نوش کر لے۔"

تھوڑی دیر گزری تھی کہ گلو جان کا بابا ایٹرک سردی اور بھوک سے نڈھال لوٹ آیا اور دھوپ میں بیٹھتے ہی صدو کو آواز دی۔ "صدو! اگر کھانے کو کچھ ہے تو لے آؤ۔ یہاں بیٹھ کر زہرمار کریں۔ کھجور کے اگر کچھ دانے ہوں تو لیتی آؤ۔" "آپ سے کہا تو تھا کہ کھجوریں ختم ہو گئی ہیں۔ ونڈک کا بچا ہوا حصہ جو میں نے سردیوں کے لیے بچا رکھا تھا وہ قرض خواہوں کو دے دیا۔" صدو نے افسردگی سے کہا۔ ان کا چھ سال بیٹا بابوت دوڑتا ہوا آیا۔ "اماں میں نے آج تک سے فاختہ کا شکار کیا ہے۔ وہیں اس کے پر نوچ ڈالے۔ نمک کہاں ہے میں اسے آگ پر بھونتا ہوں۔"

"وہیں نمک دان میں دیکھو۔ اندر پڑی ہے۔ میرا دماغ مت چاٹو۔" صدو نے جھاڑ پلا دی "اماں اس

میں تو نمک نہیں ہے۔" لڑکے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "اچھا۔ ذرا سورگ دان میں بھی دیکھ ڈالو۔ اگر اس میں بھی نہیں ہے تو بغیر نمک کے انگاروں پر رکھ دو" "ہاں" لڑکا ایک مرتبہ پھر پکارا۔ "روٹی کا ایک نوالہ رکھ لینا میں گوشت کیساتھ کھاؤں گا۔" ایثرک نے صدو سے کہا۔ "ہوا میں پہلی سی شدت نہیں رہی۔ تم بھی چادر اوڑھ کر میر کے ہاں چلی جاؤ تھوڑی سی کھجور مانگ لاؤ۔ آج رات میں نے لکڑی کاٹنے جانا ہے۔ میر کے ہاں لکڑی ختم ہو گئی ہے۔"

سورج افق مغرب پر جھک رہا تھا۔ جنوب کی طرف سے کالے کالے بادل جھوم جھوم کر بڑھ رہے تھے تھوڑی ہی دیر میں سورج غروب ہو گیا اندھیرا بڑھ گیا' بادلوں نے بڑھ کر سارے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ ایک تو رات کی تاریکی پھر بادلوں کی اندھیر گردی' گھور اندھیرے میں آنکھ کو آنکھ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بوندا باندی اور بارش جل تھل بری۔ اولے تڑتڑ آنے لگے۔ بارش نے تو وہ سماں باندھا کہو آج ہی ٹوٹ کر برسنا ہے۔ مویشیوں نے سہم کر زور زور سے ممیانا اور ڈکارنا شروع کر دیا۔ امرا اپنے پکے گھروں میں اور غریب اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں پھٹے پرانے کپڑوں میں دانت بجا رہے تھے۔ بارش رک گئی جانوروں کی آوازیں آنی بند ہو گئیں مگر اب بھی کہیں کہیں سے ان بے نواؤں کے کراہنے کی آواز آتی جو اپنی گری ہوئی جھونپڑیوں سے آگ کی تمنائیں لیے دانت بجاتے بغلوں میں ہاتھ دیئے' سکڑے ہوئے سردی کا دکھ جھیل رہے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ مثال درست ہے کہ۔۔۔ "گلابی جاڑا بھوکے ننگے لوگوں کی رضائی ہے۔"

رات ڈھلتی رہی' دوپہر گزرے' مرغوں نے اذانیں دینا شروع کیں۔ صدو رات بھر مارے سردی کے سو نہ سکی۔ مرغوں کی اذانیں سن کر اٹھی اس لیے کہ امیروں کے گھر کا اسے اناج پیسنا تھا۔ وہ ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے باہر نکلی ایثرک بھی سردی کے مارے سکڑا ہوا تھا اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ باہر سے ایک دلدوز چیخ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا' وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور دوڑ کر باہر آیا دیکھا تو صدو مٹی میں لوٹ رہی ہے۔ ایثرک نے اپنے دکھوں کے ساتھی کو سہارا دے کر اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا جھونپڑے میں لے آیا۔ "تجھے کیا ہوا؟" ایثرک نے صدو سے بے تابانہ پوچھا۔ "کیوں اتنے زور سے چیخی ہے؟"

"کیا بتاؤں۔ سرد ہوا کے ایک تھپیڑے نے میرے ہوش اڑا دیئے میرے ہاتھ پاؤں جم گئے ہیں" صدو نے اپنا یخ بستہ ہاتھ پھیلایا۔ ایثرک جھونپڑے کے ایک کونے کی طرف گیا جہاں بچے خود میں سمائے' لپٹے ہوئے سو رہے تھے وہاں کچھ جھاڑیاں پڑی تھیں مگر جھونپڑے میں بارش کا پانی در آیا تھا اور وہ سب کی سب بھیگ چکی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر تلاش کیا اور کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ایک تھیلا اٹھا لایا۔ صدو سے پوچھنے لگا۔ "ماچس کہاں رکھی ہے؟" "ماچس میں ایک تیلی رہ گئی تھی کل لڑکے نے آگ جلا کر اپنی فاختہ پکائی۔ میں نے آگ سلگائے رکھنے کے لیے اپلے سلگائے تھے مگر بارش نے بجھا ڈالے۔" صدو کا یہ دکھ بھرا جواب سن کر ایثرک کی آنکھیں بھر آئیں۔ بجبورا" اس نے صدو پر پھٹی پرانی رضائیاں ڈالدیں۔ وہ اپنے اوڑھنے بچھونے صدو پر ڈال کر بولا۔ "اچھا میں اب چلتا ہوں۔ جب تیرے بدن میں کچھ جان پڑے تو اٹھ کر میر کے گھر کا اناج پیس ڈالنا۔ صبح اگر وقت ملے تو میر کے گھر سے لایا ہوا وہ دھان بھی کوٹ کر صاف کر لینا جو اس نے کل بھجوایا ہے۔ میں شاید دیر سے لوٹوں' وہ خواہ مخواہ خفا ہو گا۔"

بارش تھم چکی تھی مگر ہوا غصے میں بپھری ہوئی تھی۔ ایثرک نے گدھے پر جھول کسا۔ اپنے بوجھل جوتے پہنے۔ پرانی کمبل کھینچ لی تاکہ اسے اوڑھ لے مگر چھوٹا چیخ چیخ کر رونے لگا' باپ نے پوچھا۔ "بیٹے کیا بات ہے کیوں روتے ہو۔ کچھ تکلیف تو نہیں۔" وہ بولا "نہیں بابا مجھے تو سردی نے مار ہی ڈالا ہے۔ مجھے کپکپی ہو رہی ہے کچھ اوڑھا دو" اسکے دانت بج رہے تھے۔ ایثرک نہایت پریشان تھا۔ ایک طرف بچے کے رونے اور بلبلانے کی آواز' باہر ہوا کا دل میں اترتا شور۔ اولاد کا پیار اپنی راحت پر غالب رہا پھٹا پرانا کمبل بچے کو اچھی طرح اوڑھا کر' آری کمربند سے اڑس کر وہ باہر آیا۔ وہ ایک قدم اٹھا کر وہ رکا اور اپنی بیوی کو آواز دیکر پوچھنے لگا۔

"ارے صدو! کل جو میں نے تجھے میر کے ہاں سے کھجور مانگ لانے کو کہا تھا۔ کچھ دیا اس نے؟"

"بھئی میں تو منہ کھول کر پشیمان ہی ہو گئی تھی۔ کھجور اس نے کیا دینا تھا صلواتیں سنا کر میری ساتِ پشتوں تک کو
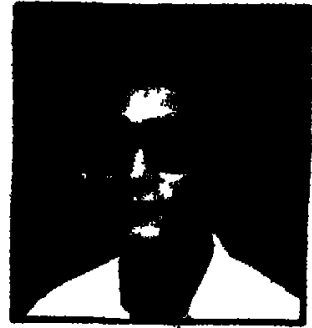
مظفر حنفی

سر پہ یا گھر پہ اثر ہے کوئی
نہ نظر آئے مگر ہے کوئی

نور ہی نور نظر آتا ہے
صرف یہ ہالہ ہے کہ سر ہے کوئی

ہاتھ محفوظ نہیں ہیں اس کے
جس کے ہاتھوں میں ہنر ہے کوئی

سارے زخموں پہ نمک رکھتا ہے
چارہ گر اہلِ نظر ہے کوئی

اتنی ویرانی کہاں سے آئی
دشت بھی آپ کا گھر ہے کوئی

شعر لفظوں سے نہیں بن جاتے
خون میں تیرے شرر ہے کوئی

آج بھی امن رہا بستی میں
اے مظفر یہ خبر ہے کوئی

۲/ارسلہ، یونیورسٹی پروفیسر کوارٹرز، کنکورگاچی، کلکتہ-۵۴

غلام مرتضیٰ راہی

وہ آج بھی نہ ہوا کم جو کل زیادہ تھا
ہزار گھر کے عوض اک محل زیادہ تھا

قرار پائی سراسر غلط صدی کی صدی
شمار کرنے میں کل ایک پل زیادہ تھا

مرے عزیز و اقارب بھی ہو گئے شامل
مرے لئے مری محنت کا پھل زیادہ تھا

ہوئی تھی نشو و نما کاٹ چھانٹ سے جن کی
انھیں درختوں پہ حسنِ عمل زیادہ تھا

ہماری نیکیاں اتریں تو چڑھ گیا دریا
پڑا تھا تہہ میں جو اس کی خلل زیادہ تھا

● راہی منزل ۱۳۵- بی فتح پور- (یوپی) ۲۱۲۶۰۱

والیں۔" صدو نے رضائی کے اندر سے چیخ کر کہا۔

ایٹرک گدھے پر بیٹھا اور جنگل کی راہ لی۔ جسم پر صرف میر کا دیا ہوا ایک پھٹا پرانا پستواء ہوا کے تند و تیز تھپیڑے — اس کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ ہمیشہ جس طرف جایا کرتا اسی سمت ہو لیا۔ صبح کا گیا وہ شام کو لوٹ آتا مگر اب کی بار وہ گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔

صبح ہوئی صدو نے چکی پیس کر ایک طرف دھکیل دی۔ اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں ساس کے لحاف پر جمائیں۔ بڑھیا ابھی تک گٹھری بنی پڑی ہوئی تھی اسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ اتنی دیر تک کبھی بھی نہیں سوئی۔ وہ اپنی ساس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے لگی۔ مگر وہ تو ایسا سوئی تھی کہ جاگنے سے رہی — وہ اپنی پھٹی پرانی لحاف میں کب کی دوسری دنیا کو سدھار چکی تھی۔ صدو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی ہوش اڑا دینے والی چیخ فضا میں گونجنے لگی۔ پاس پڑوس کے لوگ سمٹ کر آ گئے۔ ارے اب کے بڑھیا کو کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کے شور میں صدو کو کہتے ہوئے سنا گیا۔ "ہونا ہونا کیا تھا۔ وہی ہوا جو غریبوں کا مقدر ہے۔ ناداری کا دکھ کوئی کب تک برداشت کرے۔ اسے سردی نے ہم سے چھین لیا ہے۔"

ایٹرک کتنا بدنصیب تھا کہ اسے ماں کا آخری دیدار بھی نہیں مل سکا۔ خدا ترس لوگوں نے بڑھیا کا کفن دفن کیا اور اپنے اپنے گھروں کو ہو لئے۔ صدو سر پہ ہاتھ رکھے بین کرتی رہی۔ ابھی ساس کی موت کا غبار کم نہیں ہوا تھا کہ ایک پڑوسن دوڑتی ہوئی آئی اور چیخ کر کہنے لگی۔ "بدقسمت صدو افسوس تیری حالت پر، تو بڑھیا کے لئے بین کر رہی ہے اور موت نے تجھ سے تیرے بچوں کے سر کا سایہ بھی چھین لیا ہے۔ ایٹرک شدید سردی میں سکڑ کر بھری دنیا میں تجھے اکیلا چھوڑ گیا۔ ایک قافلے کو گزرتے ہوئے راستے میں اس کی لاش پڑی ملی ہے وہ اسے اٹھا لائے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ صدو پر گویا بجلی گری۔ اس کا گلا رندھ گیا اور اس کی آنکھیں دھندلا گئیں ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ گئے۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتوں نے اسے اٹھا کر ایک کونے میں لٹا دیا۔

ہر سال اسی طرح سردیوں کا بے رحم موسم آتا ہے۔ اسی طرح ہوا پر شور ہو جاتی ہے اولے تڑ تڑ برستے ہیں۔ اور اسی طرح درختوں میں سنسناتی ہوائیں ایٹرک کا سوگ مناتی ہیں۔ اور اسی طرح نہ جانے کتنی صدوئیں بیوہ ہو جاتی ہیں ہزاروں معصوم بچے غربت کا دکھ سہنے کے لیے یتیم ہو جاتے ہیں۔ ❁

——— بقیہ صفحہ ۹ حبیب بنام سرکار ———

اگلی صبح کو جب میں دفتر جانے لگا تو بازار میں ایک جگہ لوگوں کا مجمع دیکھا۔ میں بھی صورتحال کا جائزہ لینے سائیکل سے اتر کر مجمع کے قریب پہنچا۔ میں نے ایک شخص سے دریافت کیا تو وہ بولا۔ "کوئی مسافر بیچارہ رات ٹھٹھر کر مرگیا ہے" — میں جب لاش کے قریب پہنچا تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اوہ یہ تو حبیب ملا ہے۔" اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے کمیٹی کے عملے نے حبیب ملا کی لاش اٹھا کر ٹرک میں ڈالی اور ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔ میں دفتر پہنچا تو صاحب کے دفتر کے چپڑاسی کی آواز بلند ہوئی وہ صدائیں دے رہا تھا "حبیب بنام سرکار"

اور میں نے دل میں کہا اب حبیب ملا کا سرکار کے پاس کون سا مقدمہ رہ گیا ہے۔ ❁

——— بقیہ صفحہ ۲۲ — آزادی کی قیمت ———

رہنے کے لئے یہ گھر کیوں بنایا گیا اور یونہی وقت اس گھر کے باقی لوگوں کو بھی ان کی قبروں میں دھکیل دے گا، دنیا کے دوسرے حصوں میں تمام یادوں کی راہ مسدود کرتے اور ماضی کے تمام واقعات کو مارتے ہوئے، لیکن ایک بات جو اس گھر میں باقی رہے گی وہ آزادی کی سچی علامت بن جائے گی۔ اس کے مکیں چلے جائیں گے، فوج ختم ہو جائے گی لیکن وہ بات رہ جائے گی کہ اس سربفلک پہاڑوں کے سایوں میں اور وہ ہے آزادی کی سچی علامت۔ ❁

شجاع خاور

گھر میں بے چینی ہو تو اگلے سفر کی سوچنا
پھر سفر ناکام ہو جائے تو گھر کی سوچنا

ہجر میں امکان لاکھ وصل صرف اک واقعہ
وسعتِ صحرا میں کیا دیوار و در کی سوچنا

یعنی گھر اور دشت دونوں لازم و ملزوم ہیں
قاعدہ یہ ہے اِدھر رہنا اُدھر کی سوچنا

زندگی بھر زندہ رہنے کی یہی ترکیب ہے
اس طرف جانا نہیں بالکل جدھر کی سوچنا

تم شجاع خاور ہو دنیادار اور میں جان دار
میں تو بس آہیں بھروں گا تم اثر کی سوچنا

● ۱۔پارک لین، ماڈل ٹاؤن پارک، نئی دہلی۔۱

نجیب فاضل قصہ کورک
مسعود اختر شیخ

موثر ترین ہتھیار

"ماں' آپ کی عمر کتنی ہے؟"
"ستر برس۔"
"گویا جنگ آزادی کے دوران آپ بیس اکیس سال کی تھیں۔"
"ظاہر ہے۔"
"تب سے آپ اس گاؤں سے باہر نہیں گئیں؟"
"کبھی نہیں۔"
"یعنی پورے پچاس سال سے آپ نے کبھی اس گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا؟"
"کبھی نہیں۔"
"دنیا تو اس اثنا میں بڑی بدل گئی ہے۔"
"سنا تو یہی ہے۔"
"آپ نے دوبارہ شادی بھی نہیں کی؟"
"جی نہیں۔"
"میں آپ کو مسلسل سوالات سے تنگ تو نہیں کر رہا؟"
"استغفراللہ۔ تنگ کرنے کی کیا بات ہے۔"
"دراصل اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ناں۔ آپ خود تو کچھ بتاتی نہیں ہیں' کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ آپ خود ہی سب کچھ بتا دیں؟"
"جی نہیں چاہتا۔"
"اچھا' تو آپ کا جی کیا چاہتا ہے؟"
"یہ کہ میں پڑھتی رہوں۔"
"کیا پڑھتی رہتی ہیں آپ؟"
"قرآن پاک!"
"کیا آپ لکھ پڑھ لیتی ہیں؟"
"صرف قرآن پاک پڑھ سکتی ہوں۔"
"کس نے سکھایا تھا؟"
"میرے والد نے۔"
"لیکن جو قرآن پڑھ سکتا ہے وہ ترکی زبان بھی تو پڑھ سکتا ہے' اگر وہ پرانے رسم الخط میں لکھی ہو تو۔"
"میں پرانی ترکی نہیں پڑھ سکتی۔ میرے لئے اللہ کا کلام جو قرآن مجید میں ہے وہی پڑھنا آسان ہے۔ دوسری لکھائی مجھے کیڑے مکوڑوں کی طرح لگتی ہے۔"
"کیا آپ کے میاں کی طرح آپ کے والد بھی "زیبک" تھے؟"
"وہ گاؤں کی مسجد کے امام تھے اس زمانے میں "زیبک" کوئی الگ قبیلہ نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں کوئی

نوجوان کسی "زیبک" سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔"

"اور اب؟"

"اب تو بوڑھی ہی ہے۔"

"آپ کے والد کہاں فوت ہوئے تھے؟"

"وہ جنگ میں محاذ کے محاذ پر بھیجے گئے تھے۔ وہاں سے کبھی واپس نہ لوٹے۔"

"آپ کے لئے والد نے کیا کچھ چھوڑا؟"

"وہ کونے میں سبز ریشمی کپڑے میں لپٹی چیز دیکھ رہے ہیں آپ؟ وہ قرآن پاک ہے جو میرے والد صاحب نے ورثے میں چھوڑا تھا۔ ساتھ ہی ایک نصیحت بھی۔"

"کیا تھی وہ نصیحت؟"

"کبھی اس کتاب سے جدا نہ ہونا۔"

"لیکن آپ تو اس وقت چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھیں۔"

"جی ہاں۔"

"پھر آپ کی شادی ہو گئی؟"

"جب میں انیس برس کی تھی تو میرے ماموں کے بیٹے سے میری شادی کر دی گئی۔ یہ اس سال کی بات ہے جب یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کیا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ ادھر آپہنچے اور ہمارے گاؤں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان کی ایک پلٹن تھی۔"

"خالی جایئے۔ پھر کیا ہوا؟"

"کیا بتاؤں؟ آپ پوچھیں میں جواب دوں گی۔ ویسے تو آپ نے میرے بارے میں سب کچھ سن ہی لیا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے' لیکن میں خود آپ کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔ لوگ تو ہر بات میں اتنا مرچ مسالہ لگا کر بیان کرتے ہیں کہ حقیقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ خدا جانے لوگوں نے میرے بارے میں کیا قصے کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں آپ نے اکیلے دشمن کی ایک پوری پلٹن کو مار بھگایا تھا۔"

"نہیں' نہیں برخوردار۔ مجھ میں اتنی طاقت بھلا کہاں سے آئی تھی یہ تو قرآن پاک کی طاقت تھی جس نے دشمن کو بھگایا تھا۔"

"قرآن پاک کی طاقت؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے اگر میری چھاتی سے قرآن نہ بندھا ہوتا تو میں یہ سب کچھ کر سکتی تھی جو میں نے کیا؟"

"لیکن اماں' قرآن وہ تو نہیں کر سکتا نا جو ایک رائفل یا بندوق کر سکتی ہے۔"

"قرآن پاک کے ایک حرف کا مقابلہ ایک لاکھ بندوقیں بھی نہیں کر سکتیں۔"

"ذرا کھل کے بتاؤ اماں' یہ سارا قصہ کیسے ہوا؟"

"ہماری شادی کو ابھی تین ہی ماہ ہوئے تھے کہ یونانیوں نے میرے میاں کو مسجد کے صحن میں شہید کر دیا۔"

"کس بنا پر؟"

"ان کا کہنا تھا کہ میرے میاں نے ایک یونانی سپاہی کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا تھا کیونکہ وہ سپاہی ہماری جوان لڑکیوں کی بے حرمتی کیا کرتا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر میں اٹھی اور سیدھی یونانی کمانڈر کے پاس پہنچی۔ چلنے سے پہلے میں نے اپنی چادر اوڑھی اور قرآن پاک چھاتی سے لگا لیا۔ کمانڈر اس وقت بازار پولیس کی پرانی چوکی میں تھا۔ وہ چوکی اس گراؤنڈ والی

عرفان صدیقی

سفر طویل ہے اگلا قدم اٹھاتا ہوں
میں پھر سے گم شدگاں کے علم اٹھاتا ہوں

سر زمیں جو کہیں کوئی حشر اٹھتا ہے
تو میں ہی سر پسِ خوابِ عدم اٹھاتا ہوں

مجھے سراب دکھاتا ہے روز عرصۂ خاک
میں روز فائدۂ آب و نم اٹھاتا ہوں

جو شوق ہو تو عجب سیر ہے بکھرنا بھی
ہوا کے ساتھ بہت لطفِ رم اٹھاتا ہوں

جہاں سروں کو جھکاتے ہیں کج کلاہ وہاں
میں اور طرۂ پُر پیچ و خم اٹھاتا ہوں

نیاز مند تو دنیا نہیں کسی کی مگر
وہ جانتی ہے کہ میں ناز کم اٹھاتا ہوں

● عظمت منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

جگہ پر ہوتی تھی' اس نے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے' بوٹوں سمیت اپنے پاؤں سامنے میز پر ٹکائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی سرپا کا ایک مقامی یونانی باشندہ بیٹھا تھا۔ یہ ترجمان تھا۔"

"لیکن اماں' آپ کو وہاں جانے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"ہمت؟ قرآن کا حکم یہی تھا۔ کمانڈر نے مجھ سے پوچھا "کیا بات ہے؟" میں نے کہا "میں اپنے خاوند کی ہلاکت کے بارے میں شکایت لے کر آئی ہوں۔" اس نے پوچھا "شکایت کس کے خلاف ہے؟" میں نے کہا' "تمہارے خلاف" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ٹانگیں میز سے ہٹا لیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا دانت نکال کر میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگا "کیا حکم ہے ہمارے لئے؟" میں نے مضبوطی سے قرآن پاک چھاتی سے لگا لیا۔"

"پھر کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا اپنی فوجیں اکٹھی کرو اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔"

"حیرت ہے!"

"کمانڈر اس قدر حیران ہوا کہ اسے آگے سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ پڑی تھوڑے وقفے کے بعد چلا کر بولا: یہ چھاتی سے کیا دبا رکھا ہے تم نے اتنی مضبوطی سے؟" میں نے کہا یہ دنیا کا سب سے زبردست ہتھیار ہے۔ اتنا زبردست کہ ایک لمحے میں تم سب کو خاکستر کر سکتا ہے۔"

"کمال ہے اماں!"

"سنتے ہی ترجمان "بم' بم" کہہ کر چلانے لگا۔"

"یقین نہیں آتا' اماں۔"

"بیٹا' دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن پر آدمی کو یقین نہیں آتا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کمانڈر خوف سے بوکھلا اٹھا۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ دونوں کی آنکھیں مجھ پر اور میرے خفیہ ہتھیار پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دروازے کی طرف کھسک کر باہر نکل گئے۔ کمانڈر سیدھا اپنے سپاہیوں کی طرف گیا جو موجودہ گراؤنڈ والی جگہ پر جمع تھے۔ ترجمان بھی کمر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔"

"انہوں نے لپک کر آپ سے وہ "بم" چھین کیوں نہ لیا؟"

"یہ اتنی آسان بات نہ تھی۔ انہیں یہ بھی تو ڈر تھا کہ کہیں ہاتھا پائی میں بم گر کر پھٹ جائے تو چوکی سمیت تمام سپاہیوں کے پرخچے اڑ سکتے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کمانڈر نے یونانی زبان میں اپنے سپاہیوں کو حکم سنایا۔ سپاہی کمانڈر کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے کہ اچانک موذن کی بھرپور آواز گونج اٹھی۔ وہ اذان دے رہا تھا۔ میرے خاوند کا تابوت جنازہ پڑھنے کے لئے تیار پڑا تھا۔ اتنے میں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ یہ ترک گوریلا فوج کے سپاہی تھے۔ جنہیں اس دوران سارے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ انہوں نے پہاڑی ٹیلے پر مورچے سنبھال کر وہاں سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ یونانی سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ انہیں کچھ سمجھ نہ آیا کیا کریں۔ میں کمرے سے نکلی اور تیزی سے گراؤنڈ کی طرف بھاگی۔ کمانڈر نے چلا کر اپنے سپاہیوں کو کوئی حکم دیا۔ یہ حکم سنتے ہی سارے یونانی فوجی جدھر راہ ملی ادھر بھاگنا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں دشمنوں سے خالی ہو گیا پھر کبھی انہوں نے ادھر کا رخ نہ کیا۔"

"تو گویا ہماری جنگ آزادی کے دوران قرآن پاک دوسرے تمام ہتھیاروں سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔"

"بیٹا' وہ جنگ تو ہم نے جیتی ہی قرآن پاک کی طاقت سے تھی۔" ❖

مصور سبزواری
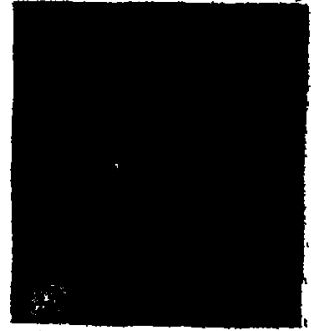
عطا کے ہاتھ تو احسان بھی جتاتے ہیں
فقیر جھولی میں سوراخ ہوتے جاتے ہیں

گھنے دکھوں کے تناظر میں بیٹھ کر سر شام
فریب چارہ گری خوب راس آتے ہیں

نہیں اگاتے شرارت کی فصلیں اب بچے
اداسیوں کے نئے ذائقے اگاتے ہیں

اشارہ وقت کا ہے لمحے کو سلام کرو
غلام بھی کبھی مسند پہ بیٹھ جاتے ہیں

قلیل سچ کو کروں کس طرح میں سچ ثابت
بلند بانگ تو مجمع بڑا لگاتے ہیں

ہیں ایک ٹوٹتے تارے کے ہم سفر ہم لوگ
کہاں کے خواب کہاں پر بسائے جاتے ہیں

پوسٹ آفس۔ نوح ضلع گڑگاؤں،
۱۲۲۰۰۱ (ہریانہ)

کرشن کمار طور

✽

یہاں نہ واقف دشمن نہ آشنا معلوم
کبھی تو ایسے کٹی زیست اب ہوا معلوم

جہاں میں ہونا نہ ہونا تمام یکساں ہے
یہاں پہ کیا نہیں معلوم اور کیا معلوم

بنائے رکھا ہے خود کو ہدف زمانے کا
خبر نہیں کہ ہے کچھ اس کے بھی سوا معلوم

یہی بہت ہے کہ اس سے کوئی سلوک تو ہے
وہ مہرباں ہے کہ نامہرباں یہ کیا معلوم

میں خود کو دیکھوں نہ دیکھوں مگر پتہ تو چلے
کہاں پہ بے خبری ہے کہاں ہے کیا معلوم

ذرا سا ہاتھ لگائیں تو کشف قلب کریں
چھپا ہے راکھ کی ڈھیری میں کیا خدا معلوم

عجب طرح کا ہے انصاف اس جہاں میں طور
کہ فردِ جرم تو پوشیدہ اور سزا معلوم

● ۱۱/۱۳۴ - خان یارا روڈ، دھرم شالہ - ۱۷۶۲۱۵ - ہماچل پردیش

جعفر الخلیلی
انور شاہدی

آزادی کی قیمت

لبنانی گاؤں جبہ سے نکلتے وقت ہم نے وقت اور فاصلے دونوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اور خوراک کی قلیل مقدار اپنے ہمراہ لئے اس ہیبت ناک سربفلک پہاڑ کو سر کرنے کی ٹھانی' جو خدا کے ایک مقدس بزرگ سلی کے مزار کو جاتے ہوئے راہ میں پڑتا تھا۔ سلی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ خدا کے برگزیدہ ولیوں میں سے ایک تھا' جو اپنے پاس تک پہنچنے والے مسافروں کو اپنی عنایات سے نواز کر انہیں پہاڑ کی دشوار گذار چڑھائی کی مشقت کے بعد ہنستے کھیلتے ہوئے ایک اعتماد کے ساتھ واپس بھیج دیتا اور اگر ایسا کسی شخص میں اعتقاد کی وجہ سے نہ ہوتا تو یہ یقیناً چاروں طرف پھیلے ہوئے حسین مناظر کا مرہون منت ہوگا جو سلی کے پہاڑ کے اطراف میں موجود تھے۔

مجھے ایک ہی وقت میں تھکن اور بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ پرانے وقتوں میں بزرگ شیخ محمد الحسین کاشف الغطاء کو بھی اس پہاڑ کو سر کرتے ہوئے ایسا ہی محسوس ہوا اور اس وقت سے اس کی کہی ہوئی ایک کہاوت آج تک چلی آرہی ہے' جو ہمیشہ کسی بھی ایسے شخص کو یاد آتی ہے جو اس پہاڑ پر چڑھنے کا ارادہ رکھتا ہو یا بزرگ سلی کے نام کے بارے میں سوچتا ہو "اے سلی! تم اپنی عنایات کے صلے میں کس قدر مشقت بہم پہنچاتے ہو۔"

بالآخر محنت اور جدوجہد کے بعد رسد کے سامان کو ختم کرتے ہوئے ہم لوگ سلی تک پہنچ گئے لیکن میرے ساتھیوں کو احساس ہوگیا کہ ہمیں نزدیک ترین آبادی تک واپس جانے یا چند گھنٹوں کی بھوک برداشت کرنے کے قابل بھی نہ تھا لہٰذا انہوں نے معاملہ پر خاص سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد دور ہمیں ایک شخص باہر کو نکلی ہوئی چٹان پر ایک لکڑی کے سہارے بل کھاتے ہوئے راستے پر جہاں جانور بھی چلتے ہوئے گرنے کا خوف کھاتے' چڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے آگے اس کی بکری تھی جسے وہ اوپر کی طرف دھکیل رہا تھا' فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ کوئی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی لیکن اس گونج سے جو پہاڑوں میں آواز کو عمدہ اور بھاری بناتی ہے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے ساتھیوں میں سے ایک نے اسے پکارنا شروع کر دیا۔

"اے شخص سنو' سنو"

کچھ دیر بعد گونجتی ہوئی زیادہ گمبھیر آواز تھی "اے' اے' اے'

"میں نہیں آسکتا۔ میں اپنی بکری کا کیا کروں گا؟؟"

"خدا کے واسطے یہاں آؤ"

چیخوں کے تبادلے میں جو کئی منٹ جاری رہے اور جو ان جملوں پر مشتمل تھے "یہاں آؤ"۔ "میں نہیں آسکتا" اس شخص نے آخر کار اپنی بکری کو چھوڑ دیا۔۔۔۔ خدا جانے کہاں چھوڑا اور ایک ایسے رستے جو ہم سے چٹانوں کے باعث چھپا ہوا تھا' ہم تک پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سلی کے علاقے میں ہم لوگوں کے درمیان تھا۔ اس نے بول چال میں زیادہ وقت صرف نہ کیا اور میرے ساتھیوں کو یہ سمجھانے میں کہ میں ایک اجنبی بھوکا اور تھکا ہوا مہمان ہوں۔ اور اب یہ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ مہمان نوازی کے فرائض انجام دے' کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ جلد ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ ہم سب کو اس کے گھر پہنچنا چاہیئے' جسے بہت سے لوگوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن جو اس کے بقول یہاں سے صرف پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔

اب ہم لوگ اس شخص کے پیچھے پیچھے چل پڑے' جس نے نیازمندانہ طور پر اپنی گھوڑی مجھے دے دی تھی۔ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم اونچی چوٹیوں پر چڑھے اور دل کپکپا دینے والی تنگ گھاٹیوں میں سے گزرے۔ کئی بار تو یوں ہوا کہ بس ہم گرتے گرتے بچے (کیونکہ پہاڑی پر چڑھتے اور اترتے ہوئے مڑتے بل کھاتے راستوں پر (دل میں گر جانے کا خوف لئے) ان راستوں پر جن کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ بقول ابوروا کے یہ وہ راستے تھے' جو کبھی بھی انسان کی رہ گزر نہ رہے تھے اور جہاں جانور بھی کم ہی نظر آتا ہے۔

آخر کار میں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کے لئے کہا' لیکن واپسی کا رستہ جیسا کہ انہوں نے بتایا' اس رستے کے مقابلے جو ہمارے سامنے رہ گیا تھا' (کہ ابوروا کے بقول اب ہم اس کے گھر کے قریب پہنچ ہی چکے تھے) کہیں زیادہ مشکل ہوگا۔

مجھ مہتوں میں دو گھنٹے گزر گئے تھے' جنہیں کبھی نہیں بھلایا جا سکتا حالانکہ زندگی میں بہت سی باتیں بھلا دی جاتی ہیں۔

ان مسافت کے لمحوں میں ہم میں سے ہر ایک شخص تھکے ہارے قدموں کے ساتھ تقریباً ایک بار ضرور منہ کھولے گہرے کھنڈوں یا تنگ گھاٹیوں میں گرنے اور اپنی گردن تڑوانے سے بچا ہوگا۔ راستہ مزید دشوار گزار ہوگیا تھا حتیٰ کہ اس پر حرکت' ان لوگوں کے لئے بھی جو پہاڑوں پر چڑھنے کے عادی ہوں یا ایسے کھلاڑیوں کے لئے جو اس کے طول و عرض کو بآسانی سر کر لیتے ہوں' اسے عبور کرنا دشوار ہوگا۔

ابوروا کو آخر یہاں کیا بات لائی ہوگی' جو اس نے اس دور افتادہ تھا اور صحرائی علاقے میں رہنا پسند کیا' جہاں پانی کی کمی کے باعث نہ پرندے تھے نہ ہی تارک الدنیا ولی۔ آخر یہ سب جدوجہد کیوں؟ انسانیت سے اس قدر دور رہنے کی کوشش آخر کس لئے؟ یہ وہ خیالات تھے جو میرے ذہن میں گردش میں تھے اور میں کسی ایسے موقع کا منتظر تھا' جو اس راز پر سے پردہ اٹھا سکتا۔ میرے نزدیک ایک ساتھی تھا جس سے دوسروں کی نسبت میں زیادہ بے تکلف تھا' یہی سوچتے ہوئے میں نے یہ سوالات اس سے کر دیئے لیکن وہ اس سے زیادہ نہ بتا سکا کہ "ابوروا یہاں اپنی پیدائش کے وقت سے موجود ہے اور اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ چونکہ یہاں رہتے ہوئے وہ چوروں اور خوفناک جانوروں کی زد سے باہر ہے اور پھر اس کے علاوہ تنہا رہنا بعض لوگوں کو پسند ہوتا ہے جس سے وہ شہری زندگی کے مقابلے میں زیادہ خوشی اور سکون پاتے ہیں۔" یوں میرے ساتھی نے ابوروا کی پسند کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے خود کو الگ تھلگ رکھنے کے فلسفے کے بارے میں اپنی رائے دے دی تھی۔

اس وقت تک ہم ایک بڑی پہاڑی کے گرد پہنچ چکے تھے جو گرینائٹ کی بڑی چٹان سے بنی تھی کہ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں کانوں تک آنے لگیں۔ فوراً ہی ابوروا نے کچھ کہتے ہوئے شور مچایا جس کا ان بھونکتے ہوئے کتوں پر جادوئی اثر ہوا اور بیکی غراہٹوں میں پیچھے کو ہٹ گئے اور غراہٹیں بھی بتدریج ختم ہو گئیں۔ یہ تین بلند قامت بالوں سے بھرے ہوئے کتے تھے' جن کی آنکھیں شیر کی سی پھرتی اور مکاری کو ظاہر کرتی تھیں۔ ہم ابوروا کے گھر کے سامنے تھے'

یہ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کبھی یہ ایک بہت بڑا غار رہا ہوگا' جس پر معماروں نے محنت کر کے اسے گھر کی شکل دے دی تھی' اس میں گھر کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ گھر کے ساتھ ہی بکریوں کا ایک باڑہ بھی تھا جس کا آدھا حصہ پہاڑ کے اندر تک چلا گیا تھا اور دوسرا حصہ کھلے آسمان کو تکتا تھا' اسی باڑے کے ساتھ مرغیوں کے لئے بھی ایک کھلی جگہ تھی اور پھر پانی کے لئے دو نالیاں تھیں' ایک مرغیوں' بکریوں اور کتوں کے لئے تھی اور دوسری خود گھر کے مکینوں کے واسطے۔

یہ نالیاں کچھ اس انداز میں بنائی گئی تھیں کہ کسی بھی صورت میں بارش کا ایک قطرہ یا پہاڑیوں سے بہتا ہوا سیلابی پانی ان سے بچ کر نہ جا سکتا تھا اور جب یہ نالیاں بھر جاتیں تو بقایا پانی آگے بہہ کر چٹان کے ساتھ جمع ہو جاتا جہاں سے گھر کے سالانہ استعمال کے بعد وہ نیچے وادی میں شور مچاتا ہوا گرتا۔

کسی بھی چیز کے علاوہ یہ گھر قرون وسطیٰ کے قلعوں کی سی مشابہت رکھتا تھا اور مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ محفوظ ہی نہیں بلکہ دشوار گزار راستے کے باعث ضرورت سے زیادہ ناقابل تسخیر بھی تھا۔ ایسا لگتا

یعقوب راہی

مقتلِ روزگار، تیرا تھا
جس کو دیکھا شکار تیرا تھا

جبرِ دنیا بلاوجہ بدنام
ہر نفس اختیار تیرا تھا

نیند ٹوٹی نہ ہوش ہی آیا
جانے کیسا خمار تیرا تھا

بات بے بات سب سے الجھا میں
دل میں سارا غبار تیرا تھا

دشمنوں کا حساب کیا رکھتا؟
دوستوں میں شمار تیرا تھا

۱۰۱- ارین اپارٹمنٹ، رکشی پارک ہاؤسنگ کمپلیکس، نیا نگر، میرا روڈ۔ ضلع تھانہ۔

شمیم انور

❋

بھول بھلیوں جیسی گہری کچھ اتنی تہہ داری ہے
چابی جس کی گم ہو جائے وہ ایسی الماری ہے

شیخ و برہمن کے سینوں میں شوق اجارہ داری ہے
مسجد مندر بنوانا بھی جیسے دنیا داری ہے

اور کنویں سے پانی بھر کر لانے والا جانے ہے
صبح کے گھر تک شام کو لانے میں کتنی دشواری ہے

کس کو کتنا زخم لگا ہے کس نے کیا کھویا پایا ہے
پوچھو مت تم پڑھنا سیکھو ہر چہرہ اخباری ہے

جرم لگانے والوں نے تو حلف لیا سچائی کا
جرم ہوا ہے ثابت لیکن مجرم تو انکاری ہے

ہم ساحل کے رہنے والے کیسے بولیں میٹھے بول
چاروں اور اک تلخ ہوا ہے اور سمندر کھاری ہے

جو ہر چننے والو اپنے ہاتھوں پر قابو رکھنا
اجلی آنکھوں کے دامن میں لالچ کی چنگاری ہے

پتھر کو پگھلا کر شیشے کی قندیل بنائی تھی
ہنگامہ تھا دل دو دل کا لیکن ضرب تو کاری ہے

سبز پری کا قصہ کہتے نانی اماں ڈرتی ہیں
بچپن کے کچے چہرے پر پختہ نقش نگاری ہے

● ۲۰۳ اپر چیت پور روڈ — کلکتہ۔ ۷۳

تھا کہ یہ خود بنجر زمین سے بنایا گیا تھا۔ زمین جس پر سوائے چٹانوں یا معمولی قسم کی جھاڑیوں کے کچھ نہ تھا جو میلوں تک اس گھر کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھیں۔

ابو روا کا خاندان ایک بیوی، دو بیٹیوں اور ایک بیٹے جو سب سے بڑا تھا، پر مشتمل تھا۔ ان کے علاوہ تقریباً تیس بکریوں کا ریوڑ کچھ مرغیاں اور تین کتے بھی تھے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے کتوں کو چھوڑ کر نیچے کسی نزدیکی منڈی تک پنیر، دہی، بکریوں کا اون اٹھائے اور چوزے بیچنے چلا جاتا اور وہاں سے انہیں بیچ کر ترکاریاں، کپڑا اور ضرورت کا دوسرا سامان جس کی کبھی احتیاج ہوتی لے آتا۔ ان برسوں میں ابو روا سنی کے مزار سے گزرنے کا عادی ہو چکا تھا اور اس نے وہاں ملنے والی بخششوں کا بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح بعض اوقات گھر واپس پہنچتے ہوئے کچھ خوراک کے سامان کے ساتھ موم بتیاں بھی لے آتا۔ موجودہ صورتحال میں وہ نہیں جان سکتا تھا کہ قسمت اس کے ہاں ان مہمانوں کو لے آئے گی جو اس وقت اس کے ہمراہ تھے۔ درحقیقت کسی شبے کے بغیر یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کہ مزار پر آئے ہوئے زائرین میں سے کسی نے اس کے گھر تک آکر اس سے مہمان نوازی کا مطالبہ کیا تھا۔

پس ہم، یہ بحث کرتے ہوئے کہ کیوں ابو روا نے اس دور افتادہ بنجر زمین میں خود کو انسانیت سے الگ تھلگ رکھنے کا فیصلہ کیا بیٹھ گئے تھے، جبکہ وہ خود بول اٹھا۔

"یہ میں نہیں تھا جس نے اس دور افتادہ جگہ میں رہنے کا ارادہ کیا۔ درحقیقت میں اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا، جس روز میرا باپ کچھ معماروں اور مزدوروں کو لے کر یہاں آیا، جنہوں نے اس پہاڑ میں اس کا مکان بنانا تھا تاکہ وہ انسانی زندگی سے الگ رہ سکے۔

وہ میری ماں کو جو حاملہ تھی، پہلے ہی یہاں لا چکا تھا ان کے ہمراہ میری پھوپھی اور میری چھوٹی بہن بھی تھی اور میرے باپ کا کتا جو گھر کی نگرانی کے لئے تھا۔ میرا باپ جوان تری تھا۔ وہ ایک توانا اور بھرپور صحت کا ایسا نمونہ تھا کہ اس کی طاقت ضرب المثل بن چکی تھی، ہر قسم کے کھیلوں، مثلاً گھڑ سواری، تیراکی، نشانہ بازی، اور شکار وغیرہ میں اس کی مشاقی نے اسے ایک بڑے علاقے میں آزادی کے متوالوں کے لئے مثالی بنا دیا تھا۔ درحقیقت اس کا نام ان لوگوں میں سرفہرست تھا جو فوج کی ملازمت سے پانچ سال یا اس سے زیادہ مدت میں بھاگے ہوئے تھے۔ لیکن کون میرے باپ کی گرد کو پہنچ سکتا تھا، اور اسے پکڑ کر شہر لے جاتا۔ وہ کبھی یہاں ہوتا کبھی وہاں، کبھی ایک گاؤں میں تو کبھی دوسرے میں اور فوج ہمیشہ اس کی تلاش میں کسی مقصد کے بغیر اس کے پیچھے لگی رہتی۔ میرا باپ جانتا تھا کہ اگر فوج اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئی تو شام اور لبنان میں اس کے آزاد شب و روز کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ ان وقتوں میں جن لوگوں کو فوج میں جبری بھرتی کر لیا جاتا تھا، مشکل ہی سے وہ کبھی واپس لوٹتے یا لوگ ان کے بارے میں کچھ سنتے میرے باپ کو اپنے ملک اس کے پہاڑوں، وادیوں اور اس کی زمینوں اور آموں کے جنگلوں سے والہانہ عشق تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ فوج سے اتنی آسانی سے جان بچائے پھرتا تھا اور اپنے تعاقب میں آنے والوں پر ہنسا کرتا ۔۔۔ آخر کار میرے باپ کی میری ماں سے شادی ہو گئی اور میری ماں حاملہ ہو گئی۔ وہ ابھی تک فوج سے بھاگا ہوا تھا اور اس شادی نے اس کے فوج سے بھاگے رہنے میں تحریک کا کام دیا چونکہ ایک طرف وہ بیوی سے محبت میں جتلا تھا۔ لہٰذا اس بات نے اسے ان لوگوں کی طرف سے جو مسلسل اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے قدرے کم محتاط بنا دیا تھا۔ پس ایک رات کو جب وہ اپنے گھر کو چھوڑنے والا تھا فوج نے بغیر اطلاع دیئے اسے گرفتار کر لیا اور وہاں سے اسے بیروت پہنچا دیا، یوں وہ میری ماں کو جس کے بطن میں، اس وقت میں پرورش پا رہا تھا، چھوڑ کر چلا گیا کچھ دن گزر گئے اور میرا باپ ان لوگوں میں شامل ہو گیا، جنہیں بیروت سے استنبول جانے والے دخانی جہاز میں سوار ہونا تھا، جہاں سے آخر کار سپاہیوں کی حیثیت میں انہیں سلطنت عثمانیہ کی وسیع عملداری میں بھیج دیا جاتا اور دوبارہ ان کے بارے میں کوئی بھی سن نہ پاتا ۔۔۔ لیکن میرا باپ جو آزادی کے مفہوم کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ آزادی کس لئے ہوتی ہے، فطرت سے عطا کردہ ذہنی اور جسمانی تحائف کے باوجود اپنی اس بیچارگی کی کیفیت اور قسمت پر ان عطیوں کے باوجود اداس تھا۔

رات بمشکل شروع ہوئی تھی اور دخانی جہاز کو چلے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ اسے بیت

عتیق اللہ

دلوں میں آس بھی رکھ، لب پہ اک دعا بھی رکھ
بجھے دنوں کے لئے کچھ نہ کچھ بچا بھی رکھ

ہوا وسمت سے خالی نہیں کوئی پہلو
سفر تمام نہ کر، قصد دوسرا بھی رکھ

گریز کرتا ہوا مشت بھر سماں ہے نصیب
زباں پہ مشعلیں دھر، ہاتھ میں صدا بھی رکھ

ابھی ابھی میں بدل جائیں گے سبھی منظر
نظر سے صرف نہ کر، کوئی سلسلہ بھی رکھ

کھلا نہ چھوڑ گریباں قمیص آلودہ
کوئی تعلق بے خواب، خواب سا بھی رکھ

۲۲۱-غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورہ دہلی ۳۴

الاؤ میں سے لکڑی کا ایک تختہ ہاتھ لگ گیا' جسے اس نے علیحدہ کرکے سمندر میں پھینکا اور اس کے پیچھے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔۔۔ کچھ دیر تیرنے کے بعد وہ اس بہتے ہوئے تختے تک پہنچ گیا لیکن چونکہ ہوا مخالف تھی اور سمندر طوفانی تھا اس لیے ساحل تک پہنچنے میں دس گھنٹے لگ گئے' دس گھنٹے جن میں اس نے اپنی تمام تر قوت کو صرف کر دیا' یوں میرا باپ دو مہینوں کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ اپنی دلہن کے پاس واپس آگیا اور پہلا کام جو اس نے کیا وہ ان دشوار گزار پہاڑوں میں چند کام کرنے والے آدمیوں کو لانا تھا' جنہوں نے اس کے لئے نزدیک ترین آبادی سے جو تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھی اس کا گھر بنا دیا' کوئی بھی جو میرے باپ کی باتوں کو سنتا یا اس سے باتیں کرتا آزادی پر ایسا لیکچر سنتا جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ سنا تھا اور سننے والا میرے باپ کی باتوں میں اور اس کی ہر ہر حرکت میں آزادی کی نمایاں گرفت کو دیکھتا۔ اس نے اس بنجر اور دور افتادہ جگہ کو ان محدود امکانات کے ساتھ خود کو' محض فوجی وردی' تھکا دینے والی پریڈوں اور مشقت آمیز ٹریننگ سے دور رکھنے کے لئے منتخب کیا تھا۔

بتدریج میری ماں اور پھوپھی اس زندگی کی عادی ہو گئیں اور وقت کے ساتھ وہ اس زندگی کو شہر کے آرام و آسائش پر ترجیح دینے لگیں' اور یہ بات خود اس کے علاوہ تھی کہ وہ عورتیں بھی فوجی ملازمت کی تنگی یا آزادی کی اصل قیمت سے جسے سلطنت عثمانیہ کا ایک مفرور فوجی جانتا ہو' ناواقف نہ تھیں۔

ایک دن میری ماں جو کہ اس وقت حاملہ تھی ایک چٹان سے پھسل پڑی اور اٹھنے کی دوبارہ کوشش میں دوبارہ اس طرح پھسل کر نیچے خاصی دور تک پھسلتی چلی گئی۔ اس میں میرے باپ کے علاوہ میری پھوپھی اور بہنوں کو بھی مدد کرنی پڑی لیکن جہاں تک میری ماں کا تعلق ہے اس کا حمل گر گیا اور دائیں ٹانگ کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کئی مہینوں تک وہ اس تکلیف میں مبتلا رہی اور جب وہ بستر سے اٹھی تو لنگڑی ہو چکی تھی۔ اب وہ حمل گرنے کے برے اثرات اور ٹانگ کی ہڈی کے ٹوٹ جانے سے پیدا شدہ لنگ کا شکار رہی' میری پھوپھی بھی ایک مرتبہ ٹائیفائڈ کا شکار ہو گئی اور دو ماہ سے زیادہ عرصے تک بیماری کی حالت میں رہی' جس سے پورے گھر کی زندگی بکھر کر رہ گئی۔ ایک رات کو جب میرا باپ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے گھر واپس آرہا تھا تو اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے اور پیچھا کرنے والا اس سے زیادہ دور نہیں جو شاید اس کا گھر دیکھنا چاہتا ہے۔ پریشان خیالات کا ایک ہجوم اس کے ذہن میں در آیا' اس نے قیاس آرائی کی کہ فوج سے اس کے تعلق نے' انہیں بلند و بالا پہاڑوں اور گہری گھاٹیوں میں بھی اس کا پیچھا کرنے پر مجبور کیا؟ لہٰذا یہ سوچ کر اس نے گھر کے راستے کو چھوڑ کر خود کو ایک اور راستہ پر ڈال دیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ جبکہ وہ ابھی بلاوجہ پہاڑ پر اتر چڑھ رہا تھا یہ جانتے ہوئے کہ وہ آج کی رات گھر نہ جا سکے گا۔۔۔ اس نے یہ رات پہاڑی غاروں میں سے ایک میں گزاردی' یہ رات ایک یادگار رات تھی۔ گھر میں ہم سب کی آنکھ نہ جھپکی باپ کی واپسی کی فکر میں بے شمار خدشات لئے ہم منتظر رہے۔

ادھر اس کے ساتھ ایک طویل سیاہ رات تھی۔ ایسی کئی مشکلات ہمارے رستے میں آئیں لیکن ان سب کے باوجود انسانیت سے دور اس گھر میں زندگی بے حد خوش کن' آرام دہ اور خوشگوار تھی اس وقت تک آزادی نے اپنا سایہ اس گھر پر رکھا اور میرا باپ اپنی مرضی سے گھر آتا جاتا رہا۔ یہاں زندگی کتوں' بکریوں حتیٰ کہ مرغیوں تک کے لئے خوشگوار اور مہکتی ہوئی تھی' ہاں مگر جب ایک شخص آزادی کا مطلب بخوبی جانتا ہو"

تب ایوردا نے بات کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اس بہت اونچی چٹان تک چڑھ سکو تو تمہیں وہاں میرے باپ کی قبر ملے گی اور اس کے پاس ہی میری پھوپھی اور بڑی بہن کی قبریں ہیں اور میرے باپ کی قبر کے پاؤں کی طرف وہ کتا دفن ہے' جس نے ان بھیڑیوں کو پکڑا تھا جو سردیوں کی ایک رات میں بکریوں پر حملہ آور ہوئے تھے۔"

دو سال بعد میں کریٹ کی تعطیلات میں "جبہ" سے گزرا اور ایوردا کے بارے میں دریافت کیا' مجھے بتایا گیا کہ وہ مرچکا ہے اور اپنے باپ کے قریب ہی دفن ہے۔ اب اس کا گھر چلانے کو اس کا بیٹا بڑا ہے اور وہ بھی اپنے دادا کے راز کو جانے بغیر مرجائے گا یہ وجہ جانے بغیر کہ آخر اس دور افتادہ بنجر علاقہ میں

[باقی صفحہ ۱۵۰ پر دیکھئے]

علیفہ رفعت

انور شاہدی

سرما کی طویل رات

نیند اور بیداری کی کیفیت کے ایک لمحے میں۔۔۔ وقت کی قیود سے باہر آ کر جو اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ حال کے سوراخوں میں سے نکلتی ہوئی کسمساتی مچھلیوں کی مانند رات کی سرگوشیوں نے زلیخا کی سماعت پر اس کی شعوری حالت میں خود کو بتدریج مستحکم کر دیا تھا۔

مینڈکوں کی مسلسل ٹراہٹ اور کھیتوں میں دوسرے سرے پر دیہاتی کتوں کے جواب میں بھونکتے ہوئے کتے، جیسے کسی خفیہ زبان میں اطلاعات کا نہ ختم ہونے والا تبادلہ ہے۔

اک دم اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے بستر میں بالکل اکیلی ہے، واحد دوسری زندہ شے دیوار پر تبدیل ہوتے سائے تھے، جو کیروسین لیمپ میں جلتی ہوئی قریب الختم بتی کے باعث تھے اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ اب وہ ہرگز نہ سو سکے گی۔ اب بس اس کی یہی خواہش تھی کہ جلدی سے دن فجر کی نماز کے ساتھ نکل آئے۔

جیسے جیسے وہ اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی، ماضی کی یادیں رات کی سرگوشیوں پر حاوی ہوتی گئیں اور بالکل اسی طرح کی کئی راتوں میں اس نے خود کو اپنے بچپن کے دنوں کی طرف دھکیل دیا۔ اس محدود معاشرے کی جانب جو بچے اپنے لیے بغیر کسی تگ و دو کے بنا لیتے ہیں۔ ایک گھر میں حفاظت کے وہ دن، جہاں محبت اور شفقت بچے کا حق تھا اور یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے اسے کچھ کام نہ کرنا پڑتا تھا، جہاں موت کی حکمرانی نہ تھی اور دکھ کا قیام جہاں کبھی ایک رات سے زیادہ نہ رہا۔

وہ دیہات کی گلیوں میں اپنی سہیلیوں کے ہمراہ اپنی مرضی کے مطابق کھیلتی، کبھی گھر آتی پھر کھیلنے چلی جاتی اور کبھی کبھار چاندنی راتوں میں اپنی جوان سہیلیوں کے ساتھ گو خرام ہوتی اور گیت گانے لگتی ایسے گیت جن سے وہ کبھی لطف اندوز ہوتی اور کبھی انہیں کلی طور پر نہ سمجھ پاتی۔

ع سرما کی رات طویل ہے۔

مجھے گلے لگا لو۔

اور میں تمہیں سرما کی طویل رات میں اپنے گلے لگا لوں گی، یہ گیت وہ کبھی نہ تھکتے ہوئے تالیوں کی تال پر ایک مخصوص لے میں گایا کرتیں پھر اچانک سن بلوغت کے آتے ہی اس کی ابھرتی ہوئی چھاتیاں، رحم مادر میں بننے والے بچے کی مانند، اسکی پھکا۔ زندگی کی آزادی سے اس کی کھردری قمیض میں نمودار ہو گئیں اور یوں اس کا اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنا بند ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کی شادی اپنے عم زاد ہمدان سے ہوئی تاکہ خاندان کی زمین خاندان ہی میں رہے اور یوں وہ اپنے بکھرے پڑے دیہاتی گھر سے کھیتوں کے دوسرے کنارے پر واقع اپنے شوہر کے تھا محل میں منتقل ہو گئی جس کی دو حویلیں تھیں اور شمال کے رخ پر بنے ہوئے استقبالیہ کمروں کی چنائی پتھروں سے کی گئی تھی اور سردیوں کے استعمال میں آنے والے کمروں کا فرش چھپا تھا۔ اردگرد پھیلے ہوئے سبزیوں اور پھلوں کے باغات اور یہ سب کا سب گارے کی بنی ہوئی ایک بلند دیوار کے حصار میں تھا جس کے اوپر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے جڑے تھے۔ اسے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس کی شادی کے دن جب پہلی بار اسے بڑے دروازے سے لے جایا گیا تو سامنے سفید دیوار پر سرخ رنگ سے بنی بڑے اونٹ کی تصویر تھی جو مالک مکان کے حج کی غمازی کرتی تھی اور سرخ رنگ ہی میں ہاتھوں کے چھاپے، جو نظر بد سے بچانے کے لیے تھے اور پھر وہ رات آئی، جب ہمدان اسے اسی بستر تک لے

ارتضیٰ نشاط

زندگی ڈوبتی نبضوں کی صدا لگتی ہے
کوئی زردی ہوئی مخصوص دعا لگتی ہے
پیٹ کی آگ بھی لگتی ہے تو کیا لگتی ہے
نیند بھی سو کے جو اٹھتا ہوں غذا لگتی ہے
جیسے ہر شخص کوئی جرم کیے بیٹھا ہو
گھر میں گھستے ہی عجب گھر کی فضا لگتی ہے
آئیے آج اسی سوچ کو پختہ کر لیں
بےحسی حد سے گزرتی ہے تو کیا لگتی ہے
سب سے دلچسپ یہی غم ہے مری بستی کا
موت پسماندہ علاقے میں دوا لگتی ہے
لاش بل کھل کے ٹھکانے سے لگا دو میری
بو مرے جسم سے اٹھتی ہے ہوا لگتی ہے
نور سا ساتھ چلتا ہے جلو میں اس کے
کیا خبر جب وہ گزرتی ہے تو کیا لگتی ہے
خوب قرآں کا انداز چرایا ہے نشاط
بات اس ڈھب سے کہی ہے کہ خدا لگتی ہے

● معرفت روزنامہ انقلاب ۱۵۶۔ ڈی ڈی میلو روڈ
چے۔ دادا جی روڈ۔ تارڈیو۔ بمبئی نمبر ۴۰۰۰۳۴

اسلامی ممالک کی کہانیاں

کیا تھا۔ یہ ایک درد بھری اذیت ناک رات تھی' کسی بھی ایسے تجربے سے مختلف جس سے وہ پہلے آشنا رہی۔ اس کے بعد ایسا ہی سینکڑوں مرتبہ ہوا جس میں درد کی تکلیف نے نفرت کی جگہ لے لی' اس کے خاوند کا کھردرے ہاتھوں سے اس کے جسم کو مسلنا' اس کی متعفن سانس اور شیشش کی بو میں تھرتھرا ہوا تحرک شامل تھا۔ اپنے خاوند کی اطاعت اور بچوں کی خاطر اس نے خود کو ایک بیوی اور ماں کے کردار میں ڈھال دیا تھا۔ ایک عورت جو شادی اور گھر سے اس وقت تک تحفظ حاصل کرتی ہے جب تک وہ اسے قبر میں نہیں ڈال آتے۔

وہ پہلی رات یاد آتی ہے جب اس کا خاوند اس کے پاس بستر میں موجود نہ تھا اور کس طرح اس نے بیدار ہو کر اپنے خاوند کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا اور بالآخر چھت کی چٹائی پر بجلی کے نزدیک اسے جوان خادمہ کے ساتھ لیٹے ہوئے پایا تھا اور جب وہ اپنے خاوند کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں پہنچی تھی تو نصیبا نے اپنی ساری تربیت اور روایت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر ڈالا تھا جس پر وہ اس کی طرف پشت کر کے بولا تھا۔

"میں کیوں تمہیں طلاق دوں؟ تم اپنی ماں کے پاس جا کر اس سے اپنے باپ کے بارے میں جس کا بیشتر وقت محلے پر گذرتا ہے سوال کیوں نہیں کرتیں۔ سو جاؤ اور بات کو زیادہ نہ بڑھاؤ۔"

اگلے دن اس کے خاوند نے اسے سونے کی بالیاں لا کر دی تھیں اور محبت سے اسے چوم لیا تھا۔ اس کے باوجود گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اس قسم کی راتیں دہرائی جاتی رہیں اور اسے سونے جواہرات کے تحائف ملتے رہے اور جوان خادمائیں اس کے شوہر کے ایما پر گھر میں تبدیل ہوتی رہیں جیسا کہ گھر کا مالک وہ تھا۔۔ اپنے باپ سے متعلق شبہات جو خاوند کی باتوں سے اس بدنصیب رات کو پیدا ہوئے اسے مسلسل تنگ کرتے رہے' کیا ایسے معتبر اور نیک انسان کے بارے میں' جس کا گاؤں میں اثر و رسوخ تھا ۔۔۔ وہ باریش مشفق شخص' جو اس کے بچپنے میں اسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر ولیوں کے بارے میں قصے سنایا کرتا تھا۔ ان باتوں میں کوئی صداقت ہو سکتی تھی کہ وہ بھی اپنی بیوی کے سو جانے پر کسی اور عورت کے بستر میں چلا جائے گا؟ محض اپنے باپ کا خیال۔۔۔' اس کے چغہ میں پھیلی ہوئی عطر کی خوشبو کو وہ اپنے چہرے کو نزدیک لے جا کر محسوس کرتی' یہ بات اسے اطمینان اور سکون بخشتی کہ اس کا باپ ایک اچھا انسان تھا اور دنیا میں کہیں بھی کوئی برائی نہ تھی۔۔

اس صبح اپنی ماں کے آنے پر' جو پل عبور کر کے دوسرے دیہات سے کھانے کی اشیاء سے لدے ہوئے گدھے اور نوکر کے ہمراہ پہنچی تھی' اس نے اس ضمن میں کوئی بات نہ کی۔ لیکن تہوار کے دن جب اس کی ماں قبرستان میں اپنے شوہر کی قبر پر دعا کے لیے پہنچی اور اپنی بیٹی کے گھر تک سفر کو مکمل کیا تو گاؤں کے ذکر اذکار کے دوران چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بالآخر نصیبا نے ہمت کر کے اپنی ماں سے وہ سوال' جس کے بارے میں وہ ایک مدت سے سوچ رہی تھی کر ڈالا۔ اس کی ماں نے اپنی نظریں چائے کے گلاس کی طرف نیچی کر لیں اور کہنے لگی۔

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"کیا میرا باپ بھی؟"

ماں نے زور سے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بیٹی۔۔۔ وہ بھی ایک مرد تھا۔ خدا اس پر اپنی رحمت کا سایہ کرے۔" وہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں کچھ اور کہے۔۔ کیا اس کی طرح اس نے بھی اسی وضع کے بھیانک خواب دیکھے ہیں لیکن اس کی ماں نے بس اس پر ایک نظر ڈالی جس نے اسے چپ کرا دیا تھا۔۔ جیسے غیر منور علاقے کے بارے میں انتباہ ہو پھر اس کی ماں اپنے خاوند کی روح کے لیے سورہ فاتحہ کا ورد کرنے لگی' جس پر نصیبا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔۔۔ اب اس کی ماں بھی مر چکی تھی۔

خود نصیبا کا خاوند بھی اس کے باپ کی اس عمر کو پہنچ گیا تھا جب اس کا انتقال ہوا۔ اب تو نماز پڑھتے ہوئے اس کے جوڑ کڑکڑاتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اکثر راتوں کو غائب ہو جاتا اور وہ اب بھی

محمد اظہار الحق

❁

کیا رات تھی بدلے گئے جب نام ہمارے
پھر صبح کو شیخ تھے نہ خدام ہمارے

اب آئینے دیکھو گے تو چہرے ہی نہ ہونگے
بارش کی طرح تم پہ تھے انعام ہمارے

جس دن کسی پیکر میں ڈھلے معرکہ ہوگا
اب تک تو خیالی ہیں سب اصنام ہمارے

پانی پہ اٹھائی گئی بنیاد ہماری
مٹی سے بنائے گئے اجسام ہمارے

اے ارض سیہ روز! کوئی اور ہی سورج
شاید کہ بدل جائیں یہ ایام ہمارے

۸۰۸ کیٹیگری ۱-۱۰، اسٹریٹ ۸، آئی-۱۰/۱
اسلام آباد (پاکستان)

ذہانت کی شکل میں اس کی طرف سے تحائف وصول کرتی۔۔۔ یقیناً ایک وقت تو ایسا آئے گا کہ وہ مطمئن ہو جائے گا؟

ایک عرصے تک اسے ایسا لگا کہ اس کا خاوند اب بدل گیا ہے پھر اچانک ایک نوجوان خادمہ نے اس کے احکامات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ جبلی طور پر جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟ اس نے اس خادمہ کو واپس اس کے دیہات بھیج جانے پر زور دیا لیکن چند ہی دنوں کے بعد ایک اور لڑکی کو جو بالکل بچی سی تھی گھر لایا گیا۔ جو پہلے کچھ دن تو اپنی ماں کو یاد کر کے روتی رہی تھی۔۔۔ اب وہ اس کے علاوہ کہاں جا سکتی تھی؟۔۔۔ کیا یہ ممکن تھا؟

اچانک وہ اپنے پیروں کے سامنے پلنگ کی پائنتی کی طرف آتش دان میں سوتی ہوئی آگ کو دیکھ رہی تھی' یہ فیصلہ نہ کر پاتے ہوئے کہ اٹھ کر نیچے جانا چاہیے یا نہیں' اس نے اپنے شوہر کے بھاری جھجکتے قدموں کی آہٹ سنی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس آ کر لیٹا اور خود کو چادر سے ڈھک لیا۔ تقریباً اسی لمحے وہ سو گیا تھا۔

زلیخا نے آہستگی سے اپنے بدن کو حرکت کرتے ہوئے کہ وہ محسوس نہ کرے بستر میں حرکت کی۔ اپنے خاوند کے خلاف جمع شدہ نفرت جو دھیمے دھیمے اس کے سینے میں داخل ہو چکی تھی اور امید کہ حالات بدل جائیں گے کبھی کی جا چکی تھیں لیکن محبت کرنے اور چاہے جانے کی کسک' جسمانی طور پر دیکھنے اور سونگھنے کی حس کی طرح بدستور موجود تھی' لیمپ بجھا اور اس نے کھڑکی کے سوراخ کی جانب دیکھا' جہاں سے سورج چڑھنے سے پہلے کی سلیٹی رنگت کمرے میں جھانک رہی تھی۔ اپنے سانس کو روکتے ہوئے وہ بستر سے نیچے اتری اور ہاتھوں کو آگے کی طرف پھیلاتے ہوئے کمرے سے باہر جانے کا رستہ بنایا' جہاں سے سیڑھیاں تلاش کرتی نیچے چلی گئی۔۔۔ وہاں چولہے کے نزدیک وہ لڑکی سو رہی تھی۔

نرگس نے اپنا سر اٹھایا۔

"مخدومہ زلیخا کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا نرگس؟" اس نے کہا "کوئی بات نہیں اٹھو اور گرم پانی لاؤ میں نہانا چاہتی ہوں۔"

وہ کمرے کی طرف واپس پلٹ آئی۔ اس کا شوہر گہری نیند سویا ہوا تھا وہ تولیے اور انگیٹھی کو اٹھا کر غسل خانے کی طرف چل گئی۔ جہاں انگیٹھی کو فرش پر رکھ کر اس نے کوئلے دہکائے اور پھر [illegible] کے ساتھ کا کپڑا تھا اٹھایا اس اثنا میں نرگس گرم پانی کا جگ' جس میں عرق گلاب شامل تھا اٹھائے چلی آئی۔ زلیخا نے اپنا شب خوابی کا لباس اتارا اور ٹب میں داخل ہو گئی جونہی اس نے نرگس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"نرگس گھبراؤ مت" اس نے کہا۔ "تم بھی اپنا لباس اتار لو تاکہ میری کمر دھو سکو" ڈرتے ہوئے نرگس نے اپنے لباس کو سر سے اتارا اور پھر اپنی مالکن کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔۔۔ زلیخا نے لڑکی کے جسم کو دیکھا اور ایک خیال کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپک گیا کہ کبھی وہ بھی خوبصورت تھی۔ یہ بات وہ اس لڑکی سے کہنے ہی والی تھی لیکن پھر نہ کہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم یہاں خوش رہو گی نرگس' خدا نے چاہا تو اس گھر میں تم ایک طویل مدت تک رہو گی۔" پھر وہ ٹب میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تاکہ لڑکی اس کی کمر پر پانی ڈال سکے۔

"دیکھو اس جھانوے سے میری کمر کو رگڑو۔" اس نے کہا اور جونہی لڑکی اس کے اوپر جھکی۔ زلیخا کو اس کی سخت چھاتیاں اپنے کندھوں سے رگڑتی محسوس ہوئیں۔ "سختی سے رگڑو۔" اس نے کہا "سخت اور طاقت سے۔"

جھانوے نے اس کی کمر کو خوفناک حد تک چھیل ڈالا۔ ◆

حکیم منظور

رقم ہے ہر نظر میں اک عجیب آزردگی جاناں
کہ کو لکھے ہے کہیں خوش وقت خوابوں کی پری جاناں
کنول شعلہ بدن بھی تشنہ لب بھی' چشم بے نم بھی
بسی ہے دل کی موجوں میں یہ کیسی برہمی جاناں
میں روتا بھی نہیں شعلہ بدامن دیکھ کر رُت کو
یہ کیسی بے بسی جاناں' یہ کیسی بے دلی جاناں
یہ حاتم کی طرح خوشبوئیں اپنی بانٹ دیتے تھے
ہوا کیا کیسے آئی ان گلوں میں تیرگی جاناں
شجر بونے کے میرے حوصلے بھی کم نہیں ہوں گے
ہوائیں بھی نہ آئیں گی ثمر شائستگی جاناں
وہ کہتا ہے کہ میں سب میں رہوں سب سے الگ ہو کر
میں ایسا کیا کروں مل جائے یہ شائستگی جاناں
حوالہ تیری آنکھوں کا طلب ہے سامنے خوابوں کی
اُجالوں کی سند تیرے بدن کی روشنی جاناں
نہ گھوتی دھوپ میں نشہ نہ اونی برف میں لذت
نظر میں ہیں نہیں جو شعلۂ منظر کشی جاناں
ثمر جاگے ہوئے ہیں اور شجر سوئے ہوئے سارے
مجھے منظور یہ ہے عالم نادیدنی جاناں

جموں (کشمیر) ●

عشرت ظفر

آنکھ جھپکی، کہ تہہِ آب تھا میں
خسِ گہوارۂ گرداب تھا میں

گم ہوا سیلِ نمو جانے کہاں
وہ بھی کیا دن تھے کہ شاداب تھا میں

بیکرانی تھی سرابِ خوش رنگ
اوس کی بوند سا پایاب تھا میں

بے اُفق لمحۂ ظلمت تھا، مگر
چاند کے لمس سے سیراب تھا میں

نقشِ جامد نہ تھی ریگِ مہ و سال
صورتِ ساعتِ بیتاب تھا میں

اس کے سورج کی کرن ملنے تک
عشرت اک پارۂ برفاب تھا میں

● ۸۸/۲۸۸ فہیم آباد کانپور-۲۰۸۰۰۱-یوپی

مبارک رانی

محمود احمد قاضی

حامو گنجے کا قصہ

پہلے تو یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی، لیکن شاید اس کے دل میں کہیں موجود ضرور تھی، کیونکہ بعد میں یہ لوگوں کا بحالہ بن گیا یا پھر اس عمارت کے مکینوں کا بھی مسئلہ بن گیا اور صحیح طور پر کہا جائے تو یہ کہ اس وقت جب ان سب نے اس کے متعلق بات چیت کی تو وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ کیا وہ اسے جانتے بھی تھے یا نہیں۔ یہ مسئلہ اس کے اچانک غائب ہو جانے پر سامنے آیا۔ اخبارات نے جو اشتہار شائع کیا وہ کچھ یوں تھا "حامو سعید جو عرفِ عام میں "حامو گنجا" کہلاتا تھا اور جس کی عمر پچاس سال تھی چھ ماہ پہلے غائب ہو گیا۔ وہ محلہ کی محافظ سٹریٹ میں زیرِ تعمیر کی عمارت میں بطور چوکیدار ملازم تھا۔ جو شخص اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو اس سے درخواست ہے کہ وہ براہ مہربانی اس کی اطلاع پولیس کو، اس کی بیوی مسز ... یا اس کے بچوں کو اس پتے ... پر دے۔"

اور تب ہی اس عمارت کے مکینوں کو اس کی غیر حاضری محسوس ہوئی اور انہوں نے اس کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ جب انہوں نے اس کی گمشدگی کے بارے میں آپس میں تبادلہ خیال کیا تو تب ہی وہ ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوئے حالانکہ وہ ایک عرصے سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔

انہیں معلوم تھا کہ حامو — معاف کیجئے — حامو گنجا ازل سے اس عمارت میں موجود تھا۔ سب سے پرانا مکین جو اس عمارت میں پچھلے دس سال سے رہ رہا تھا، اس کا استقبال حامو گنجے ہی نے کیا تھا۔ شاید اس عمارت کا مالک ہی یہ جانتا تھا کہ حامو کب اس عمارت میں پہلے پہل آیا تھا۔ لیکن اپنے دماغ پر بہت زور دینے کے بعد اس نے پولیس مین اور اپنے قریب کھڑے اس عمارت کے مکینوں کو بتایا کہ میں اس کی اس عمارت میں آمد کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں جانتا۔ اصل میں وہ کافی عرصے سے میری ملازمت میں ہے۔ لیکن کب سے ہے — یہ میں نہیں جانتا — اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس بات کا اندراج ضرور کہیں کیا ہو گا لیکن اس وقت میں بھول چکا ہوں۔

سب سے پرانے مکین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ شخص یقیناً یہاں اس عمارت میں دس سال سے زیادہ عرصے سے موجود تھا، کیونکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حقیقت میں اسی نے اس وقت میرا استقبال کیا تھا" حامو کی بیوی نے کہا "میں ابھی تک اسی گھر میں رہ رہی ہوں جہاں رہتے ہوئے میں چار بچوں کی ماں بن چکی ہوں، اب مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن وہ یہاں اس وقت سے تھا جبکہ آج سے کئی سال پہلے اس وقت ابھی میرے شوہر نے کوئی نوکری بھی حاصل نہیں کی تھی۔ ہمارا گھر بہت چھوٹا سا ہے اور اس شہر کے نواح میں واقع ہے" اس نے مزید کہا "اس عمارت میں اسے رہنے کے لئے جو جگہ مہیا کی گئی تھی وہ بس اتنی ہی تھی کہ وہ بمشکل وہاں اپنی ہی ٹانگیں پسار سکتا تھا اور اسی لئے اس نے ہمیں یہاں اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ میرا شوہر دن اور رات کے کسی بھی موقعے پر یہاں سے چند گھنٹوں کی فرصت نکال کر ہر روز گھریلو کام کاج کو نپٹانے کے لئے ضرور گھر آتا تھا۔ اس کے تعلقات ہمارے ساتھ بالکل پہلے ہی جیسے تھے"...... پولیس مین نے انہی الفاظ کی روشنی میں عمارت کے داخلے کے راستے پر اکٹھے ہو جانے والے پڑوسیوں سے پوچھا "اس کا مطلب ہے کہ آپ میں سے کسی نے بھی اس کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کیا — یعنی کہ کب وہ اپنے بیوی بچوں کو ملنے کے لئے گیا؟" ایک خوبصورت نوجوان نے عینک کو اپنے چہرے پر درست کرتے ہوئے کہا:

افتخار نسیم

❁

خیال مرگ کے آتے ہی ڈر گیا میں تو
خود اپنی موت سے پہلے ہی مر گیا میں تو

سجھائی کچھ نہیں دیتا تھا اس اندھیرے میں
میں قبر میں تھا کہ کمرے میں ڈر گیا میں تو

ترے وصال کی خواہش مجھے سنوارتی ہے
ترے فراق سے جیسے بکھر گیا میں تو

کسی نے پوچھا نہیں حال مجھ مسافر کا
کسی نے روکا نہ پھر بھی ٹھہر گیا میں تو

کسی نے دیکھا نہیں میرا شاخ پر ہونا
ہوا چلی بھی نہیں اور بکھر گیا میں تو

یہ کون پل کے لئے میرے سامنے میں ٹھہرا
خزاں کی رت میں بھی پھولوں سے بھر گیا میں تو

8HN: CLARK STREET
CHICAGO, IL 60610
U.S.A

"اصل میں مجھے جب بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے ہمیشہ اسے یہیں حاضر پایا"
پولیس مین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا'
"یعنی ہمیشہ۔۔۔۔؟"
"جی ہاں۔۔۔۔!"
"کیا رات کے وقت بھی۔۔۔ یعنی رات گئے بھی؟"
اسی خوبصورت چہرے والے نوجوان نے جواب دیا'
"بعض اوقات آدھی رات کے بعد بھی۔"
پولیس مین نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے نہایت چالاکی سے سوال کیا'
"کیا تم بتا سکتے ہو کہ رات کے اس پہر کو تمہیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی تھی؟"
نوجوان ہکلانے لگا اس نے اپنی گھبراہٹ اور خوفزدہ سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے جیبوں میں سگریٹ تلاش کرنے کی کوشش کی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا'
"ہم سارے ایک جیسے ہی ہیں"
پولیس مین نے نوجوان پر سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائیں جیسے کہ وہ کوئی مشکوک شخص ہو یا اس سے کوئی ضروری سراغ ملنے کی توقع ہو۔
"پہلے میں نے تم سے تمہارے بارے میں پوچھا پھر میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تمہیں اس کی رات کے اس پہر ضرورت کیوں پڑتی تھی' اور آخر میں جو کچھ تم نے کہا اس کا صاف مطلب یہ نکلا ہے کہ ایسا تمہارے علاوہ سب ہی کرتے تھے اور مسٹر۔۔۔۔"
پولیس مین کو غائب ہو جانے والے شخص کا نام یاد کرنے کے لئے اپنی نوٹ بک سے رجوع کرنا پڑا
نوجوان جو اپنا سگریٹ ابھی تک نہیں سلگا سکا تھا' نے جواب دیا'
"میں نے بتا دیا ہے کہ ایسا ہم سب ہی کرتے تھے"
عین اسی وقت اس عمارت میں رہنے والی ایک عورت نے کہا'
"نہیں وہ صرف اپنے متعلق کہہ رہا ہے۔۔۔ یا پھر دوسرے مردوں کے بارے میں۔۔۔ لیکن ہم عورتوں کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ ہم عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی ماموں گنجے سے کوئی سروکار نہیں رہا"
پولیس مین نے اس عورت کی طرف اس کے بارے میں حاصل کردہ اپنی معلومات کے حوالے سے خاص توجہ کے ساتھ دیکھا "وہ ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔۔۔ تقریباً طلاق یافتہ' کہ اس کی طلاق کا کیس ابھی التوا میں پڑا تھا۔۔۔ اس کی بیٹی ایک بورڈنگ سکول میں نرسری کلاس کی طالبہ تھی۔
تاہم اسے عورت کے چہرے پر گھبراہٹ وغیرہ کے کوئی آثار نہیں ملے۔ اس نے اردگرد کھڑے لوگوں کو بھی غور سے دیکھا۔ ان کے متعلق حاصل شدہ اس کی معلومات نے اسے امید کی ایک کرن سے ہمکنار کر دیا۔
"اور کیا وہ کبھی تم لوگوں میں سے کسی کو بھی ملنے آیا؟"
اس عمارت کی نزدیکی ایک دکان کے مالک نے کہا'
"جناب دکان تو سب کے لئے ہی کھلی ہوتی ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے پاس آتا تھا"
"ہاں وہ سودا سلف لینے آتا تھا"
"کس قسم کا؟"
"ہر قسم کا۔۔۔ روٹی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"
"اور اس کے علاوہ؟"
"بس اسی قسم کی ہی چیزیں جناب۔۔۔۔"
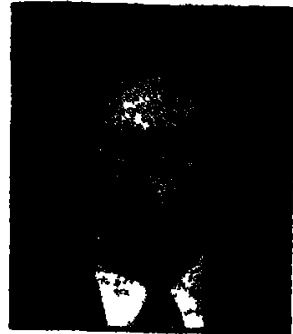
پولیس مین نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سوالات کے نتیجے میں وہ کولہو کے بیل کی طرح وہیں اسی جگہ گھوم رہا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی تحقیقات کا دائرہ بڑھاتے ہوئے کہا'

"اچھا۔ تو اب تم مجھے اس کے دوستوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔۔۔ اس کے بھی ہماری طرح کچھ دوست تو ضرور رہے ہوں گے؟"

اگرچہ اس کی توجہ کنڈیکٹر پر مرکوز تھی لیکن تحقیقات کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لئے ایک طرح سے یہ سوال اس نے سبھی سے کیا تھا کنڈیکٹر نے بڑے سچے تلے انداز میں جواب دیا'

"یقیناً یہ شخص ہمارے پاس ایک عرصے سے تھا۔ لیکن میری اس کے ساتھ واقفیت بس "خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے" اور جواباً اس کی طرف سے بھی "اور تمہیں بھی خدا اپنی امان میں رکھے" جیسے الفاظ تک ہی محدود تھی۔

ہجوم کی طرف سے ملنے والے بہت سے جوابات آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

سوالات اور جوابات کو وسعت دینے کا نظریہ بھی تقریباً ناکام ہی رہا تھا' پولیس مین نے چند لمحوں کے لئے سوچا اور ایک دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے وہ لوگوں کی طرف مڑا اور کہنے لگا "میرے نزدیک اب یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ وہ شخص نہ تو کوئی مجرم تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کسی ایسی مشکل چیز کا ثبوت موجود ہے' تحقیقات سے یہ بھی پتہ چل چکا ہے کہ کسی کا مقروض بھی نہ تھا نہ ہی وہ بڑا بننے والا شخص تھا اور نہ ہی کسی جرم قسم کا آدمی تھا۔ وہ تو ایک تنہائی کا مارا ہوا شخص تھا۔ اور دوسری طرف ان چھ ماہ کے دوران جب سے کہ یہ شخص حامو یعنی "حامو گنجا" کے متعلق ایسی معلومات اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے' جن کے ذریعے اسے' جس مصیبت میں وہ اس وقت گرفتار ہو سکتا ہے' نجات دلانے کی کوشش کی ضرورت ہے' یا یوں کہنا چاہئے کہ اس طرح اسے تلاش کر کے اس کے بیوی بچوں سے دوبارہ ملوا دینے کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک اہم نکتہ یہ ہے کہ اپنی محدود آمدنی کے باوجود خاص طور پر' اس شخص کے تعلقات اپنے بیوی بچوں سے بہت اچھے تھے۔ آپ لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ' اس طرح اس کی گمشدگی کا معمہ کس طرح حل کیا جائے؟ اس کی بیوی کے بیان اور آپ لوگوں کی آرا کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ایک داخلیت پسند شخص تھا وہ اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں لوگوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی اور نے اس کے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ حتیٰ کہ جب وہ دن اور رات کے کسی حصے میں اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لئے جاتا تھا تو بھی کوئی شخص اس کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ شاید اس نے اس کام کے لئے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اسے روپے پیسے کا بھی کوئی زیادہ لالچ نہیں تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنی کم تنخواہ پانے کے باوجود' اس نے اپنے مالک کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا بلکہ وہ اس کے کام سے مطمئن تھا۔ وہ کرایہ کی ادائیگی کی کبھی کبھار کی دیری سے بھی پریشان نہیں ہوتا تھا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ حقیقتاً" ایک انسانی مسئلہ اس لئے آپ میں سے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی اس تقریر کا مثبت اثر پڑا۔ اور آخر کار اس خوبصورت نوجوان نے اپنا سگریٹ سلگا ہی لیا۔ لوگوں کے چہرے کا کھچاؤ ختم ہو گیا اور وہ نارمل ہوتے چلے گئے۔

انشورنس کمپنی کی ملازمہ بولی۔

"بے چارہ۔۔۔ خدا کرے وہ اپنے بیوی بچوں میں حفاظت کے ساتھ واپس آجائے"

اس کے گرد کھڑے لوگوں نے کہا "آمین" اور سبھی خدا سے اس کے لئے سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ بات یقینی تھی کہ حامو گنجے کو اس وقت تک کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا جب کہ وہ اللہ سچند کی اس عمارت میں ملازمت کرنے گیا تھا۔ بعد میں بہرحال' اس کے دل کے اندر کسی مسئلے نے ضرور گھر کر لیا تھا۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی تھی کہ اپنی گمشدگی کی وجہ سے وہ لوگوں کے لئے کوئی مسئلہ

حسن عبّاس رضا

تمہارے ہجر کے اسباب اگر معلوم ہو جاتے
تو شاید اپنے رنج آسودہ مفہوم ہو جاتے

تعلق توڑنے میں کوئی مشکل تھی تو کہہ دیتے
کہ ہم تو پانیوں پر نقش تھے، معدوم ہو جاتے

بھلا ہم کو فنا ہونے میں کتنی دیر لگتی تھی
کہ تم ارشاد کرتے اور ہم معصوم ہو جاتے

چلو اچھا ہوا جو ہو گیا، سو ہو گیا، لیکن
یہ خواہش تھی کہ ہم تم لازم و ملزوم ہو جاتے

حسن! کیسے ہم ان کو قرینۂ دل میں چھپا لیتے
وہ آئینے جو سنگ و خشت کا مقسوم ہو جاتے

مکان نمبر ۹۱۵- سیاچہ کالونی، سیٹلائٹ ٹاؤن - راولپنڈی - (پاکستان)

کرنا کیا چاہتا تھا' اور نہ ہی ان لوگوں کے لئے جن کا اس عمارت سے کوئی تعلق تھا مثلاً مالک' اس عمارت کے مکین یا اس کے پڑوسی وغیرہ۔ اگر اس نے ایسا ہی کوئی طریقہ اختیار کیا ہوتا تو بھی یہ بات حتمی نہیں ہو سکتی تھی کہ دوسرے لوگ اس سارے معاملے کے متعلق یا تھوڑا بہت ہی' اس کے اس اقدام کے بارے میں ضرور ہی جانتے ہوں گے۔

اس عمارت میں رہنے والے سبھی لوگ' صاف ستھرے اور خوشحال اطوار کے مالک تھے۔ عمارت کا مالک بھی ایسی ہی شخصیت کا حامل شخص تھا' مگر کہ وہ کم ہی یہاں آتا تھا۔ ہر مہینے کے آخر میں جب وہ کرایہ وصول کرنے آتا' خالی فلیٹوں کے بارے میں استفسار کرتا یا پھر ان فلیٹوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا جو کہ عنقریب خالی ہونے والے ہوتے تھے تو تب بھی وہ چوکیدار سے بات چیت کرنے یا اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ جب بھی وہ یہاں آتا تو حامو کبھا اسے کبھی تنہا نہ چھوڑتا' بلکہ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا اور یوں اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی ہو گی۔ لیکن سارا قصہ یہ ہے کہ عمارت کے مالک نے جب اپنی یادداشت پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ وہاں سے جانے والا ہوتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ حامو ہمیشہ اس سے کچھ پوچھنے یا سوال کرنے کی تگ و دو میں ہوتا تھا۔ مالک جب واپس جاتے ہوئے صرف اس لئے رک جاتا کہ حامو اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے پوچھ لے' حامو کبھا ہمیشہ یہی کہتا کہ نہیں اسے اس سے کوئی بات نہیں کرنی مثلاً اپنی تنخواہ وغیرہ کے بڑھانے کے بارے میں یا ایڈوانس لینے کے بارے میں بھی نہیں۔۔۔ وہ اگر کچھ کہتا تو بس یہی کہ "نہیں جناب کوئی خاص بات نہیں" مالک کہتا:

"حامو میاں کہو۔۔۔"

جواب میں ہکلانے لگتا اور یوں لگتا کہ اظہار کے لئے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے وہ مزید کہتا۔

"دیکھئے جناب جب کوئی شخص اپنے اندر بہت گہرائی میں کچھ محسوس کرتا ہے۔۔۔ یعنی کچھ۔۔۔؟"

لینڈ لارڈ کے پاس چونکہ ہمیشہ ہی وقت بہت کم ہوتا تھا اس لئے وہ جاتے جاتے کہتا

"اچھا بھئی۔۔۔ پھر سہی۔۔۔ پھر کبھی سہی۔۔۔"

اور پھر وہ وہاں سے روانہ ہو جاتا

جب دائیں طرف کے فلیٹ نمبر ۳ میں رہنے والے شخص نے حامو کو ایک دن رات کے دو بجے اپنی رات کی محفل سجانے کے لئے کوئی چیز اس جگہ سے ڈھونڈنے کے لئے بھیجنا چاہا جس جگہ کے بارے میں صرف حامو ہی جانتا تھا تو اس لئے حامو کی زبان پر وہ پوشیدہ سوال بالکل واضح ہو کر آ ہی گیا تھا' حامو نے اس خوبصورت نوجوان کی مطلوبہ چیز اسے پکڑاتے ہوئے کہا

"جناب۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟"

نوجوان جس کی آنکھیں اس وقت سرخ سی ہو رہی تھیں جیسے بہکے ہوئے لہجے میں بولا

"باقی پیسے اپنے پاس ہی رکھو۔۔۔ خدا حافظ!"

اس بات چیت کے صرف چار گھنٹے بعد جب اس نوجوان نے ان لڑکیوں کو واپس ان کے گھروں تک پہنچانے کے لئے کہا' کیونکہ وہ خود انہیں وہاں تک پہنچانے کی حالت میں نہیں تھا' تو اس وقت بھی وہ سوال حامو کے ذہن میں ابھی بالکل تازہ اور واضح تھا' لیکن وہ سوال اس نے اس سے اس لئے نہ کیا' کہ وہ جانتا تھا کہ اسے اس کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔ پھر اس نے اپنے طور پر بہت بنا سنوار کر وہ سوال ان دونوں میں سے ایک لڑکی سے کر ہی دیا'

اس نے اس لڑکی سے پوچھا

"دنیا میں اس وقت کیا ہو رہا ہے؟"

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور اپنی دوست پر جھکتے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا

"دنیا!!! تمہیں اس سے کیا سروکار؟۔۔۔ بس تم اپنے خدا پر بھروسہ رکھو"

مختار شمیم

پتھروں کو آئینے کا مرتبہ دیتا ہے کون
آئینہ در آئینہ خود کو سجا دیتا ہے کون

کس نے خوشبو کو ہواؤں میں دیا اذنِ سفر
تتلیوں کو غنچہ و گل کا پتہ دیتا ہے کون

دامنِ صبحِ تمنا چاک ہے کس کے لئے؟
لالہ و گل کو نئی رنگیں قبا دیتا ہے کون

کس کے ضربِ تیشہ سے جاگی ہے صبحِ جوئے شیر
دل پہ لیکن رات کا پہرہ لگا دیتا ہے کون

کون ہے وہ جس سے میری آرزو شرمندہ ہے
مجھ کو میرے حوصلے سے بھی سوا دیتا ہے کون

ایف ۲، پروفیسرز بنگلوز، گورنمنٹ گرلز پی جی کالج۔ موتی طویلا۔ اندور-م

اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی ساتھی کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

جب اس دن وہ الشورلس کمپنی میں ملازم اس محلے کے براؤن ہاؤز کے لئے دو ٹن لے کر واپس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاؤز کے گملے جیسے کو اپنے ہاتھوں میں تھامے اپنے دروازے پر ہی اس کی منتظر تھی۔ اس نے وہ سوال اپنے ذہن میں تیار کر لیا' اور جب اس عورت نے اپنی چیز اس سے وصول کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا

"میں اس عمارت میں ایک ایسی حالت میں۔۔۔"

لیکن اس عورت نے اس کی بات سنے بغیر اسے وہیں چھوڑ کر اپنا دروازہ بند کر لیا تھا' پھر ایک لمحے بعد وہ تیزی سے باہر نکل کر یوں چلنے لگی جیسے اس کے جوتے اس کے پاؤں کو تکلیف دے رہے ہوں۔ وہ ابھی تک وہیں عمارت کے داخلی راستے پر کھڑا تھا کہ اس نے اس عورت کی بڑبڑاہٹ سنی۔

"خدا کی پناہ۔۔۔ وقت تو میرے ہاتھ سے نکل گیا"

ایک پڑوسی دکاندار نے اس سے ایک بار پوچھا تھا

"حامو۔۔۔ میں نے آج تمہیں ایسے موڈ میں دیکھا تھا جیسے کہ تم کوئی بات۔۔۔ یعنی کچھ۔۔۔"

حامو گنجے نے محسوس کیا کہ جو کچھ اس کے اندر پک رہا ہے اس کا اظہار وہ اس شخص سے کر سکتا ہے' وہ اس کی بات سمجھ سکتا تھا کیونکہ وہ شخص اپنے اردگرد بکھری چیزوں کو اٹھا کر ٹوکری میں ڈال رہا تھا۔ حامو گنجے نے کہا'

"اصل میں بات یہ ہے میرے بھائی کہ کچھ عرصے سے میرا دماغ بعض معاملات کی وجہ سے الجھا ہوا ہے"

دکاندار نے اس کی ساری مطلوبہ چیزوں کو اٹھا کر ٹوکری میں رکھتے ہوئے کہا'

"اب جاؤ۔۔۔ میرے بھائی' جلد اپنے آقا کے پاس پہنچو۔۔۔ اس نے تو تمہیں ڈھونڈنا بھی شروع کر دیا ہے۔ مہربانی کر کے مجھے ان چیزوں کے پیسے پہنچا دینا"

اس عمارت میں رہنے والا سب سے پرانا مکین حقیقت میں حامو گنجے کو تیزی سے واپس آتے ہوئے اپنی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ جب حامو نے دوسرے فلور پر وہ ٹوکری اس کے دروازے پر اسے پکڑائی اور واپس جانے ہی والا تھا تو اس شخص نے اسے روک کر اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے حامو کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا:

"کیا وہ چلی گئی۔۔۔؟"

حامو اس کی بات سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ کوئی بڑے مخصوص انداز میں مسکرایا' تاکہ وہ اپنی بات کی وضاحت کر سکے' اس طرح اس کی مصنوعی دانتوں کی بتیسی اپنی جگہ سے ہل گئی اس نے دانتوں کو دوبارہ اپنے جبڑے میں صحیح حالت میں لاتے ہوئے پھر اپنی پلکیں جھپکائیں اور کہا'

"وہی پچلی منزل والی پڑوسن یار۔۔۔"

"وہ اچھا وہ۔۔۔ وہ تو ابھی نہیں گئی۔۔۔" "خدا تمہارا بھلا کرے مسٹر حامو۔۔۔"

جب پولیس والا وہاں سے چلا گیا اور باقی لوگ بھی وہاں سے بٹنے ہی والے تھے تو لینڈ لارڈ نے ان کرایہ داروں سے' جنہوں نے ابھی تک اپنا کرایہ ادا نہیں کیا تھا' ان سے کرائے کے متعلق بات کرنے کا یہ موقع غنیمت جانا' اسی لئے اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"بے چارہ چوکیدار۔۔۔ میں نے کبھی بھی اسے کچھ کہتے ہوئے نہیں پایا" ❁

حمیرا رحمٰن

کٹھ پتلی کا ایک تماشا مجھ میں رہتا ہے
نیند میں بھی اک جاگنے والا مجھ میں رہتا ہے

سورج اپنے لمس کی کتنی بھی شدت برسائے
اک ان دیکھے ابر کا ٹکڑا مجھ میں رہتا ہے

برگ اُڑے پھر بکھر گئے اوراق لباسوں کے
اب ان پیڑوں کا سناٹا مجھ میں رہتا ہے

اس سے جو کہنا چاہا تھا میں نے کہا نہیں
پھر اب کیوں اس بات کا کانٹا مجھ میں رہتا ہے

وہ بھی حمیرا اسی حویلی کا اک باسی تھا
وہ بھی سب سے کٹ کے تنہا مجھ میں رہتا ہے

3 - YOUNG AV
YONKERS N.Y. 10710
U.S.A

ابوالعبدودود

منظور ممتاز

شارع نور

وہ اپنے بستر پر بے چین تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ارد گرد دیکھا۔ رات کی تاریکی جھونپڑی میں ابھی تک چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اس جگہ ہاتھ بڑھایا جس جگہ اس کا شوہر سویا کرتا تھا' لیکن وہ تو ابھی گاؤں کے قہوہ خانے سے لوٹا ہی نہ تھا۔ وہ یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ اس نے معمول کے مطابق دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اسی لئے تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے جمائی لی اور سرد آہ بھری' کیونکہ وہی تھا' جس کا کام کبھی ختم نہ ہوتا تھا' ہر کام وہ خود کرتی تھی' جیسے ایندھن اکٹھا کرنا' پانی بھر کر لانا اور گاہے گاہے کھیت پر کام کرنے کے لئے اور آٹے کے لئے کام کرنا جسے پکا کر اپنے بچوں کے علاوہ خاوند کا پیٹ بھی بھر سکے۔

رخسار' ہتھیلی پر جمائے' وہ اپنے بستر پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ کس قسم کا مرد یا خاوند تھا؟ قہوہ خانہ اس کا گھر بن چکا تھا' جہاں بیٹھے وہ سارا دن گزار دیا کرتا تھا اور شامیں اس امید میں کہ کھانے یا سونے کے لئے گھر جا سکے' اگر قہوہ خانے میں وہ اونگھتا نہ رہا ہو تو وہاں بیٹھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اور صرف بھوک ہی اسے اٹھنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ اس کھانے کی قدر کیونکر کر سکتا تھا جس کے حصول پر اس نے تکلیف نہ اٹھائی تھی۔ جھونپڑی سے دن بھر غائب رہنے کے باوجود وہ شاید ہی اسے یاد آتا' لیکن رات کو وہ اس کے خیالات پر چھا جاتا اور اسے خوابوں میں بھی نظر آتا تھا۔

اس احساس سے اسے شدید اذیت ہو رہی تھی کہ وہ اس کا خاوند ہے اور بہر طور اس کے بچوں کا باپ بھی۔ اس میں شک و شبہ نہ تھا کہ اس کا رویہ اس سے جابرانہ تھا اور اس نے ناگوار الفاظ میں اس کی سرزنش کی تھی۔ وہ یہ نہ جان سکی کہ اب اس نے ایسا کرنے کی ہمت کیسے کر لی تھی۔ وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ وہ پھٹ پڑی تھی۔ جب وہ جھونپڑی میں داخل ہوا تھا اور بیٹھنے سے پہلے اسے یوں مخاطب ہوا تھا کہ

"روٹی دینے والی عورت کہاں ہے؟"

"تمہارا رات کا کھانا قہوہ خانے میں ہے" اس نے غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ وہ اسی جگہ جم کر رہ گیا اور اس نے بیوی کی خشمگیں نگاہ دیکھ لی تھی۔

"میں نے پوچھا تھا کہ رات کا کھانا کہاں ہے؟"

"اور میں نے کہا تھا کہ تمہارا کھانا قہوہ خانے میں ہے۔" اس نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

وہ اس کھلم کھلا نافرمانی کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور ایک ایسا تھپڑ لگایا' جس سے وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی اور روتی ہوئی چلائی۔

"مجھے مار ڈالو! مجھے مار ڈالو! زندگی تمہارے ساتھ تلخ ہے' جسے میں اور برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے بچوں کی پریشانیاں مجھ پر لاد دی ہیں اور اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری حماقت بھی اٹھاؤں" وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے بولے چلی گئی' "دوسرے باہر کھیتوں پر جا کر کام کرتے ہیں مگر تم قہوہ خانے میں جا کر بیٹھے نہیں تھکتے۔ تم وہاں مر ہی کیوں نہیں جاتے کہ تمہارا چہرہ دیکھنے سے بھی مجھے نجات مل جائے۔ بچوں کو ایسے باپ کی ضرورت نہیں' جو انہیں ضروریات زندگی مہیا نہ کر سکے۔"

اس نے اپنی آنکھیں آستین سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "بچوں نے وہ سب کچھ کھا لیا' جو میں اپنا پسینہ بہا کر لائی تھی مگر اس پر بھی ان کی بھوک نہ مٹی تھی اور وہ کوسنے بھوکے ہی سو گئے۔ اس جھونپڑی

واجد قریشی

❋

کھلی چھت پہ کھڑا ہوں سر برہنہ
کہیں سے کوئی تو پتھر برہنہ
کمک ناپید اور لشکر برہنہ
محاذ جاں ہے سر پر برہنہ
مری زنبیل جیسے گھر خدا کا
تمہاری آنکھ ہے کیوں کر برہنہ
غم لاحق کہاں لے جائے دیکھیں
شکستہ دل، شکستہ پر' برہنہ
سر خون جگر اب کیا رکھا ہے
گرفت خواب کا منظر برہنہ
مری تہذیب دیوار شکستہ
اور اس پر یہ کہ ننگے سر برہنہ
کہاں اب وہ نظر کی پاسداری
تمہارے بعد ہے یہ گھر — برہنہ!
کمندیں بے حصار و بے نشاں سب
مرے قدموں میں خشک و تر برہنہ

● شعبۂ اردو، گورنمنٹ گرلز کالج
معرفت والدہ مرحومہ کی نذر اجین (ایم۔پی)

میں ہر کوئی برا ہوتا ہے۔" اس نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا "تمہیں یہ دکھ اس لئے بھی ہے کہ میں نے اس سے شادی کی ہو سوچیں۔"

اس پر اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور تیزی سے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ شاید وہ جھونپڑی اور بیوی سے پیچھا چھڑا رہا ہو۔ وہ غصے میں تھا اور حیران بھی کہ اس کی بیوی نے ایسی ہمت کیسے کی؟

جہاں تک بیوی کا تعلق تھا، اس کے جانے کے بعد اس نے اطمینان محسوس کیا۔ آخر کار اس نے وہ غم و غصہ اگل ڈالا جسے شاید اس کے صبر نے جمع کر کے اپنے اندر قیدی بنا ڈالا تھا۔ اس نے شاید کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی تھی خصوصاً جب اس نے اسے مرد ہونے کا طعنہ دیا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ نہیں، اسے اپنے تحت الشعور پر پشیمان نہیں ہونا چاہئے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس پر بچوں کی پرورش کی ذمہ داری لاد دی ہے؟

وہ بڑبڑائی "ظالم!" وہ یہ بات اپنے والدین سے کہنے والی تھی، جنہوں نے اس کی زبردستی شادی کی تھی اور اس کی تقدیر اس کے ہاتھ دے دی تھی اور اس کی ذاتی کو خاوند کی سستی اور محنت سے باندھ دیا تھا۔

معاملہ سوا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ اٹھی اور اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک لمبا سفر کر کے تھکی ہے اور یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کتنی رات جا چکی ہے۔ اسے ایک جگہ جانا تھا جو خاصی دور بھی نہ تھی، لیکن راستہ دشوار گزار تھا۔ اس نے ایک عورت سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ زعفران سکھا دے گی۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس سے وہ اپنے بچوں کے لئے زعفران کا تھوڑا سا تیل اور شاید روٹی کا ٹکڑا حاصل کر سکتی تھی۔ وہ بستر پر ایک بار پھر لوٹی اور اپنے بڑے بچے کا کندھا ہلاتے ہوئے سرگوشی کی "[illegible]"

لڑکا جاگ گیا اور اس نے اپنی آنکھیں ملیں، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے کیوں جگایا گیا ہے اور اس سے کیا مطلب ہے۔ اسے اس کا پہلے بھی تجربہ تھا۔ ماں کو یاد آیا کہ اس کا خاوند ابھی لوٹ کر نہیں آیا اور بچوں کو وہ اکیلا کیسے چھوڑ دے؟ اس نے جھونپڑی کا دروازہ یہ دیکھنے کے لئے کھولا کہ کیا صورتحال ابھی ویسی ہے یا نہیں۔ اس کے خاوند باہر کھیت میں ایک ہیولا نظر آیا۔ اس نے اوپری نظر سے اسے دیکھا کیونکہ وہ یہ جاننے کی خواہش مند نہ تھی کہ وہ کیا ہے۔ اس نے فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا۔ اس کا خاوند یا چلا نہیں اور اس نے اپنے بچے کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گئی۔

جھونپڑی کے سامنے کھیت کو چھوڑ کر، شوہر کے پہلو میں گزرتی وہ ایک تنگ گلی کی طرف بڑھی، بچے کا ہاتھ پکڑے کھینچتی ہوئی وہ اسے لے جا رہی تھی اور بچے نے اپنی آنکھیں پیچھے لگا رکھی تھیں۔ وہ ذرا دیر کو یہ دیکھنے کے لئے رکا کہ اس کا باپ ابھی تک کھیت ہی میں بیٹھا ہے۔ ماں نے سختی سے اسے کھینچا اور کہا "جلدی چلو بچے، میرے ساتھ قدم اٹھاؤ۔"

جب بچہ اس کے پہلو میں آیا تو اس نے پوچھا "کیا تم خوفزدہ ہو؟"

"میں خوفزدہ نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"بابا آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

"اس لئے کہ وہ گھر کی نگرانی کر سکیں۔"

"ہمارے پاس تو کوئی ایسی چیز ہی نہیں، جسے چرایا جا سکے؟"

"وہ تمہارے بھائیوں اور بہنوں کے پاس رہیں گے۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو گا۔"

"کون جانتا ہے۔"

"میں بھی تو ان کے پاس ٹھہر سکتا تھا؟"

وہ اس کے دلائل سے چونک گئی اور کہا "بابا جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔"

غیاث متین

اب جو ملتا ہے تو وہ شخص کھنڈر لگتا ہے
اس کی ٹوٹی ہوئی آواز سے ڈر لگتا ہے

شاخ سے ٹوٹ کے پھل گرنے کا موسم آیا
اب سنبھالے سے نہ سنبھلے گا شجر لگتا ہے

ریت پہ اب جو چمکتے ہیں یہ زرد کے چراغ
یہ میری آبلہ پائی کا ثمر لگتا ہے

دھوپ دیوار سے مل مل کے گلے روتی ہے
اب کی بارش میں بچے گا نہ یہ گھر لگتا ہے

بس اسی بات پہ نکلا تھا وہ شمشیر بکف
اس کی دیوار کے لب سے میرا سر لگتا ہے

وقت ہونٹوں پہ دعا بن کے لرزتا ہے متین
آج کھل جائے گا وہ باب اثر لگتا ہے

۳/۵۳۶-۸-۱۱- نیو ملک پیٹھ،
حیدرآباد-۵۰۰۰۳۶

وہ خاموشی سے چلتی رہی اور بچہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بچے کے ہاتھ سے چھڑا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ خود کو پر اعتماد محسوس کر سکے۔ وہ ایک کھائی میں سے گزر کر دوسری طرف بڑھے۔ جب ساحل اور دیوار کے درختوں کے سائے نے انہیں چھپا لیا تو بچے نے پھر سوال کیا۔

"میرے بابا کیوں کام نہیں کرتے؟"

"انہیں کوئی کام نہیں ملتا۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے خاوند کے بچے کے سامنے کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے اور اس بات کو پھر دہرانا چاہتی تھی کہ بچہ ذہین نکلا اور بولا "ہمارے ہمسائے کھیتوں میں کام کیسے تلاش کر لیتے ہیں؟"

وہ اس کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کے قوی بازوؤں کا تصور کیا کہ اگر وہ کام کرنا چاہتا تو اس کے لئے کام پا لینا مشکل نہ تھا۔ بچے نے ماں کے پہلو سے لگتے ہوئے کہا "جب میں بڑا ہوں گا تو میں کام میں آپ کی مدد کروں گا۔"

اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا اور رو دی۔ اس کا خیال خاوند کی طرف گیا۔ اگر وہ قہوہ خانے میں سویا نہ تھا تو شاید وہ اب تک سو چکا ہوگا۔ نہیں' وہ نہیں سوئے گا کیونکہ اس کے الفاظ اسے الجھائے رہیں گے۔ وہ انہیں جلد نہیں بھولے گا۔ یقینا اس نے خاوند کا دل اور ضمیر چیر ڈالا تھا۔ ضمیر جو اس شدید تنگی اور ہلاکت سے شاید جاگ جائے۔ وہ اب اس کے الفاظ کے متعلق سوچ رہا ہوگا اور ایک ایک لفظ پر غور و فکر کر رہا ہوگا کہ اس نے ایسے الفاظ شادی شدہ زندگی میں پہلی بار سنے تھے۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو ممکن ہے وہ اسے پیٹے بھی' لیکن اب وہ اس سے کبھی نہیں ڈرے گی' بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا وہ اس سے دلیل سے بات کرے گی۔ اس کے بعد جو چاہے کرے۔ شاید وہ کوئی نیا ورق الٹے اور اس کی اور اس کے بچوں کی ضروریات پر توجہ دے اور یا شاید وہ بے کار ہی رہے اور اس کے الفاظ کا کوئی اثر نہ لے اور اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دے۔

وہ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ سڑک زیتون کے درختوں سے بل کھاتی تیزی سے ڈھلوان میں اتری اور پھر اوپر کو اٹھی۔ بھیانک خاموشی طاری تھی۔ جب وہ پہاڑی پر سے گزرے تو چاندنی نے انہیں گلے لگا لیا۔ لڑکے نے اس جگہ سے اوپر دیکھا۔ جس جگہ سے زیتون کے درختوں نے آسمان کو کھلا راستہ چھوڑ رکھا تھا اور کہا "چاند تو ایک روشن گیند ہے۔"

"ایسا ہی ہے میرے بیٹے!" اس نے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا' اور جب اس نے اپنی آواز میں کپکپی سی محسوس کی تو اس نے پھر کہا "تم چاند کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"ایسے ہی۔"

"تمہیں تو اپنے سامنے دیکھنا چاہئے۔"

"یہ اب ہمارے لئے سڑک کو روشن کئے ہوئے ہے۔" اس نے ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"تب تو تم قبرستان سے ضرور خوف زدہ ہوگے۔"

لڑکا خاموش رہا' تو اس نے کہا "لیکن مردے تو ڈرا نہیں کرتے۔"

وہ خاموش رہا' لیکن جب درختوں کے نیچے سے گزرے تو اس نے خوف سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ماں نے قدم ایک دم روک لئے اور اپنے سامنے روشن شاہراہ کو گھورنے لگی۔ جو زیتون کی جڑوں میں بل کھاتی ہوئی ان کے سامنے تھی۔ جب لڑکا سمٹ کر اس کے ساتھ آن لگا تو اس پر کپکپی سی طاری ہوگئی اور جب بالکل خاموشی طاری ہوگئی تو اس کے خون نے اس کی رگوں میں گردش بند کر دی۔ آخر ماں اپنے بچے کے ساتھ چھوٹی پگڈنڈی پر آگے بڑھی۔ ایک بار وہ دونوں پھر رکے اور بچہ ماں کے ساتھ لگتا ہوا بولا "اماں! لوٹ واپس چلیں۔"

اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا "ہمیں چلتے رہنا ہے"

"منزل ہماری ہمیں کہا جائے گی۔"

خالد محمود

❋

رنگ درامش، زمزمے، گلہائے تر ہوتے ہوئے
دل اکیلا اور اتنے ہم سفر، ہوتے ہوئے

آنسوؤں سے سرد ہو جاتی ہے ہر سینے کی آگ
میرا دل آتش کدہ ہے چشم تر ہوتے ہوئے

دل کی دنیا میں اندھیرا ہو تو کچھ روشن نہیں
آنکھ چشمِ سنگ ہے شمس و قمر ہوتے ہوئے

پھولنے پھلنے سے ہر ڈالی نہیں جھکتی کہ آپ
سرو کے مانند ہیں، شاخِ ثمر ہوتے ہوئے

چشم آگے ایک چہرہ' پاؤں گو چکر میں ہیں
دربدر ہوتا نہیں دل، دربدر ہوتے ہوئے

حوصلہ ٹوٹا تو وہ عبرت کا منظر آگیا
اڑ نہیں پائے پرندے' بال و پر ہوتے ہوئے

ہر کس و ناکس پہ کر لیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالدؔ باخبر ہوتے ہوئے

● شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

"میرے بیٹے! ہماری فرہت ہی غول بیابانی ہے۔"
"میری ٹانگیں آگے نہیں بڑھ رہیں۔"
"ہم لوٹ گئے تو کل ہمارے پاس تیل نہیں ہوگا۔"
ہم یقینا مر جائیں گے' ہمیں تیل نہیں چاہئے۔"
"میرے ساتھ چلے آؤ۔"
"میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہیں۔"
"میرے پہلو میں آجاؤ۔ گھبرو نہیں۔"
"میرے کانوں نے ہنساہٹ سنی ہے۔"
"مت ہو خدا ہمارے ساتھ ہے۔"
"غول بیابانی ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔"
"نہیں' یہ ہم ہیں جو اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"
"وہ ہمیں مار ڈالے گا۔"
"کبھی نہیں"
"یقینا"
"میں یہاں تمہاری حفاظت کرنے کو موجود ہوں۔"

اس نے خوف کے خلاف اپنی مدافعت کو گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ کیونکہ اس کی دائیں جانب سب کی سب بے حس ہو چکی تھی۔ روشن شاہراہ ناگزیر طور پر اس کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ اب تو کوئی نہ کوئی آفت ان پر ضرور آنی چاہیے۔ اس نے اپنے بچے کو اپنی بائیں جانب پکڑا' اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جان پر کھیلتے ہوئے بے تحاشہ آگے کو بڑھی تاکہ غول بیابانی کے پاس سے آگے بڑھ جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتی لڑکا جو مسلسل پیچھے کی طرف جھانک رہا تھا خوشی سے چلایا۔ اماں دیکھو! وہ غائب ہوگیا ہے۔"

جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ڈرانے والی اسے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ درخت کے تنے کے ساتھ وہ کوئی سفید سی شے تھی۔ جستجو کے لئے وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔ زیتون کے درخت کے لمبے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے سکھ کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس کا اعتماد اسے لوٹا دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ غول بیابانی تو درحقیقت تمو ہر کی ایک بڑی ٹہنی تھی' جسے چاندنی نے چمکا دیا تھا اور جس سے دونوں کے دلوں پر دہشت بیٹھ گئی تھی اور لڑکے نے کہا "چاند نے واقعی ہمیں ڈرا دیا تھا۔"

"میرے بیٹے! یہ ہمارا قصور تھا' جس نے ہمیں ڈرا دیا تھا۔"
"کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اس نے ہمارے لئے کیا کیا ہے؟"
"حقیقت تو یہ ہے کہ چاند نے ہمارے لئے سڑک کو روشن کیا ہے۔"
"یہ سچ ہے۔"
"آؤ! پھر چاندنی میں بڑھتے چلیں۔"

وہ معمولی سے قدم اٹھاتی آگے بڑھی اور اس کا بچہ الگ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بھی خوف سے آزاد تھا۔ لیکن اعتماد کے یہ لمحات مختصر ثابت ہوئے کیونکہ ہر ایک نے قبرستان کے متعلق سوچنا شروع کر دیا' جہاں انہیں کچھ بھی پیش آسکتا تھا۔ بل کھاتی لہراتی سڑک کے دونوں جانب قبرستان کے درمیان انہیں ایسے تجربات کا سامنا ہوا۔ جو اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ جوں ہی قبرستان کے نزدیک آئے' انہوں نے ایک دوسرے کو گرفت میں لے لیا۔ چمکتی ہوئی چاندنی میں قبریں چمک رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ان کے سامنے کوئی بھوت تک ناچنا شروع کر دے گا۔ اس نے اکثر ایسی کہانیاں سنی تھیں اگرچہ خود اس نے بھوت کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دیہاتی یہ کہا کرتے تھے کہ خصوصا اس قبرستان کے مردے ان لوگوں کو مسلسل ڈراتے ہیں' جو ان کے پاس سے گزرتے تھے۔ اور وہ جب بھی اس قبرستان سے گزرتی تھی ہمیشہ خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

نسیمہ سراجی

*

ہنسنے کو بھی جی نہ چاہتا ہے
رونے کا بہانہ کھو گیا ہے
اک شاخ ملال پر کوئی دل
پتے کی طرح لرز رہا ہے
پھر آئینۂ خیالِ جاناں
ہر سمت سے مجھ کو دیکھتا ہے
ہوں ایسے جدائی میں ہراساں
جیسے کوئی اسم کھو چکا ہے
ہر دَر کے رُخ پہ شاہِ دوراں
اپنی ہی شبیہ ڈھونڈتا ہے
بیکار ہے فکرِ دوش و فردا
مجھ کو مرا حال آئینہ ہے
اب فرصتِ آرزو بھی کم ہے
اب صورتِ آرزو بھی کیا ہے
کیا مجھ کو ڈرائے قیدِ ہستی
پہلو میں جو اک دریچہ وا ہے
ہم اپنا ہی غم عظیم سمجھے
اس شخص کا رنج بھی بڑا ہے

۳/۲۴ III، رمنا ۳/۱۰
اسلام آباد (پاکستان)

اس نے قبروں کو نظر انداز کر کے دور دیکھنا شروع کر دیا مگر جلد ہی اس پر نقاہت طاری ہوگئی۔ "کیا یہ قبروں کی قربت کی وجہ سے ہے؟" اس نے محسوس کیا جیسے قبرستان اس کے سینے کا بوجھ بن گیا ہو۔ جب بھی خاوند کے ساتھ گزری مصیبت زدہ زندگی کا خیال اسے آتا' تو قبر یاد آتی تھی اور یہ خواہش ابھرتی "کاش وہ بھی قبرستان کے مکینوں میں سے ایک ہوتی" لیکن اپنے بچوں کا خیال آتے ہی وہ اس قسم کی خواہش کو جھٹک دیتی تھی۔ وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی' کیونکہ یہ تو انہیں ہولناک مصیبت اور رنج و الم میں ڈالنے والی بات ہوگی۔ وہ انہیں کس طرح ایسے باپ کی تحویل میں دے سکتی ہے' جو اپنے پدرانہ فرائض کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔

اسے اس وحشت کا خیال آیا جو چند لمحے پیشتر اس پر طاری تھی اور آخر میں یہ کس طرح واضح ہوگیا تھا کہ اس کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ وہ تو محض فریب نظر تھا۔ اسی لیے اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے راستے پر چلتے جانا ہے کیونکہ مردے زندوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہمت و حوصلے کے باوجود اس کا دل ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ اس نے اپنے بچے کو بھینچ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ پشت پر وار کر کے کوئی اسے مار ڈالے گا۔ کم از کم قاتل کو وہ دیکھ لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لئے مڑی تو اس نے اپنے خاوند کو دیکھا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ غصے سے چلائی۔ "کیا تم ہمیں قبرستان پہنچانے آئے ہو؟"

خاوند کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اپنے بچوں کو آہستہ آہستہ دھکیلتی آگے بڑھتی رہی۔ خاوند نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ یہاں تک کہ اس نے' انہیں جا لیا۔ اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "دیر مت کرو' بچے گھر میں اکیلے ہیں۔" جوں ہی وہ اس کے پاس سے نکلا وہ اس کی طرف مڑا اور کہا "میں کھیتوں کی طرف جا رہا ہوں۔"

آخری الفاظ سن کر اس کا غصہ غائب ہوگیا اور اسے وہ الفاظ یاد آئے' جو اس نے آج شام اس سے کہے تھے۔ اس کا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا' اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے اور قبرستان میں سے گزرتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ❁

آپ نے خاص نمبر کے لئے کیا تیاری کی؟

شاید ہمارے بہت سارے قارئین شاعر اس انتظار میں ہیں کہ خاص نمبر شائع ہو جائے تو وہ اس کے حصول کی خواہش کریں لیکن شاید وہ اپنی اس سوچ میں صحیح نہیں ممکن ہے کہ انہیں مایوسی کے سوا کچھ اور نہ ملے۔ لہٰذا گزارش ہے کہ:

شاعر کا زرِ سالانہ اور جلد اوّل کی رعایتی قیمت ارسال کیجئے۔ اپنے بقایاجات کی جلد ادائیگی کیجئے۔ اپنے اشتہارات بھجوائیے۔ اپنے احباب کو خاص نمبر تحفے میں پیش کرنے کے لئے اس کی قیمت ارسال کیجئے' اردو کی نئی بستیوں کے قارئین شاعر سے بھی یہی گزارش ہے۔

حامد اقبال صدیقی

❁

مرے معبود مانا زندگی کرنا مقدّر ہے
مگر بے دست و پا جینے کی کوئی حد مقرّر ہے

ذرا ٹھہرو، ضروری کیا ہے پہلے اتنا طے کر لو
ہزاروں مسئلے ہیں، سب کا حل ہو جانا دو بھر ہے

تری قربت کا کوئی تو جزیرہ راہ میں آئے
یہاں حدِ نظر تک صرف یادوں کا سمندر ہے

گھنی تاریکیوں میں بھی مجھے رکنے نہیں دیتا
کسی کی یاد اس میں ہے، یہ دل کتنا منور ہے

وہی مرکز ہے اب بھی میری ہر اک سوچ کا حامد
اسی کی دسترس میں آج بھی خوابوں کا محور ہے

عین تابش

زندگی کا رنگ ہر غم کا نمائندہ رہے
ہم تو بس یہ کام کرنے کے لئے زندہ رہے

تجھ کو کھویا تو بہت سے کام ادھورے رہ گئے
تجھ کو کھو کر ہم تو اس دنیا سے شرمندہ رہے

ایک وحشت تھی کبھی جگنو کبھی خوشبو بنی
ہم دکھوں کی بھیڑ میں بھی روز رخشندہ رہے

ہم رہیں یا خواب ہو جائیں بس اتنا چاہیے
زندگی زندہ رہے اور خواب پائندہ رہے

وصل بھی تم تھے متاعِ ہجر بھی تم ہی ہوئے
ختم بھی ہم ہی ہوئے اور ہم ہی آئندہ رہے

(شعبۂ انگریزی، مرزا غالب کالج، گیا (بہار))

چنگیز آئتماتوف
محمود احمد قاضی

سپاہی کا بیٹا

وہ یہی کوئی پانچ سال کا ہو گا جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا اور وہ بھی فلم میں۔ یہ اس بڑے سے سفید بجلیوں کے باڑے کی بات ہے جہاں بھیڑوں کے گلے سالانہ اون اتروائی کے لیے لائے جاتے ہیں۔ یہ سلیٹ کی چھت والا بھیڑوں کا باڑہ آج بھی اسی طرح ریاستی فارم کی رہائشی سکیم سے تھوڑا باہر سڑک کے قریب پہاڑی کے دامن میں موجود ہے۔

وہ اپنی ماں بیبن گل کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ریاستی فارم پوسٹ آفس میں ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ ہر سال گرمیوں میں جب اون کترنے کا زمانہ ہوتا تو بیبن گل ایک عارضی ملازمہ کی حیثیت سے اس باڑے میں آ جاتی۔ بوائی اور میمنوں کی پیدائش کے دنوں میں سوئچ بورڈ پر اوور ٹائم لگا کر جو فالتو چھٹیاں اس نے حاصل کی ہوئی تھیں وہ انھیں یہاں استعمال میں لاتی تھی۔ یہ ایک جزوقتی کام تھا اور اس کا معاوضہ بھی معقول تھا۔ سپاہی کی بیوہ، بیبن گل کے لیے یہ فاضل آمدنی یقیناً بہت کارآمد تھی۔ اس کا کنبہ کوئی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بس وہ تھی اور اس کا بیٹا۔۔۔ لیکن بہرحال کنبہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اسے سردیوں میں ایندھن کی تھیلیں چڑھنے سے پہلے آٹے کی ایک معقول مقدار کی ضرورت تو رہتی ہے اور پھر کپڑوں اور جوتوں کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے اور اسی طرح کی دوسری بے شمار ضرورتوں کا سامنا اسے رہتا ہے۔

چونکہ گھر پر اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہیں تھا اس لیے وہ ہر صبح باڑے میں اس کو اپنے ساتھ لے آتی تھی۔ جہاں وہ سارا دن میلا کچیلا ہوتے ہوئے بھی اون کترنے والوں، گھنے بالوں اور موٹے بھاری پاؤں والے رکھوالی کے کتوں کے درمیان ہنستا کھیلتا اور کودتا پھرتا تھا۔

اس دن یہ وہی تھا جس نے سب سے پہلے فلم کے ٹرک کو باڑے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور سب سے پہلے اسی نے سب کو یہ خوشخبری سنائی تھی۔

"آیا سینما آیا سینما۔۔۔ سینما آیا سینما!!"

اس نے نہایت بے تابی سے شام ہونے کا انتظار کیا۔ اور جب اندھیرا پھیل گیا۔۔۔ تو فلم کا آغاز ہوا بہرحال اسے اس کے صبر کا پھل مل گیا تھا۔ یہ فلم جنگ کے بارے میں تھی۔ باڑے کے آخر میں دو بلیوں کے سہارے پھیلی ہوئی سفید سکرین جنگ کا میدان بن گئی۔ گولیاں چلنے لگیں۔ توپیں گرجنے لگیں اور تاریکی کا سینہ چیر کر پھٹنے والے ان کے گولے اور راکٹوں کے شعلے سپاہیوں کو زمین سے چپکے رہنے پر مجبور کر رہے تھے جونہی یہ شعلے بجھتے سپاہی ایک بار پھر آگے کی طرف بڑھنے لگتے۔ اور رات کے اندھیرے میں مشین گنیں یوں تڑتڑ چل رہی تھیں کہ رک کے لئے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔۔۔ ہاں جنگ ایسی ہی ہوتی ہے۔

وہ اور اس کی ماں اون کی گانٹھوں پر، جو باڑے کے پچھلے حصے میں پڑی تھیں چڑھ کر بیٹھے، یہاں سے سکرین بہتر طور پر دکھائی دیتی تھی۔ البتہ لڑکا وہاں فرش پر سکرین کے قریب اپنے ہمجولیوں کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا مگر ماں نے اسے وہاں نہیں بیٹھنے دیا۔

"تم سارا دن کافی اچھل کود کرتے رہتے ہو۔" وہ بولی۔ "صبح سے لے کر رات تک تمہارا یہی کام ہے۔ بس اب یہیں بیٹھو تم میرے قریب۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

پروجیکٹر چلتا رہا اور جنگ جاری رہی۔ باڑے میں موجود لوگ بڑی گمبھیرتا کے ساتھ بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم دیکھنے کے دوران بیبن گل بعض اوقات گہرے گہرے سانس لینے لگی اور جب کوئی ٹینک سیدھا

اپنی طرف ہی بڑھتا ہوا محسوس کرتی تو گھبراہٹ میں اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ چمٹا لیتی۔ ان کے قریب بیٹھی ایک عورت منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"ہائے میرے اللہ ـــــ یہ سب کچھ کتنا خوفناک ہے۔"

لیکن لڑکا کچھ زیادہ خوفزدہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس جب کوئی نازی سپاہی نیچے گرتا تو وہ ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا۔ جب وہ اپنے سپاہیوں کو گرتا ہوا دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جنگ میں لوگ ایسے مضحکہ خیز انداز میں گر رہے تھے جیسے لڑکے بالے جنگ کا کھیل کھیلتے ہوئے گرتے ہیں۔ دوڑتے ہوئے وہ بھی اسی انداز میں گر سکتا تھا جیسے کسی نے اسے اڑنگا لگایا ہو۔ یوں تھوڑی سی چوٹ تو لگتی ہے مگر بھلا اتنی چوٹ سے کیا ہوتا ہے۔ ایک لمحے بعد ہی انسان سنبھل کر پھر حملے کی پوزیشن میں آ جاتا ہے اور یوں وہ معمولی سی چوٹ بے معنی ہو جاتی ہے۔ لیکن فلم میں لوگ گر کر دوبارہ اٹھ کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ جہاں گرتے وہیں پڑے رہتے تھے چھوٹے چھوٹے سیاہ ڈھیروں کی مانند۔ اسے گرنے کا ایک اور انداز بھی معلوم تھا یعنی جس طرح کوئی پیٹ میں گولی لگنے سے گرتا ہے۔ ایسے میں لوگ فوراً ہی نہیں گر پڑتے' پہلے وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دوہرے ہو جاتے ہیں پھر آہستہ سے اپنے اسلحے سمیت زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ کھیل کے دوران تو گرنے کے بعد فوراً اٹھ کھڑا ہونے کے بعد اعلان کیا جا سکتا ہے کہ میں مرا نہیں ہوں لیکن یہاں فلم میں تو لوگ دوبارہ اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔

جنگ جاری رہی۔ پروجیکٹر سے گھرر گھرر کی آواز آتی رہی۔ اب توپ خانہ میدان میں آ گیا تھا۔ خوفناک آگ' دھوئیں اور پھٹتے ہوئے گولوں کے درمیان توپچی ایک ٹینک شکن توپ وہاں لا رہے تھے۔ گھاٹی کی ڈھلان پر وہ اسے دھکیلتے ہوئے پہاڑی کی چڑھائی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ایک لمبی چوڑی ڈھلان جو آسمان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور اس لمبی چوڑی ڈھلان پر گولوں سے چھلنی زمین کی مٹی کے سیاہ مرغولوں میں گھرے کچھ توپچی آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی بردباری اور حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی کہ دیکھنے والوں کے دل ان کے سینوں میں کسی متوقع خوف اور عظمت کے حوالے سے غم اور فخر کے ساتھ دھڑدھڑ کر رہے تھے۔ وہ تعداد میں چھ یا سات تھے ان کے لباس جل رہے تھے۔ ان میں سے ایک توپچی تو یقیناً روسی نہیں تھا۔ وہ قازق تھا یا شاید بریات۔ لڑکے کو تو شاید اس بات کا پتہ نہ چلتا لیکن اس کی ماں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"بیٹے دیکھو ـــــ یہ تمہارا باپ ہے۔"

سکرین پر موجود وہ آدمی ایک دم سے اس لڑکے کا باپ بن گیا۔ ساری فلم اسی آدمی کی کہانی بن گئی۔ لڑکے کے باپ کی کہانی ـــــ ابھی ابھی دریافت شدہ یہ باپ ریاستی فارم کے لوگوں میں سے سب سے کم عمر نوجوان کی طرح کا ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کا قد زیادہ لمبا نہ تھا وہ گول چہرے اور تیز آنکھوں والا تھا۔ کیچڑ اور دھوئیں میں لت پت چہرے پر موجود اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی وہ ایک بلی کی طرح پھرتیلا اور تند خو لگتا تھا۔ توپ کے پہیے پر اپنے کندھے کا زور لگاتے ہوئے اس نے مڑ کر پیچھے ڈھلان میں موجود کسی سے چلا کر کہا "جلدی سے گولے لاؤ۔"

لیکن اس کی آواز نئے پھٹنے والے گولوں کی بوچھاڑ میں دب کر رہ گئی۔

"کیا یہی میرا باپ ہے؟" آول بیک نے پوچھا۔

"کون" اس کی ماں نے بے دھیانی سے کہا "آرام سے بیٹھو اور دیکھو۔"

"ابھی تمہی نے تو کہا تھا کہ وہ میرا باپ ہے۔"

"ہاں ـــــ وہی تمہارا باپ ہے۔ لیکن چپکے بیٹھے رہو ورنہ تمہاری وجہ سے دوسرے لوگ پریشان ہوں گے۔"

بیبی گل نے ایسا کیوں کہا تھا ـــــ؟ کیا وجہ تھی؟ شاید یونہی اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی یا شاید فلم نے اسے اس کا کھویا ہوا خاوند یاد دلا دیا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو لڑکے کو اپنی ماں کی بات پر یقین

عذرا پروین

❀

مکٹ انا کا پھینک دے اس آگ میں اتار کر
نہ خود بھی اشکبار ہو، نہ اس کو اشکبار کر

میں بکھرے پھول ہو گئی ہوں مجھ کو پھر بکھیر دے
تو آ مرے نکھار کی پرت پرت اتار کر

میں خندقوں میں ہجر کے پڑی ہوں کیا ملال ہے
پلٹ کے آؤں گی میں خود کو اور بھی نکھار کر

اڑی ہوں اہتمام سے، فلک تو پھر دبوچ لے
یہ جراتیں شکار کر، یہ ساعتیں شکار کر

بدن بدن فقط نہیں، کسی کا آستاں بھی ہے
اسے عقیدتوں سے پڑھ، اسے نہ داغدار کر

جو ہجرتوں کے سلسلے ہیں، ان کو بھی سمیٹ لے
بدلتی ہر زمیں پہ نہ گریہ زار زار کر

● ۱۴/۲۰۱ عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ ۳

خورشید اکبر

تعلق رنگ ساحل پر کھڑی نیکی بدی نکلی
چھلکے دار سی انگڑائیاں لیتی ندی نکلی
یقینی اوّلین ساعتوں کے پاؤں کیا پھسلے
ہمارے درمیاں سے ایک شرمیلی صدی نکلی
عذابی رنگ نادروں میں بہشتی واہمے اترے
چمکتے آبلوں کی سرفروشی مندی نکلی
تھکے ہارے ارادے دھوپ کے ماتے ہوئے نکلے
تھکتی گنگناتی خوش خیالی بے گدی نکلی
قضا کی دسترس میں لمحۂ مجذوب کب ٹھہرا
سرِ خنجر خودی کھنکی صدائے سرمدی نکلی
عقیدت کی زباں پر سجدۂ تعظیم لرزاں ہے
وہ شاخِ پارسائی بھی گناہوں سے لدی نکلی
کلیسائے آرزو کی گم شدہ تاریخ شاہد ہے
مری تقدیر کی تحریر قفلِ ابجدی نکلی
جنکی بے بسی مرحوم خوابوں کی امانت ہے
یہ تحتی فاتحہ پڑھتی ہوئے مرقدی نکلی

معرفت: بک ایمپوریم، سبزی باغ ـــ پٹنہ

تھا۔ اسی لیے وہ بے حد خوش تھا۔ اس اچانک اور غیر متوقع طور پر مل جانے والی خوشی سے وہ جھوم رہا تھا اسے اپنے جنگجو باپ پر فخر تھا۔ یہ شخص اس کا باپ تھا۔ حقیقی باپ ـــ اس کے ہمجولی اکثر اسے اس بات پر چھیڑتے تھے کہ اس کا باپ نہیں ہے۔ انہیں اور چرواہوں کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس کا بھی ایک باپ ہے۔ چرواہے جو سال بھر پہاڑوں میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں وہ سب بچوں کو پہچانتے تو نہیں ہیں ـــ وہ جب بھیڑوں کی اون کتروانے کے لیے ہنکا کر انہیں باڑے میں لاتا تھا اور ان کے کتوں کو لڑنے بھڑنے سے روکتا تھا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ریاستی فارم کے تمام چرواہوں میں سے ہر کوئی اس سے یہ ضرور پوچھتا۔

"ہاں تو لڑکے تمہارا نام کیا ہے؟"

"آول بیک۔"

"اور تم کس کے بیٹے ہو؟"

"توکتوسن کا۔"

چرواہے کو فوری طور پر یاد نہ آتا کہ یہ توکتوسن کون ہے۔"

"توکتوسن!" گھوڑے کی زین سے نیچے جھکتے ہوئے وہ پوچھتا "کون توکتوسن؟"

"میں توکتوسن کا بیٹا ہوں۔" وہ پھر دہراتا۔

اس کی ماں نے اسے ایسا ہی جواب دینے کی ہدایت کر رکھی تھی اس کی نانا دادی کی ہدایت بھی یہی تھی۔ جب وہ اپنے باپ کا نام بھول جاتا تھا تو وہ اس کے کان کھینچا کرتی تھی۔ وہ بہت غصیلی تھی۔

"او اچھا۔" چرواہا کہتا۔ "تو یوں کہو نا کہ تم پوسٹ آفس میں کام کرنے والی اس ٹیلی فون آپریٹر کے لڑکے ہو نا؟"

"نہیں میں توکتوسن کا بیٹا ہوں۔" آول بیک اصرار کرتا۔

بالآخر چرواہا اس کی بات سمجھ ہی جاتا۔

"ہاں بھئی واقعی تم توکتوسن کے بیٹے ہو ـــ شاباش ـــ میں تو بس یونہی تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ خفا نہ ہونا میرے بچے ـــ دراصل ہم سارا سال وہاں پہاڑوں پر رہتے ہیں ـــ اور تم بچے لوگ تو کھمبیوں کی طرح پھلتے پھولتے ہو ـــ اب ہر بچے کو پہچاننا آسان تو نہیں ہوتا نا۔"

اور پھر چرواہے آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے توکتوسن کا ذکر کرنے لگتے ـــ وہ کہتے ـــ "وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ جنگ پر چلا گیا اب بہت سے لوگوں کو تو وہ یاد بھی نہیں رہا۔ یہ اچھی بات ہے کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بہت سے نوجوان تو غیر شادی شدہ ہی چلے گئے تھے اور اب یہاں کوئی ان کا نام لیوا نہیں رہ گیا۔"

اور اب جب کہ اس کی ماں نے اس سے کہا تھا "دیکھو بیٹے ـــ یہ تمہارا باپ ہے۔" تو اسکرین پر موجود سپاہی اس کا باپ بن گیا اور لڑکا اسے اپنا باپ ہی سمجھنے لگا اور واقعی وہ جنگ کے زمانے کی توکتوسن کی جنگی وردی والی اس تصویر سے بالکل مشابہ تھا جس کو اس کی ماں نے بڑا کروا کے شیشے کے فریم میں لگا رکھا تھا۔

اور اب آول بیک اس شخص کو ایک بیٹے جیسے احساسات سے دیکھ رہا تھا ـــ اس کا سراپا ایک انجانی مسرت کی پھوار میں بھیگ گیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے سکرین پر موجود شخص بھی محسوس کر رہا ہے کہ اس کا بیٹا اسے دیکھ رہا ہے اور اس لئے اب وہ فلم کی اس لحاتی زندگی میں اپنے آپ کو یوں دکھانا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اپنے سپاہی باپ کو ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رکھے۔ آول بیک کے لیے جنگ اب کوئی تفریح نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہ کبھی جنگ میں گرنے والے سپاہیوں کو دیکھ کر ہنس نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جان گیا تھا کہ جنگ ایک سنگین، خطرناک اور خوفناک چیز ہوتی ہے اور زندگی میں پہلی بار اپنے کسی پیارے کے لیے 'اپنے باپ' کے لئے جس کی کمی اس نے ہمیشہ ہی محسوس کی تھی دکھ سا محسوس کیا۔ پروجیکٹر چلتا رہا۔ جنگ جاری رہی۔ اب نہایت خوفناکی سے ٹینک زمین کو روندتے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔ ان کے بیچ گھوم رہے تھے اور

اسلامی ممالک کی کہانیاں

توپیں آگ اگل رہی تھیں اور توہیکی اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنی توپ کو اوپر کی طرف دھکیل رہے تھے۔

"ابا۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔ ٹینک۔۔۔ ٹینک آ رہے ہیں۔" کول بیک نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

آخرکار توپ پہاڑی کے اوپر پہنچ ہی گئی۔ اس نے سیب کی جھاڑی کی آڑ میں ٹینکوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ ٹینکوں نے جوابی حملہ کیا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ حالات اچھے نہیں تھے۔

جنگ کے شور اور شعلوں کے درمیان بیٹے نے اپنے آپ کو باپ کے قریب محسوس کیا۔ جب ایک ٹینک کو آگ لگ گئی اور وہ سیاہ دھوئیں میں چھپ گیا اور پھر ایک اور گولے نے ایک دوسرے ٹینک کے زنجیری پہیے کو توڑ دیا اور جب وہ غصے میں اندھوں کی طرح ایک ہی جگہ پر گھومنے لگ گیا تو لڑکا خوشی سے اپنی ماں کی گود میں اچھلنے لگا۔ لیکن جب اپنی فوج کے سپاہی توپ کے قریب گرنے لگے تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔۔۔ اپنے بہت کم سپاہی زندہ رہ گئے تھے ماں رونے لگی۔۔۔ اس کے گال گرم اور گیلے ہو رہے تھے۔

پروجیکٹر چلتا رہا۔ جنگ جاری رہی۔ لڑائی اب زوروں پر تھی۔ ٹینک اب لمحہ بہ لمحہ قریب آتے جا رہے تھے۔ توپ گاڑی کے قریب پہلو میں جھکتے ہوئے کول بیک کے باپ نے فیلڈ ٹیلی فون میں چیخ کر کچھ کہا لیکن لڑائی کی گھن گرج میں اس کے الفاظ سنائی نہ دیئے۔ توپ کے قریب ایک اور سپاہی گرا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ زمین پر گر گیا اور زمین اس کے خون سے سیاہ ہو گئی۔ اب صرف دو شخص باقی رہ گئے تھے۔۔۔ کول بیک کا باپ اور ایک دوسرا۔ انہوں نے ایک گولا چلایا پھر یکے بعد دیگر انہوں نے دو گولے اور داغے۔ لیکن ٹینکوں کی پیش قدمی جاری رہی۔ توپ کے قریب ایک بار پھر گولا پھٹا دھوئیں اور شعلے نے اس جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جب دھوئیں کا بادل چھٹا تو اس وقت ایک ہی آدمی اوپر اٹھ سکا اور وہ تھا کول بیک کا باپ۔۔۔ وہ توپ کی طرف جھپٹا۔۔۔ اس میں گولا بھرا۔۔۔ نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ یہ اس کا آخری گولہ تھا۔ دشمن کا ایک اور گولہ پھٹا جس نے ہر چیز کو دھوئیں کی نذر کر دیا۔ اس نے توپ کو نقصان پہنچایا اور اسے الٹ دیا۔ لیکن توہیکی ابھی بھی زندہ تھا۔ وہ آہستہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔۔۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے اور جل رہے تھے اس کے ہاتھ میں گرینیڈ تھا اور وہ سیدھا اپنی طرف آتے ٹینکوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی۔

"رکو۔۔۔ تم یہاں سے آگے نہیں جا سکتے۔" وہ چلایا اور اس نے گرینیڈ پھینکنے کے لیے اپنا ہاتھ لہرایا۔

وہ ایک لمحے کے لیے اسی طرح کھڑا رہا۔ درد اور نفرت سے اس کے چہرے کے خدوخال بگڑ گئے تھے۔

جمن گل نے اپنے بیٹے کا ہاتھ زور سے بھینچ لیا۔ لڑکے نے اپنا ہاتھ چھڑا کر اپنے باپ کی مدد کو اٹھنا چاہا۔ لیکن ٹینک کی مشین گن سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ برآمد ہوئی اور توہیکی نیچے گر گیا۔ وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ پیٹھ کے بل زمین پر گر گیا اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے۔

پروجیکٹر کی گھرر گھرر بند ہو گئی۔ لڑائی اچانک رک گئی تھی۔ ایک ریل ختم ہو گئی تھی اور آپریٹر نے دوسری ریل لگانے کے لیے روشنی کر دی تھی۔

جب باڑے میں روشنی پھیل گئی تو وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ وہ فلم میں پیش کی جانے والی جنگ کی فضا سے ایک بار پھر حقیقی دنیا میں لوٹ آئے تھے اور وہ لڑکا کول بیک اون کی گانٹھوں سے نیچے لڑھک آیا اور نہایت پرجوش انداز میں چلانے لگا۔

"یہ میرا باپ تھا۔۔۔ کیا تم نے اسے دیکھا۔۔۔ ہاں وہ میرا باپ تھا جو جنگ میں مارا گیا۔"

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ پہلے پہل تو کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ بات کیا ہے۔ بدستور جوشیلے انداز میں چلاتے ہوئے وہ اپنے ان ہمجولیوں کی طرف دوڑ پڑا جن کی رائے کی اس کے نزدیک بہت وقعت تھی۔ سارے میں عجیب قسم کی خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ ابھی تک اس بھولے سے بچے کے اس طرح بے حواس ہونے کو محسوس نہیں کر سکے تھے جس نے اس سے پہلے اپنے باپ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اظہار کے لیے

جمیل الرحمٰن

✽

اسیرِ شغلِ گریہ ہیں سمندر آشنا آنکھیں
بہت کچھ دیکھتی ہیں پیشِ منظر سے سوا آنکھیں

کوئی آوارۂ شب ہی انہیں ممکن ہے پہچانے
ہتھیلی پر لئے پھرتی ہے کس کس کی ہوا آنکھیں

تجھے بھی یاد ہوں شاید وہ موسم، پیار کے موسم
جدائی جن کیلئے تجھ سے ہوئی ہیں بارہا آنکھیں

چلو اسباب کھولیں اور کچھ باتیں کریں کھل کر
کہانی کہہ چکیں ہر سمت کی اب رہنما آنکھیں

جمیلؔ اک بار تو میں بھی یکایک چونک جاتا ہوں
دھڑک اٹھتی ہیں جب دل میں وہ زودِ سیماب پا آنکھیں

KORMELINK WEG -44
1104 NS - AMSTERDAM
HOLLAND

مناسب الفاظ نہ ملنے پر سب لوگ حیرانی اور پریشانی سے اپنے کندھے اچکا رہے تھے۔ آپریٹر نے ریل کا فلم اب بچے پھینک۔ اب کھل گیا اور وہ الگ الگ حصوں میں فرش پر لوٹک گیا۔ کسی نے اس بات کو محسوس نہ کیا۔ حتیٰ کہ آپریٹر بھی اسے اٹھانے کے لیے نہ جھکا اور وہ بچہ ابھی تک اپنے سپاہی باپ کے کارنامے کو فخر انداز میں پیش کیے جا رہا تھا۔

"کیا تم نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ میرا باپ تھا۔ میرا باپ جسے انہوں نے مار دیا۔" وہ بار بار کہتا رہا اپنے چاروں اور پھیلی خاموشی کو محسوس کر کے وہ اور زیادہ جوش میں آتا جا رہا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ سارے لوگ اس کے باپ کی بہادری پر اس کی خوشی میں شریک کیوں نہیں ہو رہے تھے؟

"خاموش" بالآخر ان میں سے ایک نے کہہ ہی دیا "تمہیں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالنی چاہئیں۔"

لیکن ایک دوسری آواز اسی لمحے ابھری۔

"وہ ایسا کیوں نہ کہے۔ جب کہ حقیقتاً اس کا باپ جنگ میں مارا گیا تھا۔"

تب ایک بڑی عمر کے لڑکے نے آول بیگ سے حقیقت بیان کرنے کی ٹھان ہی لی۔

"یہ اصل میں تمہارا باپ نہیں تھا۔" اس نے کہا "اور اسی لیے تمہیں اتنے جوش میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا باپ تھا ہی نہیں۔ یہ تو بس ایک اداکار تھا۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا تو بے شک آپریٹر سے پوچھ لو۔"

دوسرے لوگوں میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ بچے کو سچ بات بتا کر اسے اس لمحاتی خوشی سے محروم کردیتے۔ آپریٹر چونکہ یہاں کا آدمی نہیں تھا اس لئے اس کے خیال میں اسے انکسار کا موقع دینا بہتر تھا۔ لوگوں نے امید بھری نظروں سے آپریٹر کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی پروجیکٹر ہی پر جھکا رہا جیسے کہ وہ بہت مصروف ہو۔

"وہ میرا باپ تھا۔" آول بیگ بولا "وہ وہی تھا۔"

بھلا وہ ان میں سے کون تھا؟" بڑی عمر کے لڑکے نے استفسار کیا۔

"کیا تم دیکھ نہیں رہے تھے؟" وہی جو گرینیڈ ہاتھ میں لیے ٹینک کے قریب کھڑا تھا اور پھر گر پڑا تھا۔ بالکل ایسے۔"

آول بیگ نے زمین پر گر کر اسی طرح لڑھک کر دکھایا جیسے کہ اس کا باپ گرا تھا۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اور پھر گر پڑا اور پھر اپنے بازو پھیلائے ہوئے وہ پیٹھ کے بل سکرین کے سامنے چت لیٹ گیا۔ لوگ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے۔ لیکن لڑکا اسی طرح بے حس و حرکت وہاں پڑا رہا جیسے کہ وہ مر چکا ہو۔ وہ لوگوں کی ہنسی میں شریک نہ ہوا۔

ایک بار پھر ایک تکلیف دہ خاموشی نے لوگوں کو گھیر لیا۔

"بہن گل یہ کیا قصہ ہے؟" ایک بوڑھی عورت نے جھنجھلا کر پوچھا۔ تم نے اس بچے کے ذہن میں یہ کیسے خیالات سمو دیئے ہیں۔" غم زدہ بہن گل اپنی آنکھوں میں آنسو لئے اٹھی۔ وہ اپنے بیٹے کی طرف بڑھ گئی اور پھر اس نے اسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹا گھر چلیں۔" اس نے کہا "وہی تیرا باپ تھا۔"

اس نے لڑکے کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر وہاں سے چلی گئی۔

چاند طلوع ہو چکا تھا۔ رات کے گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں پہاڑی کی سفید چوٹیاں چمک رہی تھیں اور نیچے اسٹیپی کا بے انت اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

اب اس وقت زندگی میں پہلی بار لڑکے کو اپنے شدید نقصان کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جنگ میں اس طرح اپنے باپ کے گر جانے اور پھر مر جانے پر بہت زیادہ دکھی ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی وہ اپنی ماں سے لپٹ کر خود رونا اور اسے رلانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں رو نہیں پا رہی تھی۔ پس اس نے بھی زور سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور خاموشی سے اپنے آنسوؤں کو پی لیا۔

حالانکہ اس کا باپ بہت عرصہ پہلے جنگ میں مارا جا چکا تھا مگر اس لمحے وہ پھر سے اس کے اندر آ موجود ہوا تھا۔ زندہ! ❁

احمد سہیل

❁

خواب چھن جانے بھی آنکھوں سے تو کیا، یاد تو ہے
چاند ڈوبا ہے، مگر آسماں آباد تو ہے

رکھ دی تلوار مری، گردن پر شوق پہ کیسا
مارے جانے پہ مرے سجدہ جلاد تو ہے

قتل کی مانگی دعا اور سر مقتل آیا
زندگی خواب سہی، خواب کی بنیاد تو ہے

میں اندھیرے میں درختوں سے بھی ڈر جاتا ہوں
یہ شجر آج کے انسان کا ہم زاد تو ہے

تیرے کھو جانے کا غم دل کو بہت ہے لیکن
کس طرح تجھ سے بچھڑ جائیں گے یہ یاد تو ہے

قتل ہو جاتے ہیں کیوں شہر سیاہی میں لوگ
کچھ حساب ان کا کہیں مقتل برباد تو ہے

میری مٹھی میں چھپا ہے، مرا اک وقت غروب
زندگی کو یہ گماں ہے کہ مجھے داد تو ہے

321 - WEST PALESTINE AVE
PALESTINE
TX 75801 U.S.A

نور مراد سر خانوف

محمود احمد قاضی

مخطوطہ

میں ترکمان سائنس اکیڈمی کے لئے قدیم مخطوطات اکٹھے کر رہا تھا۔ اپنے اس کام کے ضمن میں ان چرواہوں کی بستی میں جا پہنچا جنہوں نے "کاراکم" صحرا کے وسط میں موجود ایک چھوٹی سی گہری وادی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

چونکہ یہ ایک قدرتی امر تھا' اس لئے وہاں کے رہنے والے یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کہاں سے آیا تھا اور یہ کہ وہاں میری موجودگی کا کیا مقصد تھا۔ میں نے انہیں اپنے کام کے بارے میں بتایا۔ اجتماعی فارم کے چیئرمین نے جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا اتنا بتایا کہ اس کے پڑوسی دلورت آنا کے پاس وہ چیز موجود تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

"یہ ایک نایاب چیز ہے۔" اس نے کہا۔ "دلورت آنا اپنے تمام اثاثے سے زیادہ قیمتی اسے ہی تصور کرتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ ایسی کتاب کو سونے کے صندوق میں رکھنا چاہئے۔"

میں اس کے مالک کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ دلورت آنا گھر پر ہی تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کی خوبصورت داڑھی اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے تجسس بھرے انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایک شکاری جیسا تھا مگر اس کا انداز دوستانہ تھا۔

"آؤ نوجوان۔ یہاں آتش دان کے قریب بیٹھو۔" اس نے بہت نرمی سے کہا اور مجھ سے سوالات کرنے لگا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اسے بتایا۔

"تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟ تمہارا قبیلہ کہاں ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟"

میں نے اختصار کے ساتھ اپنے متعلق بتایا اور گفتگو بڑھاتے ہوئے کہا کہ "مجھے اکیڈمی کی طرف سے قدیم مخطوطات کی کھوج لگانے کا کام تفویض کیا گیا ہے۔"

بوڑھے آدمی نے اپنی داڑھی کو تھپکتے ہوئے کہا "بہت اچھی بات ہے ــــــ بہت ہی اچھی۔"

اس نے مجھ سے مزید سوالات کئے اور پھر اپنی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کتاب لاؤ۔"

بوڑھی عورت خاموشی سے خیمے کی جالی دار دیوار سے لٹکے ہوئے موٹے کپڑے کے تھیلے کی طرف بڑھ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ اس نے کڑھائی شدہ ریشمی کپڑے میں لپٹی کتاب نکال لی۔ ایک مقدس یادگار کی طرح اس نے نہایت احترام کے ساتھ اسے اپنے خاوند کے حوالے کر دیا۔

بوڑھے آدمی نے دوبارہ میری طرف غور سے دیکھا۔

"جیسے تم نے بتایا ہے کہ تم خاص اسی مقصد کے لئے آئے ہو تو تم خود محسوس کرو گے کہ یہ کتنا قیمتی خزانہ ہے۔"

ہماری مخطوط ایک ایسے بدرنگ سوتی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا جس پر اب بھی معدوم ہوتے ہوئے قرمزی پھولوں کی باقیات موجود تھیں۔ اس کے ہر صفحے پر سرخ روشنائی میں عربی رسم الخط کی نہایت ہموار ہیں

فرحت ناز احمد

✽

چوڑیوں سے کنگن تک، لڑکیاں ادھوری ہیں
خواب گاہ سے چلمن تک، لڑکیاں ادھوری ہیں

تیل اور مہندی کی نکہتوں کے جھرمٹ میں
ڈولیوں سے آنگن تک، لڑکیاں ادھوری ہیں

اس نظر کی خاطر ہے، چشم و لب کی آرائش
ورنہ من کے درپن تک، لڑکیاں ادھوری ہیں

اُجلی لبادے تو ہیں بر وقت تھے، ورنہ
دل کی نرم دھڑکن تک، لڑکیاں ادھوری ہیں

دوسروں کی راحت میں ڈھونڈتی ہیں سکھ اپنا
ان کہی کی الجھن تک، لڑکیاں ادھوری ہیں

1030 - LAKESIDE PLACE
BALDWIN NY-11510
U.S.A

اسلامی ممالک کی کہانیاں

سطریں موجود تھیں۔ متن بالکل واضح تھا کیونکہ نقل کرنے والا اپنے کام سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ہر حرف ایک چھوٹے سے موتی کی طرح تھا۔ کتاب یقینی طور پر کثرت سے پڑھی جا چکی تھی۔ صفحات کے کونے مڑے ہوئے اور گندے تھے۔

میں نے چند سطور کا مطالعہ کرتے ہوئے جلدی جلدی ورق گردانی کی۔ یہ یقیناً ایک مخطوطہ تھا جس کی وجہ سے میرے جیسے پیشے سے منسلک لوگ، راتوں کو جاگتے، ایک بستی سے دوسری بستی تک سفر کرتے اور ہزاروں دروازوں پر دستک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سینکڑوں دور افتادہ مقامات پر خیموں کی خاک چھاننے پر شاید ایسی قیمتی چیز تلاش نہ کر پاتا جیسی کہ اس وقت میرے ہاتھوں میں تھی۔

سب سے اہم کام اپنے جوش کو بوڑھے آدمی سے چھپانا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ اپنی اس چیز کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف تھا۔ اسی لئے وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ "اس کتاب کا ہر لفظ ایک اوقتی اور اس کے بیچ جیسی قدر کا حامل ہے۔"

بوڑھے آدمی کا امتحان لینے کی خاطر کئی پیراگراف نہایت اونچی آواز میں پڑھے۔ جب میں چند سطریں پڑھ لیتا تو وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر اس کے آگے سے بیان کرنا شروع کر دیتا۔

"ہاں تو نوجوان اب تو تمہیں یقیناً پتہ چل گیا ہوگا کہ کیوں یہ کتاب ایک سونے کے صندوق میں رکھے جانے کے قابل ہے؟"

اس نے گائیکی کے انداز میں ایک نظم مجھے سنائی۔۔۔۔ یہ یقیناً اس کی پسندیدہ نظموں میں سے ایک تھی۔

"تم کو یہ کیسی لگی؟" اس نے پرجوش انداز میں پوچھا "جوں جوں تم پڑھتے جاؤ گے تم اس کے اسیر ہوتے چلے جاؤ گے۔"

یہ سب کچھ تو واقعی بہت اچھا تھا لیکن اب مسئلہ تو اس کتاب کو اپنے قبضے میں لینے کا تھا۔ بوڑھے آدمی سے اس کا حصول بظاہر ناممکن تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کی بیوی اور اس کے پڑوسی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا، موضوع ہی بدل دیا۔ میں نے بوڑھے آدمی سے پوچھا کیا واقعی اس کا قبیلہ آمو دریا میں فارم کرنے اور وہاں آباد ہونے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس نے میرے سوال کا جواب دیا اور کتاب کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اسے اس انمول خزانے کا مالک ہونے پر بہت فخر تھا اور وہ اسے اپنے سے جدا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میں نے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کے طریقہ کار سے متعلق اجتماعی فارم کے چیئرمین سے مشورہ کرنے کا سوچا اور وہاں سے چلا آیا۔

"اس کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ تو شاید مجھے اس کی نقل کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔" اجتماعی فارم کے چیئرمین نے جواباً کہا:

"اگر تمہیں اس کی اتنی شدید ضرورت ہے تو تم خود ہی اس کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالو میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اسی شام کو میں پھر دلنورت آغا سے ملنے جا پہنچا۔ ایک بار پھر اس نے مجھے نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ "میں جانتا تھا کہ تم پھر لوٹو گے۔۔۔۔۔ جو کوئی بھی میرے اس خزانے کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے دوبارہ ضرور آتا ہے۔ تم اس حوالے سے پہلے شخص نہیں ہو اور تم آخری بھی نہیں ہو گے۔"

"ٹھیک ہے اگر تمہاری خواہش ہے تو اس کا مطالعہ کر لو۔"

میں اپنے دل میں چھپی خواہش کو کسی حد تک آشکار کرنے پر تل گیا۔

"دلنورت آغا!"

"ہاں"

عزیز پری ہار

❋

سورج تارے لانا مت
منطق میں الجھانا مت
گھیرا ہے اک جادو کا
رمز کے اندر جانا مت
پیڑ کے پنچھی نیند میں ہیں
پیڑ کی شاخ ہلانا مت
خواب تو سارے سچ نکلے
رات گئے سو جانا مت
دھوپ سنہری مطلع صاف
اگلے موسم! آنا مت
عمر کو کہتے ہو بن باس
لوٹ کے اب تم آنا مت
کتنے روشن چہرے تھے
ان کی یاد دلانا مت
ڈھونڈنے اس کو نکلوں کیا
وہ جو کہتا "آنا مت"

● ایچ جی ۱۷۶۔ ہاؤسنگ بورڈ کالونی
فیروز پور روڈ، لدھیانہ۔ (پنجاب)

"کتنے عرصے سے یہ کتاب تمہارے پاس ہے؟"

"چالیس سال سے"

"چالیس سال سے۔۔۔؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں بیٹے"

"اچھا تو اسی لئے تمہیں اس کی بہت سی شاعری زبانی یاد ہے۔"

"اس کتاب کا ہر لفظ میرے دل پر نقش ہے۔ میں سارے کے سارے گیت گا سکتا ہوں۔ ان کی عظمت میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔"

"یہ کتنی غیر معمولی بات ہے" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمہیں اس کتاب کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی"

بوڑھے آدمی نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

میں قدرے پریشان سا ہوگیا مگر میں نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"تم جو چاہو اس کا معاوضہ مجھ سے لے لو مگر یہ کتاب تم مجھے دے دو۔"

بوڑھے آدمی میں ایک عجیب سی تبدیلی در آئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم پھیل سی گئیں۔ اس کی حالت غیر ہوگئی اور وہ پیلا پڑ گیا۔ بوڑھے آدمی نے کتاب اپنی بیوی کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"اسے فوراً واپس وہیں رکھ دو۔"

اپنی حالت پر قابو پاکر وہ دوبارہ نرم آواز میں بولا۔

"میرے بچے کیا میں اور میری بیوی نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت نہیں کر دی کہ ہم اسے کبھی اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

اور چونکہ تم مہمان ہو اس لئے ایک بار پھر میری تم سے یہ درخواست ہے کہ اس بات کو اب نہ دہرانا' اگر کسی طرح میں مان بھی جاؤں تو میری بیوی کبھی اسے دینے پر رضامند نہیں ہوگی۔ اگر وہ بھی ایسا کرنے پر تیار ہو جائے تو قبیلہ اس سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوگا۔ بدترین قحط کے دور میں بھی جبکہ گھر میں اناج کا ایک دانہ تک نہ تھا' میں اس کتاب کو بیچنے کا خیال بھی دل میں نہیں لایا۔ اور پھر اس کے علاوہ تم نہیں جانتے کہ یہ میرے قبیلے میں کیسے آئی؟"

بوڑھا آدمی خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ اتنی نرمی کے ساتھ گویا ہوا جیسے کہ وہ خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"کیا میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے اسے کیسے حاصل کیا تھا؟ میں نے یہ بات پہلے کسی کو نہیں بتائی۔۔۔ میرے اور میری بیوی کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اس کہانی سے واقف ہوگا۔۔۔"

"پلیز مجھے بتایئے۔۔۔ ولورت آغا۔" میں نے کہا اور ایسا کہتے ہوئے اب مجھے تجسس کو چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ولورت آغا نے اپنا ہاتھ خیمے کی دیوار پر مارتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔

"میں اس وقت ۷۵ سال کا ہوں۔ یہ کتاب میرے پاس پچھلے چالیس سال سے ہے۔ جس برس میں نے یہ کتاب حاصل کی اس برس کو بخ بستہ سال کہا گیا تھا۔ میں ان دنوں ایک چرواہا تھا۔ جیسے کہ میں ہمیشہ رہا ہوں اور مجھے اس بات کا کچھ شعور نہیں تھا کہ کتابیں کیسی ہوتی ہیں۔ میں نے صرف ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔ میں شادی کر چکا تھا اور اپنے ذاتی خیمے میں رہائش اختیار کر چکا تھا۔ تب میں نے ایک اونٹنی خریدی۔ چونکہ میں اب بال بچوں والا شخص تھا اور میری کچھ ذمہ داریاں تھیں' اس لئے میں نے موسم سرما کے لئے کافی مقدار میں اناج ذخیرہ کرنے کے لئے "ارکاچ" جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی اونٹنی پر کچھ اون لادی' تھوڑی سی لکڑی جلا کر کوئلہ حاصل کیا اور چل پڑا۔ میں "ارکاچ" میں کسی کو نہیں جانتا تھا اس لئے جس شخص کے ہاتھ میں نے اون اور کوئلہ بیچا تھا اس کے پاس ٹھہر گیا۔ وہ ایک امیر آدمی تھا۔ شام کے وقت قبیلے کے لوگ اکٹھا ہونا شروع ہوئے۔ ان میں سے ایک اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑے ٹھاٹھ والا لباس

سعدیہ روش صدیقی

غزل ہے کہ مقالہ کس جگہ ہے؟
مری جاں کا حوالہ کس جگہ ہے؟
میں ہوں سالار لیکن تم کہاں ہو
مرا دستہ رسالہ کس جگہ ہے؟
کوئی آشفتگی میں کیا بتائے
بیاباں میں سعالہ کس جگہ ہے؟
پر پرواز کو کھولوں سے تو پوچھوں
کہاں ہوں میں عبالہ کس جگہ ہے؟
کسی کی یاد تھی پیوند اس میں
وہ بوسیدہ قبالہ کس جگہ ہے؟
شہادت کے عوض راہ وفا میں
جو ملنا تھا دوشالہ کس جگہ ہے؟
میں اپنے آپ ہی کو ختم کر لوں
مگر ایسا مثالہ کس جگہ ہے؟
جو میرا وقت ضائع ہو چکا ہے
تو اب اس کا ازالہ کس جگہ ہے؟
کسی کے ہونے کا مجھ کو یقیں ہے
مگر وہ لامحالہ کس جگہ ہے؟
خبر کیا ہے کسی کو سعدیہ کی
رمیدہ وہ غزالہ کس جگہ ہے؟

P.O. BOX NO. 26555
ABUDHABI. U.A.E

پہن رکھا تھا۔ اور اس کی داڑھی شکم کے نیچے پر موجود شال جیسی تھی۔ اس کا چہرہ بھاری اور سرخ تھا۔ لوگوں نے اسے ملاں کہہ کر پکارا۔

تب مہمانوں میں سے ایک نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "محترم ملاں صاحب' کیا آپ ہمارے لئے کچھ پڑھنا پسند فرمائیں گے؟"

"کسی نے اسے یہ کتاب پکڑا دی لیکن ملاں نے انکار کرتے ہوئے کہا "یہ بے معنی ہے۔ اس کتاب کو ایک پاگل شاعر نے لکھا تھا جس نے مقدس عقیدے کی تضحیک کی تھی۔ یہ فرسودہ خیالات' گندگی اور کمین آلودہ لسیرتوں کا پلندہ ہے۔ یہ تو نہیں البتہ ایک اور چیز آپ کے لئے پڑھوں گا اور اس نے اپنے لبادے سے ایک اور مخطوطہ برآمد کیا۔ لیکن لوگ اس کو سننے پر آمادہ نہ ہوسکے۔ کسی نے اسے تحفہ دینے کا وعدہ کیا۔ تو اس نے پہلے والی کتاب ہی پڑھنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ آدھی رات تک پڑھتا رہا پھر صبح تک پڑھتا گیا اور میں نے ایک مبہوت شدہ شخص کی طرح اسے سنا۔ کتاب نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میرے اندر کچھ ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک میں سمجھ ہی نہ سکا میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ یہاں ایک شخص تھا جو کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا اور ان کے ذریعے ایک شخص کو زندگی کی کہانی سنائی جاری تھی' لیکن میں جو ہر ایک لفظ کے ساتھ اپنے آپ کو بندھا ہوا پارہا تھا' مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ میری ہی کہانی مجھے سنا رہا تھا۔ الفاظ بے حد واضح اور پرکشش تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کتابیں اتنی طاقتور بھی ہوتی ہیں اور زندگی کو اس خوبی سے بیان کرتی ہیں' بندہ چیزوں کو بالکل مختلف انداز میں دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے اس طرح سوچا' جیسے آج تم نے سوچا ہے شاید دنیا میں اتنی دولت موجود ہی نہیں جو اس کتاب کو خرید سکے کیونکہ ایسی چیزیں بکاؤ مال نہیں ہوا کرتیں ــــــ میرے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کتاب کی کوئی قیمت مقرر ہے اور میرے پاس اتنی رقم موجود ہو' تو مجھے اسے ضرور خرید لینا چاہئے۔"

اگلی صبح جیسے ہی میں نے اپنے میزبان کو دیکھا تو کہا۔

"پچھلی رات ملاں نے جو کتاب پڑھی تھی اس کی قیمت کیا تھی؟"

وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"اس کی کوئی مقررہ قیمت تو نہیں ہے کتاب کسی عورت کی شال یا گوٹوں سے بھری بوری نہیں ہوتی۔ تم آسانی سے اس کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے۔"

وہ پھر ہنس پڑا اور اس نے اس وقت کمرے میں موجود ایک مہمان کے ساتھ اپنی نظروں کا تبادلہ کیا۔ پھر وہ بولا: "اس کی قیمت ہے ایک اونٹ ــــــ ایک اچھا اونٹ۔"

شاید وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔ لیکن میں نے اس کے الفاظ کو سنجیدگی سے لیا اور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ فوری طور پر میں نے اسے اپنی اونٹنی دے دینے کا فیصلہ کر لیا جس پر سوار ہو کر میں "ارکانچ" آیا تھا۔

"میرے پاس ایک بہت عمدہ اونٹنی ہے جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہے۔ یہ دونوں لے لو اور مجھے کتاب دے دو۔"

میرے میزبان نے کہا۔

"ٹھیک ہے ــــــ اونٹنی چھوڑ جاؤ اور کتاب لے جاؤ ــــــ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

میں نے ایک نظر اونٹنی کی طرف دیکھا کتاب کو اپنی بغل میں دبایا اور واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر تک پیدل چلنے میں مجھے تین دن لگے۔

میری بیوی نے جب مجھے آتے ہوئے دیکھا تو چلاتے ہوئے کہا "ہماری اونٹنی کہاں ہے؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟"

میں نے کہا۔

"ذرا دم تو لو ــــــ میں تمہیں بتاتا ہوں ــــــ تم یقیناً سن کر خوش ہو جاؤ گی۔ ہمیں اپنی اچھی نسل کی اونٹنی کا اچھا نعم البدل ملا ہے۔ پھر میں نے اس کو کتاب دکھائی اور کہا۔ "یہاں اس کپڑے کے غلاف کے اندر ہر لفظ ایک اچھی نسل کی اونٹنی سے زیادہ قیمت کا حامل ہے۔"

راشد جمال فاروقی

خدا ہی جانے کہاں ہوئے گم، گمان و وہم و خیال سارے
جو خون اندر اچھل رہے تھے کہاں گئے وہ سوال سارے

بجا کہ اجداد عظمتوں کے پہاڑ تھے اور یہ بھی سچ ہے
کہ اب صحیفوں میں رہ گئے ہیں عروج سارے کمال سارے

تھکے لہو کے تمام دریا رگوں کے اندر ٹھہر گئے ہیں
پھڑکتے بازو کے دم سے زندہ تھے جیسے جنگ و جدال سارے

یہ ہم کہ ہر روز منتظر ہیں نئے عذابوں کی یورشوں کے
ہماری نسلوں کی قسمتوں میں لکھے گئے ہیں زوال سارے

جو امتحاں ہم پہ پیش ہے تھے تمام مخصوص نمبروں میں
کوئی بتائے کہاں ہیں آخر وہ آج راشد جمال سارے

۱۴۹۸-اے، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ
ویر بھدر، ۲۴۹۲۰۲، رشی کیش

میری بیوی نے کتاب دیکھی۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا پھر اس نے اسے ماتھے سے لگایا اور اسے اپنے چہرے سے مس کیا۔ اس کے خیال میں یہ ایک مقدس کتاب تھی۔ وہ وہاں خاموش کھڑی رہی اسے کچھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس وقت روئے یا ہنسے؟—— میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت اونٹنی کے متعلق سوچ رہی تھی جو ہمارے غریب گھرانے کی آخری امید اور سہارا تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ کیسے اس کتاب کو ملاں نے پڑھا تھا کیسے لوگوں نے اشتیاق سے اسے سنا تھا اور خود میں اسے سنتے ہوئے کتنا جذباتی ہوگیا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا اور جس نے میری یادداشت پر اپنی چھاپ لگا دی تھی۔ اس میں سے اسے کچھ کچھ بتایا۔ میں نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنسو امڈتے دیکھے۔

"تم تسلیم کروگے کہ تم نے ایک بے وقعت چیز کے لئے اپنی اونٹنی گنوا دی—— وہ ہمارے لئے سب کچھ تھی۔"

اپنی بیوی کی بات سن کر اس لمحے مجھے افسوس سا ہوا کہ میں نے کتاب خرید لی تھی—— لیکن میں کیا کر سکتا تھا؟ مجھے گاؤں کے سیانے آدمی کے پاس جانے کا مشورہ دیا گیا۔ میں نے اسے کتاب کے متعلق بتایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے کوئی ایسا شخص ملوا دے جو کہ یہ کتاب پڑھ سکے۔

اس نے حیرانی سے پوچھا:

"تمہیں یہ کیسے ملی؟"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ بہت سستی ملی ہے۔

اس نے کندھے اچکائے مسکرایا اور بولا:

"یہ تم نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔ اگر تمہیں یہ تحفے کے طور پر بھی ملی ہوتی تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اب اسے پڑھے گا کون؟" وقت گزرتا گیا اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ میری بیوی دن رات بڑبڑاتی رہی۔ میں نے لوگوں کے ساتھ بھی مشورہ کیا اور دوسری بستیوں میں بھی گیا لیکن مجھے ایسا کوئی شخص نہ مل سکا جو اس کتاب کو پڑھ سکتا۔ عام طور پر لوگ کہتے۔

"تم ایک غریب چرواہے ہو—— تمہارا ایسی چیزوں سے کیا واسطہ؟"

اور میں نے اپنا اعتماد کھونا شروع کر دیا۔ ایک دن میں نے اپنے اس خزانے کو بوری میں ڈالا اور پھر جو چیز میرے ہاتھ لگی میں نے اس کے اوپر بوری میں بھر دی۔ وہاں یہ کتاب ایک سال، دو سال—— پورے سات سال تک پڑی رہی۔ اور ان سات سالوں میں میری بیوی اپنی اس نسلی اونٹنی کو یاد کرکے روتی رہی جس کے ساتھ اس کا ایک کم سن بچہ بھی تھا اور وہ کہتی کہ "اب تک اس نے ہمیں تین مزید اونٹ دے دیئے ہوتے۔ ہم اس وقت امیر ہوتے ہمارے تمام دکھ دور ہو چکے ہوتے۔" اور پھر اچانک وہ مجھے جھاڑ پلاتے ہوئے کہتی "تم کسی ایسے شخص کو تلاش کیوں نہیں کرتے جو اس کتاب کو پڑھ سکے۔"

ایک دن جب ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے تو وہ کہنے لگی۔ "صرف ملاں اور عالم لوگ پڑھنا جانتے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں ہمیں اپنے بیٹے مورت جان کو کسی ایسے عقلمند آدمی کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجنا چاہئے؟ وہ وہاں پڑھنا سیکھ لے گا تو پھر وہ ہمارے لئے یہ کتاب پڑھ سکے گا۔ عالم اکشی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ لوگ کہتے ہیں وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمیں اپنے بیٹے کو اس کے پاس بھیجنا چاہئے ہم اس کے بغیر رہ لیں گے۔ اسے پانچ سال کے اندر لکھنا پڑھنا سیکھ لینا چاہئے۔"

میری بیوی کے الفاظ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ جہاں تک کتاب کے پڑھے جانے کا سوال تھا تو اس کے لئے کسی بھی چیز کے لئے تیار تھا۔ اور اسی طرح میں اپنے بیٹے کو عالم اکشی کے پاس لے گیا۔ میرے بیٹے کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی۔ میں نے عالم اکشی سے کہا۔

"ہم بہت دور سے ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ کیا آپ میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں گے؟ جب تک وہ آپ کے پاس رہے گا آپ اس کے آقا ہوں گے۔ اگر اسے مارنا پڑے تو اسے ماریں مگر اسے پڑھنا لکھنا ضرور سکھا دیں۔"

عالم نے مجھے امید دلائی۔

شہناز نبی

خوابوں کی دیواریں گر گئیں، آنکھ کھنڈر کا رونا کیا
سارے بدن میں ہُو کا عالم، دل کے نگر کا رونا کیا

اب کی مسافت میں وہ ہم کو یاد بہت آیا لیکن
اک آنگن بھر چھاؤں ہو جس کی ایسے شجر کا رونا کیا

اک بے منزل موڑ پہ دونوں پہنچے تو گم صم سے تھے
طے تھا الگ رستوں پہ چلنا، راہ گذر کا رونا کیا

اپنے آپ سے گھبرا کر ہم خود کو تنہا کرتے رہے
اب اپنے بیگانوں کے سفاک سفر کا رونا کیا

ہوا، سمندر، ساحل، سب ناراض تھے اپنے بازو سے
پار اتر نہ پائے ہم تو صرف بھنور کا رونا کیا

اُس جانب کے لوگ بھی خوفزدہ ہیں کالی آندھی سے
ہم نے اگر آنکھوں پہ رکھے ہاتھ، اُدھر کا رونا کیا

اندر اندر گرنے والے آنسو ہی سیراب کریں
گیلی مٹی کیسے بتائے شام و سحر کا رونا کیا

● ۲۸-اے، ڈپن لین —— کلکتہ

اس نے کہا:

"تم نے اپنے بیٹے کو یہاں میرے پاس لا کر اچھا کیا۔ جو کوئی میرا نمک چکھ لیتا ہے وہ فہم و ادراک کا مالک بن جاتا ہے' تم دیکھ لو گے کہ تمہارا بیٹا میری نگرانی میں کتنا ماہر ہو جائے گا۔ چار سالوں کے بعد جب آؤ گے تو اسے پہچان نہیں سکو گے۔"

میں نے اس پر اعتماد کیا اور خوشی کی لے میں جھومتا ہوا واپس لوٹا۔ میں نے بیوی سے کہا "غم نہ کر۔ چار سال بعد تم جان جاؤ گی کہ کتاب میں کیا لکھا ہے' پھر تم مجھے بتانا کہ میری غلطی تھی یا نہیں۔"

تین سال بیت گئے تو میں نے سوچا کہ اب تک صورت جان نے کافی کچھ سیکھ لیا ہو گا' اس لئے میں اس سے ملنے چلا گیا' لیکن میں نے وہاں کیا دیکھا؟

میرے بیٹے کو سارا دن اور ہر وقت کام میں لگائے رکھا جاتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سیکھا تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس سے یہ اتنی مشقت کیوں لی جاتی ہے۔ میرے بیٹے نے التجا کی کہ میں اس کو وہاں چھوڑ کر نہ جاؤں بلکہ اپنے ساتھ لے جاؤں' نہیں تو عالم اسے معمولی غذا کے عوض کام کرا کرا کر مار ڈالے گا۔ میرے بیٹے نے کہا "وہ تو خود جاہل ان پڑھ ہے' وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ ایک عالم کے بارے میں ایسی بات منہ سے نکالنا بری بات تھی۔ لیکن صورت جان نے "چلا کر کہا ابا اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے تو میں کہیں بھاگ جاؤں گا"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں پریشان ہو گیا اور میں نے اپنے بیٹے کی سچائی کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے عالم اکشی کے ایک ہمسایہ کو بلا کر اسے ساری صورتحال بتائی۔

میں نے اس سے پوچھا'

"کیا تمہارے خیال میں عالم میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دے گا؟"

اور جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میرا بیٹا سچ بول رہا تھا۔ عالم اکشی نہ تو پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا تو پھر کیا وجہ تھی کہ کئی تعلیم یافتہ ملاؤں سے زیادہ طاقتور تھا؟ اس کی طاقت اس کے خاندان کی طاقت میں پوشیدہ تھی کیونکہ اس کے خاندان کے پاس ایک بڑا راز تھا۔ سارا قبیلہ اس کے آباؤ اجداد کے بارے میں بات کرتے کرتے ڈرتا تھا۔ کسی کو ان کے خلاف بولنے کی جرات نہ تھی۔۔۔ لوگوں کی زبانی مجھے جس بات کا پتہ چلا وہ یہ تھی:۔

"ایک بار ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک کسان نے عالم اکشی کے آباؤ اجداد میں سے ایک کا' جو خود بھی ایک عالم تھا گھاس کا گٹھا چرا لیا۔ جب وہ شخص گھر پہنچا تو وہ گٹھے کو اپنی پیٹھ سے نیچے نہ اتار سکا۔ اس نے اپنی مدد کے لئے اپنے بیٹے کو بلایا مگر بے سود۔ چور پشیمان ہوا اور اس گھاس کے گٹھے کو واپس اسی جگہ رکھنے چلا گیا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ ساری رات وہ پریشانی کی حالت میں اس بوجھ کو پیٹھ پر اٹھائے گاؤں میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ مالک کے پاس واپس جائے اور اپنے جرم کو تسلیم کر لے۔

اس نے کہا "اے عالم' میں نے ایک جرم کیا ہے اور ساری رات اپنی بدی کو پیٹھ پر لادے پھرتا رہا ہوں۔ اچھے عالم میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں اور تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔ گھاس کو میری پیٹھ سے جدا کر دو۔ عالم نے اسے معافی دے دی اور اس نے اسے واپس اسی جگہ بھیج دیا جہاں سے اس نے گھاس کا گٹھا چرایا تھا۔ عالم کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا اور گھاس کا گٹھا چور کی پیٹھ سے نیچے گر گیا۔ عالم اکشی کا یہ بزرگ ایک جادوگر تھا اور ایسا ہی عالم اکشی بھی ہے۔ اس کی طاقت کا راز نمک میں مضمر ہے۔ اگر وہ نمک پر پھونک مارے اور جادوئی الفاظ ادا کرے' تو بے اولاد جوڑوں کو اولاد مل جاتی ہے اور بیمار شفایاب ہو جاتے ہیں۔"

جب میں نے یہ سب کچھ سنا تو میں نے وقت ضائع کئے بغیر صورت جان کو ساتھ لیا اور گھر واپس آگیا تاکہ وہ جادوٹونا نہ سیکھ سکے۔ میں قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ وہ نمک پر پھونک مارنا سیکھ لے۔

احمد محفوظ

کہانی کا اچانک ختم ہونا شام کیا تھا
کہ ساری رات ہم سوچا کئے انجام کیسا تھا

لئے پھرتے ہیں اب سود و زیاں کا بار کاندھے پہ
پس دیوار محرومی ہمیں آرام کیسا تھا

ابھی تک اک مسلسل شور تنہائی ہے بستی میں
ترے کوچے میں ہنگامہ تا کل شام کیسا تھا

چلو ساری دلیلیں ہم تمہاری مان لیتے ہیں
مگر یہ تو بتاؤ آخری پیغام کیسا تھا

وہ تنہا شخص جس کے درپئے آزار تھی دنیا
اسی کے ختم ہونے پر چہار سو کہرام کیسا تھا

۲۰۲- پیریار ہاسٹل جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۶۷

اس طرح مہینے اور سال گزرتے گئے۔ موسم بہار میں ہم نئی چراگاہوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اور خزاں میں ہم پھر وادی میں آجاتے ہیں۔ اور اس تمام عرصے میں یہ کتاب میری بوری میں پڑی رہی۔ بعض اوقات جب میں بہت افسردہ ہوتا تو اسے نکال کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ میں اسی انداز میں بیٹھتا جیسے ملاں بیٹھتا تھا اور اس کتاب کو ہر جگہ سے چھوتا مگر کوئی فائدہ نہ ہوتا۔۔۔ کتاب کو گی بنی رہتی میری بیوی پھر برا بھلا کہنے لگتی "اگر ہم نے اس موٹی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا ہوتا تو اسکے بجائے ہمارے پاس بہت اچھی نسل کے اونٹوں کا ایک ریوڑ ہوتا۔"

اور پھر ایک نئی صبح طلوع ہوئی اور ہماری بستیاں انقلابیوں کے زیر انتظام آگئیں۔ اب اساتذہ بھی آگئے اور انہوں نے ہمیں کتابیں لاکر دیں۔ ایک استاد ہماری بستی میں بھی گیا۔ اس نے سارے بچوں اور بڑوں کو جمع کر لیا جو پڑھنا لکھنا سیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے ٹیچر کو دیکھتے ہی اسے بہت پسند کیا اور اسے اپنی اس کتاب کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے کتاب لانے کو کہا اور چند روز تک اس نے یہ کتاب اپنے پاس رکھی۔

اس نے کہا "ولمورت آقا تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ بہترین ترکمانی مخطوطات میں سے ایک ہے۔ اپنے بیٹے کو سکول بھیجو میں اسے لکھنا اور پڑھنا سکھاؤں گا۔ میں اسے جلانے والی لکڑی اکٹھی کرنے یا پانی لانے نہیں بھیجوں گا۔ مجھے کسی غلام کی ضرورت نہیں۔ وہ چند سال تک سکول میں پڑھے گا اور پھر اپنی اماں اور ابا کے سامنے بیٹھ کر یہ کتاب پڑھے گا۔"

میں جانور چرانے کے لئے گئے ہوئے سورت خان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا میں نے اسے بتایا "تم اب سکول جاؤ گے سورت خان نے میری بات سنی مگر گھر جانے سے انکار کر دیا۔

"میں دوبارہ کسی ملاں یا عالم کو دیکھنا پسند نہیں کرتا" اس نے کہا "شہروں اور گاؤں میں اب انقلابی آگئے ہیں اور کسی عالم کی بیوی اب مجھے پانی ڈھونے پر نہیں لگا سکتی"

میں نے اسے سمجھایا کہ ہماری حکومت نے ہماری بستی میں ایک ٹیچر بھیجا ہے جو لوگوں کو پڑھائے لکھائے گا۔ بالآخر میں نے اسے قائل کر ہی لیا۔ وہ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتا باقی وقت میں وہ لکھنا پڑھنا سیکھتا آج کل وہ قریبی ضلع میں مویشیوں کی افزائش نسل کے ایک فارم میں منیجر ہے۔

جب وہ اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ گیا تو میں نے بوری میں سب سے نیچے پڑی کتاب نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی اس نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ تب میں نے جانا کہ کتابیں کوئی ماورائی چیز نہیں ہوتیں بلکہ انہیں ہم جیسے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں ایسے گیت بھی تھے جو ہم چرواہے لوگ گایا کرتے تھے۔ لیکن کتاب میں زیادہ تر ایسی نظمیں ہیں جو نیکی' بدی' سچائی اور جرأت سے متعلق ہیں جن کے ذریعے لوگ اپنی خوشیوں کو پانے کا گر سیکھتے ہیں۔ میں نے اس وقت یہ بھی جانا کہ اس وقت' جب ملاں نے اس کتاب کو پڑھا تھا تو میں نے بہت سی چیزوں کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھا تھا۔ جب میرے بیٹے نے اپنے خاندانی آتش دان کے پاس بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھا تو اس کا ہر لفظ' اپنی تمام تر' خوبصورتی کے ساتھ ہم پر عیاں ہوگیا۔ اس دن کے بعد سے میری بیوی اور بستی کے تمام لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ جب ولمورت آقا یعنی میں نے ایک اونٹنی کے بدلے میں اس کتاب کو حاصل کیا تھا تو میں نے کوئی دھوکہ نہیں کھایا تھا۔

"ہاں تو میرے بچے' اب تو تم نے جان لیا کہ اس کتاب کے لئے ہمیں کیا کیا کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ میرے کنبے کی یہ داستان سن کر بھلا کون ہوگا جو مجھ سے اس کتاب کو جدا کرنے کی جرأت کرے گا۔؟ یہ لو تم اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے پڑھو۔ مگر دوبارہ اسے مجھ سے نہ مانگنا۔۔۔"

یہ رات کا پچھلا پہر تھا جب ولمورت آقا نے اپنی کہانی ختم کی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے زیادہ مجبور کرنا زیادتی ہوگی۔ اگر میں اسے کہتا کہ ہم اشک آباد میں اس کتاب کی بہت سی نقلیں بنوائیں گے' تب وہ اور اس کے گاؤں کا ہر شخص ایسی ہی ایک کتاب کا مالک بن جائے گا تو شاید وہ میری سننے پر ہی تیار نہ ہوتا۔۔۔ اگر میں اسے کہتا کہ میں اسے یہ کتاب اسی حالت میں دو یا تین ماہ بعد واپس کردوں گا تو وہ تب بھی نہ مانتا۔۔۔ یہ سب کچھ ناممکن تھا کیونکہ یہ کتاب اس کی روح تھی یہ اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔

راجیش ریڈی

اترے گا کب زمیں پہ خدا آسمان سے
گذرے گا کب تلک یہ جہاں امتحان سے

پیاسی زمیں کی پیاس تو پھر بھی نہ بجھ سکی
بادل نہ جانے کیتے گئے اپنی جان سے

سورج کے ساتھ ڈوب گیا دل درخت کا
لوٹے نہیں پرندے کیوں ابتک اڑان سے

رکھی ہوئی ہے سینے میں سب کے کتاب دل
پڑھتا کہاں ہے کوئی مگر اس کو دھیان سے

کانوں کو جھوٹ سننے کی عادت ہے اس قدر
سچ کہہ کے چونک جاتا ہوں اپنی زبان سے

دنیا کو حال دل ہی سناتا تو ہوں مگر
ٹکرا کے لوٹ آتی ہیں موجیں چٹان سے

پہچان کل تلک تھی مکیں سے مکان کی
اب جانتے ہیں لوگ مکیں کو مکان سے

۷-اے فلیٹ نمبر ۴۰۴، بلاک اشٹ
انٹاپ ہل - بمبئی ۳۷

اسنیٰ بدر زبیری

شام ڈھلی اور ڈار جھکانا بھول گئے
سورج کو رخصت کروانا بھول گئے

سیتا نے جنگل میں ایسا رقص کیا
رام محل کو واپس جانا بھول گئے

میرا نے بے گانے پن میں زہر پیا
کرشن تو سب جانا پہچانا بھول گئے

اس نے کچھ یوں خوشبو کو آکار کیا
حیرت کے مارے شرمانا بھول گئے

آنکھیں یوں روشن کر دیں جگنو رکھ کر
آنسو اپنا دوست پرانا بھول گئے

نئے دکھوں نے کچھ ایسے آباد کیا
زخموں کا موجود خزانہ بھول گئے

● اماں شہید روڈ، ہمیرپور (یوپی)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

۔ میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔
"ولورت آقا"
"کہو بیٹے کیا بات ہے؟"
"کیا تم ایک عنایت کرو گے؟"
"کیسی عنایت؟"
"اسے میرے ہاتھ بیچ دو۔"

اس نے قہقہہ لگایا اور اپنی داڑھی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھپکا۔ اس لیے وہ ناراض نہیں ہوا اور نہ ہی میرے الفاظ کو سنجیدگی سے لیا۔

"نہیں میرے عزیز مہمان ـــــ یہ بکاؤ نہیں۔ــــ دنیا میں چند ایسی چیزیں بھی ہیں جو کسی قیمت پر خریدی نہیں جا سکتیں۔ــــــ"

"لیکن بہرحال اسے کسی نے تمہارے ہاتھ بھی تو بیچا تھا؟"

"لیکن وہ بہت خسارے میں رہا" وہ پھر ہنسا۔

میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہم نے بہت دیر تک آپس میں تبادلہ خیال کیا اور آخر اس کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔

"اچھے نوجوان" اس نے کہا "اگر تم اس کتاب کے اتنے ہی گرویدہ ہو گئے ہو تو بیٹھ کر اس کی نقل کر لو۔"

میں نے ولورت آقا کے خیمے میں بیٹھ کر دو ہفتوں میں اس قیمتی مخطوطے کی نقل تیار کی۔ وہ زیادہ تر وقت میرے پاس بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر مجھے لکھوانے لگتا اور بعض اوقات خاموشی سے مجھے کام کرتا ہی دیکھتا رہتا۔ مجھے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ اکثر کہتا "میں کسی قدر پڑھنا تو سیکھ گیا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ کبھی لکھنا نہیں سیکھ سکوں گا۔" بوڑھی عورت چائے اور کیک سے ہماری تواضع کرتی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی دوسرا مشروب بھی لے آتی۔ــ اب ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔

ولورت آقا کے پاس چالیس سال سے جو انمول نظمیں تھیں ان کے مصنف ترکمان کلاسیکی شاعری کا موسس اور مشہور شاعر مختوم قلی (فراغی) (۱۷۳۰ء۔۱۷۸۰ء) نے زیادہ تر حملہ آور ایرانی بادشاہوں، بخارا کے امیروں اور کھیوا کے خانوں کو پسپا کرنے کے لئے ترکمانی قبائل کے اتحاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے لکھا تھا۔ ❀

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی
(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت	بمبئی
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی
پتا	ویناٹھ بلڈنگ ہیرا استرا فالکلنڈ روڈ بمبئی ۴
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی
پتا	ویناٹھ بلڈنگ ہیرا استرا فالکلنڈ روڈ بمبئی ۴
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
قومیت	ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط ناظر نعمان صدیقی ۲۸ فروری ۹۹ء

شاعری کا معیار کیا ہونا چاہیئے۔ ہماری قومی و اخلاقی تعمیر کے لئے بازاری شاعری زیادہ مفید ہے یا خانقاہی؟ ہمیں روحانی و حقیقی لذت و کیف سے سرشار ہونا چاہیئے یا مادّی و مجازی جذبات سے؟ ۔ میری رائے ناقص میں اگر یہ صحیح ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" ، تو اس میں پیغمبرانہ اور ملہمانہ شان ضرور ہونی چاہیئے تاکہ شاعری کے ذریعے مادّی فضاؤں کا تکدّر اصلاح یاب ہوتا رہے اور ہم اپنی قوم کی سیرت و اخلاق میں بلندی پیدا کرنے کے قابل سمجھے جانے لگیں۔

ہماری شاعری میں وہ تمام باتیں موجود ہوں جن کا تعلق درس و پیام سے ہے ہمارے اشعار سننے والوں کے لئے وجہ تفریح نہ ہوں بلکہ سبب فکر و غور ہوں۔

[۱۲واں خطبہ ۔ ۲ مارچ ۱۹۴۳ء]

سیماب اکبرآبادی

مارچ ۱۹۹۶ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۳۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ــ ۱۵ پونڈ

مراسلت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۷۷۰۰ ، گرگام پوسٹ آفس ممبئی ۴۰۰۰۰۴
دفتر کا پتہ: ۲۰۲ ، رسالہ بلڈنگ ... مارگ ممبئی ۴۰۰۰۰۴

فیض احمد فیض، ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان سہ بار کینیڈا تشریف لے گئے تھے۔ افسانہ نگار رحیم انجان نے پہلی بار انہیں ٹورنٹو میں مدعو کیا تھا۔
یہ اقتباس اشفاق حسین کی مرتبہ حالیہ اہم کتاب "مطالعہ فیض: امریکہ و کینیڈا میں" [مطبوعہ ۱۹۹۴ - دہلی] سے لیا گیا ہے۔

جون ۱۹۸۱ء میں فیض احمد فیض جب حکومت کینیڈا کی دعوت پر کینیڈا تشریف لے گئے تو نجی محفلوں میں یہ گفتگو رہی کہ یہاں سے کوئی ادبی رسالہ شائع کیا جائے جس میں نہ صرف کینیڈا بلکہ پورے شمالی امریکہ اور یورپ میں بکھرے ہوئے اردو اہل قلم کو یکجا کیا جا سکے۔ فیض صاحب نے اس خیال کی حمایت کرتے ہوئے رسالے کے مدیر اشفاق حسین کو نہ صرف یہ کہ ممکنہ تعاون کا وعدہ دیا بلکہ رسالے کی مجلسِ مشاورت میں بھی شریک رہے۔ رسالے کا نام "اردو انٹرنیشنل" تجویز ہوا۔ مواد کی فراہمی کے لیے فیض صاحب نے اپنے احباب کو خطوط لکھے۔ انہیں میں سے ایک خط مطالعہ فیض سے یہاں دیا جا رہا ہے۔ [ادارہ]

[۱۳ فروری ۱۹۱۱ء — ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء]

فیض احمد فیض

پہلی بار

ٹورنٹو مدعو کیے جانے پر

ٹورنٹو میں کچھ احباب ہمارے نام پر ایک محفل منعقد کرنے والے ہیں۔ اوّل تو اپنے ذکر پر رشک آیا جو مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ پھر اس بات سے مسرت ہوئی کہ دیارِ فرنگ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو "جوئے دیگراں" سے پیالہ بھرنے کی بجائے اپنے گھر کی کشید سے بزم چراغاں کرنے پر مصر ہیں۔ مجھے دل کی مفلسی کا احساس بھی ہے، رشتۂ درد کی عظمت کا احساس بھی اس لیے اگر آپ لوگوں نے اپنی محفل میں شمع میرے سامنے رکھی ہے تو آپ کا شکرگزار ہوں لیکن زیادہ مسرت اس بات سے ہے کہ آپ کو اُس رشتۂ درد کا عرفان ہے جو ہمارے تخلیقی سرمائے کا جوہر ہے۔ یوں ہمارے قومی اور لسانی ادب کے نام لیوا تو اب بہت ہیں لیکن جس لگن تن دہی اور باریک بینی سے اہل مغرب نے اپنے ادبی ورثے کو سمجھنے اور سُلجھانے کی سعی کی ہے ہمارے ہاں ابھی عام روایت نہیں بن پائی۔ پھر یہ بھی ایک عام مغالطہ ہے کہ شعر و ادب سے صرف اُن لوگوں کو واسطہ رکھنا چاہیے جو اس فن سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہیں۔ دوسرے علوم کے طلباء کو شعر و سخن کی گتھیاں سلجھانے میں تضیع اوقات کی کیا پڑی ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں۔ دراصل قومی شعر و ادب کا ذوق شعور نزاکتِ احساس یعنی SENSIBILITY کا ایسا بنیادی جزو ہے کہ اس کے بغیر کسی بھی علم کی خاطر خواہ تکمیل نہیں ہو سکتی اور اگر ایسا ہو بھی تو وہ کیف اور فرحت جو اکتسابِ علم سے ہم پہنچنی چاہیے ہاتھ نہ آئے گی۔

علی سردار جعفری کے نام

ٹورنٹو

۵ / جون ۱۹۸۱ء

برادرم سردار، سلام اور پیار

اس دیارِ فرنگ میں ہمارے کچھ ترقی پسند برخوردار ایک بڑھیا قسم کا اردو رسالہ نکالنے کی فکر میں ہیں جس کے کچھ اسباب وہ فراہم کر چکے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ سمندر پار کے شائقین ادب کے لیے تسکینِ ذوق کا کچھ سامان بہم ہو سکے اور امریکہ، لندن، کینیڈا وغیرہ میں جو پوچ اور رجعت پسند خرافات شائع ہو رہی ہے کچھ اس کا بدل بھی پیدا ہو جائے۔ آپ سے ہدایت اور اعانت کے خواستگار ہیں، ان کی خلوص نیت کے بارے میں مجھے اطمینان ہے اس لیے مہربانی سے توجہ فرمایئے اور اپنے احباب کیفی، مجروح، بیدی، شہریار و کلہم اجمعین سے ہمارے حوالے سے انہیں متعارف بھی کروا دیں۔

مخلص

باقی ملاقات پر۔ سلطانہ کو پیار

فیض

شمارہ نمبر ۳ [۱۹۹۶] جلد ۴۶ - مارچ ۱۹۹۶

اردو کی نئی بستیاں

سرورق
حسنِ ابتسام
عمل
سلطان سبحانی

ہم عصر اردو ادب نمبر کی تکمیل کے دوران اردو کی نئی بستیوں کے باب میں مسودوں، کتابوں اور ماخذات کی چھان پھٹک کرتے ہوئے دو شمارے ترتیب پا گئے۔ اس نوع کے شماروں کی ترتیب کا پہلے سے کوئی ارادہ کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ خاص نمبر کی تکمیل اور عام شماروں کی ترتیب، ہم نے اپنی گرفت کو کہیں بھی کمزور نہیں ہونے دیا ہے۔ عام شماروں کی مسلسل اشاعتوں اور ہر شمارے کو تخلیقی شمارہ بنا دینے کی خواہش اور کوشش کہیں کم نہیں ہوئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خاص نمبر کے لئے شدتِ انتظار نے کئی اہم شماروں کو وہ پذیرائی نہیں دی جس کی ہمیں توقع تھی۔ لیکن یہ امر بھی باعثِ طمانیت ہے کہ شاعر کے بے شمار قارئین کا ذوقِ تجسس کبھی کم نہیں ہوا اور اسی ذوقِ تجسس کے لئے ہم نے بھی عام شماروں میں کوئی نہ کوئی تخلیقی بابت پیدا کرنے کی سعی ضرور کی ہے۔ ایسی ہی تخلیقی بابت کے نام یہ دو شمارے آپ کی نذر ہیں۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کے اعلان کے بعد "اردو کی نئی بستیاں نمبر" کا اعلان بھی ہم نے کیا تھا کئی پروجیکٹ پر بہ یک وقت کام کرتے ہوئے ۱۹۹۱ء سے تا حال اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کو ہم شاعر کے صفحات پر پیش کرتے رہے ہیں۔ کئی عام شماروں کو اس موضوع پر خصوصی شماروں کا روپ دیا ہے لیکن جب بھی مذکورہ خاص نمبر شائع ہوگا اپنے موضوع پر پہلا ایک غیر معمولی تحقیقی و تخلیقی کارنامہ ہوگا۔ اگر ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کی دونوں جلدوں میں، اردو کی نئی بستیوں سے اتنا کچھ مواد دیا جا رہا ہے کہ علیحدہ سے اس سارے مواد کو ترتیب دیا جائے تو ایک خاص نمبر بن جائے۔ ان دو شماروں ہی سے قارئین شاعر کو کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ ہم عصر اردو ادب نمبر میں اردو کی نئی بستیوں سے کتنا وقیع، متنوع اور دلچسپ تحقیقی و تخلیقی مواد دیا جا رہا ہے۔

اردو کی تمام نئی بستیوں تک ہماری رسائی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ہماری کوششیں برابر جاری ہیں۔ کیوں کہ ہم اپنے کام کو مثالی بنانا چاہتے ہیں اور یہ آسان نہیں۔

[illegible]

عبد القوی ضیاء
961 - AUGER AVE
SUDBURY ONTARIO
CANADA P3A 4A7

مہجر ادب

اس دور میں ہجرت کے بہت سے جواز ہیں۔
فکرِ روزگار۔ معاشی بہبودی۔ اقتصادی خوشحالی۔ تلاشِ عافیت۔ بہتر ملازمت۔ تحصیلِ علم و ادب۔ اکتساب دانش و بینش۔ اپنے ملک میں ناسازگار حالات۔ کلچرل ایکسچینج۔ امیگریشن کورٹ۔ لاٹری کورٹہ۔ گرین کارڈ۔ ورکنگ یا بزنس ویزا۔ فیملی اسپانسرشپ، چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ میل آرڈر دولہا دولہن۔ اگر ان میں سے کوئی صورت کارگر نہ ہو تو غیر قانونی یا جعلی طرائق کا استعمال۔

ہجرت کے اسباب اور حالات خواہ کچھ ہوں مگر نقلِ وطن اور ترکِ مکانی خود ایک جانسوز مرحلہ اور پیچیدہ مسئلہ ہے ایک زمین سے دوسری زمین کا سفر طول بھی ہے طوالت طلب بھی۔ یہ راستہ دشوار گذار بھی ہے خار زار بھی۔ اس میں نہ جانے کتنے سانحات۔ حادثات، تجربات اور واقعات سر چھپائے رہ نوردانِ سفر کی گھات میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں کہ جو اس راستے پر چل پڑے اس کو ذہنی، جسمانی، روحانی اور مالی۔ دکھ درد اور گوناگوں مشکلات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر جا کر بسنا ایک معرکہ سے کم نہ تھا۔ آج ایک ملک سے دوسرے ملک تو کجا کئی براعظموں کو طے کر کے اور کتنے ہی سمندروں کا سینہ چیر کے لوگ نئے وطن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دور دور جا کر نئی نئی بستیاں بسا لینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ انہیں جرأت مندوں میں مہمان اردو بھی شامل ہیں۔ جن کا پچھلی صدی میں پہلا پڑاؤ برطانیہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب ملکہ وکٹوریہ ہندوستان تشریف لائی تھیں تو ان کی شان میں متعدد قصیدے اور بہت سی عرض داشتیں پیش کی گئی تھیں وہ اردو کی شیرینیت اور جاذبیت اور اس کے الفاظ کی چاشنی۔ نرمی اور گرمی سے اتنا متأثر ہوئیں تھیں کہ ان کو اردو سیکھنے کا شوق چرایا اور وہ اپنے ساتھ ایک ماہرِ لسانیات منشی عبد الکریم کو لے گئیں۔ یوں برطانوی ایوانِ شاہی اردو کی تعلیم و تربیت کی پہلی درسگاہ بنا اور رفتہ رفتہ برطانیہ اردو کا تیسرا اہم مرکز قرار پایا۔

دوسری جنگِ عظیم اور تقسیمِ ہند کے بعد اردو بولنے والوں نے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلنا شروع کر دیا۔ اور ان کے قدم ——— امریکہ اور کینیڈا بھی آ پہنچے۔ اردو کی ان قدیم و جدید بستیوں میں کینیڈا کو دیکھتے دیکھتے ایک مخصوص حیثیت اور مرکزیت حاصل ہو گئی۔ یہاں ایک عرصہ تک صرف دو سرکاری زبانیں انگریزی اور فرانسیسی لائق اعتنا تھیں۔ مگر اطراف و جوانب سے تارکانِ وطن کے یہاں آ کر بس جانے کی وجہ سے دوسری زبانوں کو بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ جس میں اردو شامل ہو گئی۔ ۱۹۷۸ء کی انسائیکلوپیڈیا کینیڈیانا

اس انسائیکلوپیڈیا کا ہر نیا ایڈیشن دس سال بعد شائع ہوتا ہے۔ ۱۹۸۸ء کا ایڈیشن تازہ ترین ہے۔ اس میں راقم الحروف کا نام بھی بحیثیت URDU ETHNIC موجود ہے۔ توقع ہے کہ ۱۹۸۸ء کے ایڈیشن میں اردو کا ذکر اور بھی توقیر کے ساتھ کیا جائے گا۔

ایڈیشن میں اردو کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ مگر جب اس کا نیا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تو اردو کا ذکر اسی خصوصیت کے ساتھ کیا گیا۔ جس طرح دوسری ETHNIC زبانوں کا۔ آج اردو اس دیار میں نہ غریب الدیار ہے نہ خانماں برباد۔ یہاں کے برف زاروں اور مرغزاروں میں اردو بولنے لکھنے اور سمجھنے والوں کی فکر کے دھارے بڑی نزاکت اور لطافت سے پھوٹنے لگے ہیں۔ بہت سی

نئی نئی آوازیں نئے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ کانوں میں رس گھولنے لگی ہیں۔

قطع نظر اس کے کہ نقل مکانی کے محرکات اور عوامل کیا تھے۔ اس عمل کا ایک مثبت ردِ عمل یہ ہوا کہ ہمارے ادبی افق پر ایک ہمہ گیر، ہمہ صفت اور ہمہ جہت موضوع "ہجرِ ادب" کے عنوان سے بڑی آب و تاب کے ساتھ ابھرا اور سارے ماحول کو تابندہ اور درخشندہ کر گیا۔ اس کے بطون سے نئے نئے موضوعات تخلیق ہوئے۔ نئی تکنیک کی داغ بیل پڑی۔ تجرباتی تصورات کو ادبی نگارشات میں موقر جگہ ملی۔ یہاں کے ادب پاروں میں بے گھری بے دری، بے زمینی اور بے یقینی کا المیہ اس طرح ابھرا کہ: ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا۔ پھلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے (بیخود)

اسی کے ساتھ ہی انگریزی۔ فرانسیسی اور دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ۔ اشارات۔ کنایات۔ تلازمات اور آہنگ۔ نئی نئی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ نئی نئی تشبیہات اور استعارات اختراع پذیر ہوئے۔ مغرب اور مشرق کے مذہبی۔ سماجی۔ ثقافتی۔ سیاسی ادبی رجحانات اور نظریات کا تقابل بھی ہونے لگا۔

کینیڈین مناظر کی دلربائی۔ نیاگرا فالز کی رعنائی بھی جلوہ ساماں ہونے لگی۔ برف سے ڈھکے کوہساروں اور پھولوں سے لدے لالہ زاروں اور نیلگوں جھیلوں کی دلکشی بھی موضوعِ سخن بننے لگی اور یوں کینیڈین ہجرِ ادب مختلف النوع۔ مختلف الجہات اور مختلف الصفات ہونے کی وجہ سے وسیع المعنی ہوگیا۔ یہ ہماری ذات وصفات اطوار و اعدادت کا آئینہ بھی بنا۔ ہمارے مزاج۔ شعار۔ کردار کا علمبردار بھی۔ کہیں اس کا انداز جانا پہچانا رہا تو کہیں جداگانہ۔ کبھی یہ اپنا نظر آیا تو کبھی بیگانہ۔ کبھی اس کی آواز مانوس لگی تو کبھی غیر مانوس۔

اردو دوستوں نے اس دور افتادہ بستی میں اپنے سروں پر ایک چھت پانے۔ غمِ زمانہ اور غمِ روزگار سے نجات حاصل کرنے اور جذباتِ محرومی اور شکستہ خوردگی پر قابو پانے کے بعد نئے عزائم اور مقاصد کو اپنا مشعلِ راہ بنایا۔ غم و یاس کے بندھنوں کو توڑ کر آسودگی کی گود میں پہنچنے کا تہیہ کر لیا۔ شخصی اور خاندانی تعمیر و تشکیل کے ایک جہانِ نو کی تخلیق ان کا مسلک بن گیا۔ دربدری کے ورثہ کو بڑی جگر کاوی سے اپنا کر کینیڈین فضا میں اردو شعر و ادب ء انتشار پردازی۔ افسانہ نویسی، ناول نگاری کی طویل و عریض دنیا آباد کر دی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی فکری نشو و نما رجائیت کے سہارے کی۔ زندگی کے حقائق سے فراریت یا سی انگیزیت کے بل بوتے پر نہیں زندگی چاہے اپنے وطن میں گزاری جائے۔ یا بیرونِ وطن مختلف سماجی، تمدنی اور عمرانی ادوار سے گزرتی ہوئی نئے نئے ملبوسات تراشتی ہے۔ بہت سے بوسیدہ لبادوں کو اتار پھینکتی ہے۔ بہتوں میں پیوند لگا کر استعمال کرتی ہے۔ کچھ پیرہن متروک قرار دیئے جاتے ہیں۔ کچھ مطلوب ہو جاتے ہیں اور پھر یہ تأثر دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔

غربت کی شام میں جو کبھی ہم وطن ملے ۔۔۔ نخلِ خزاں کو جیسے نئے پیرہن ملے ، (عابد انصاری)

[ایک طویل مضمون "ہجرِ ادب" کینیڈین تناظر میں " کا ابتدائیہ] ❁

◆ بقیہ صفحہ ۱۱ پانچ جدید شاعر ◆

ہے اور یہ اکراچی کا کوئی شاعر آج تک نہیں لکھ سکا" یا "فنون" میں خالد احمد کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ظاہر ہے، میں بھی اچھا شاعر ہوں اور "نوجوانوں" میں خالد احمد نے بھی چند عمدہ نظمیں غزلیں لکھی ہیں مگر آپ کی تعریف گمراہ کن ہے۔ اس سے تعریف کرنے والے کے بارے میں لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ ضیا اور مدنی کی ایسی "بے مہار" تعریف کر کے آپ نے BACKLASHNOT کے لئے راہ ہموار کی ہے۔

یوں ہے کہ ضیا سے آپ کے زیادہ اور مدنی سے میرے زیادہ ذاتی تعلقات رہے۔ مگر ان دونوں کی محبت میں ہم دونوں برابر ہیں۔ مدنی صاحب چلے گئے" (وہ عجب بے چین روح تھے) مگر میری "بھابی بہن" اور دوست اور آپ کی بیٹی شفقت اور میرے "بہنوئی بھائی" اور دوست اور آپ کے "داماد" ضیا جب جب ملتے ہیں تو آپ کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور نہایت محبت اور گرمجوشی کیساتھ۔ ابھی شفقت نے بتایا کہ آپ نے "ایک نہایت خوبصورت داڑھی اگا رکھی ہے" (جو بابِ دانا سے ملتی بھی ہوگی)۔ آپ نے لکھا ہے "جلد آؤ کہ میں آخری بار (یہ آپ کا آخری بار ہے کہ میرا آخری بار) تمہیں سینے سے لگانا چاہتا ہوں" میں بھی آپ کو کلیجے سے لگانا چاہتا ہوں چاہے ریشِ دراز درمیان میں حائل ہی کیوں نہ رہے۔ بے شمار محبتوں کے ساتھ۔ آپ کا ساقی ❁

اردو کی نئی بستیاں

مسائل، مباحث، امکانات

شارب ردولوی

سائنسی ایجادات ایک طرف زندگی کے لئے جس قدر آسانیاں فراہم کرتی جارہی ہیں۔ دوسری طرف زندگی دشوار تر ہوتی جارہی ہے۔ پہلے انسانی زندگی کی جدوجہد ایک مخصوص علاقے تک محدود تھی۔ کاشتکاری ہو، محنت مزدوری ہو یا ملازمت، اس کا ایک محدود اور مختصر علاقہ تھا لیکن جیسے جیسے بہتر اور بہتر کی تلاش بڑھتی گئی۔ جدوجہد کے حلقۂ عمل کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا اور آج انسان انہیں سہولتوں کی تلاش میں سرگرداں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ کی تلاش میں پھر رہا ہے۔ پہلے خواہشات اور ضروریات محدود تھیں اور دنیا وسیع تھی اب دنیا محدود اور مختصر ہوگئی ہے اور ضروریات و خواہشات لامحدود۔ آج ایک عام انسان کے لئے یورپ، امریکہ، خوابوں کی دیس نہیں بلکہ قسمت آزمائی کے میدان ہیں اور ہجرت انسان کی ضرورت اور جذبات تشنگی اور بے گھری اس کا مقدر ہوگئی ہے۔

حالات کی ان تبدیلیوں سے انسان نے بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ پایا ہے اس نے عیش و آرام کی زندگی کے حصول کی بہت بڑی قیمت ادا کی اور تشنگی اور بے زمینی کے احساس کی شکل میں اس کا سود مسلسل ادا کر رہا ہے۔ ان حالات نے آج کے فکر کے محور کو بھی بدل دیا ہے نئی دنیاؤں میں قسمت آزمائی اور نئی ترقیوں نے نئی حسّیت کو جنم دیا فنونِ لطیفہ میں نئے ابعاد وجود میں آئے۔ حقیقت پسندی کی جگہ تجریدیت نے لی۔ سیدھے سادے شعری اظہار، جذبے کی صاف بیانی کی جگہ اشارہ اور علامت نگاری آگئی۔ زندگی کی پیچیدگی، الفاظ کی پیچیدہ بیانی میں نظر آنے لگی۔ گھر، گاؤں کی معصومیت اور وہاں کی فضائیں، کارخانوں اور ملوں کے دھویں اور شہر کی تیز رفتاری میں نہ جانے کہاں کھو گئیں۔

زندگی کے اسی خوبصورت اثاثے کا شکار، نئی نسل اپنی تہذیبی علمی اور ادبی قدروں کو سمیٹے۔ مغرب کے آخری سرے تک نہ جانے کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے اور اسے محفوظ رکھنے کے لئے کوشاں ہے ایسے تمام لوگوں کے کرب کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کبھی کبھی یہ کرب اس طرح کے اشعار میں نظر آجاتا ہے۔

میرے بچوں کو یہ آنگن گھروں میں چین ملتا ہے
کھلے دالان کی خواہش ہماری نسل ہی تک ہے

[اشفاق حسین]

[عابد جعفری کے شعری مجموعے سے اقتباس]

7/22 ملکہ موریس نگر ۔ دہلی 110007

نسیم سیّد

نئی زمینیں جس قدر شناخت مٹانے کے درپے ہوئیں۔ ہجرت کرنے والوں میں اپنی شناخت کی جدوجہد بھی اسی قدر تیز ہوجاتی ہے شمالی امریکہ کا اس وقت شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں اردو کا کوئی ادیب اور شاعر موجود نہ ہو۔ صرف کینیڈا میں اس وقت ڈیڑھ سو کے قریب شعراء اور ادیب موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کی

تخلیقات اردو کی معتبر ترین ہستیوں کی آراء کے مطابق ہر لحاظ سے اعلیٰ تخلیق کے معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن اردو کو مغرب میں زندہ رکھنے کی تمام کاوشیں بے کار ہیں۔ اگر ہم اس کو دیگر زبانوں خاص کر انگریزی سے مانوس کرنے کے بجائے صرف اپنے حلقے تک محدود رکھیں اور مانوس کرنے کے تمام تر وسائل موجود ہیں حکومت کی طرف سے گرانٹس ملتی ہیں اتھنک زبانوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کیلئے ایسی کانفرنسز کے لئے گرانٹس ملتی ہیں جو مغربی معاشرے اپنی زبان کے اثر ورسوخ اور دائرہ کار بڑھانے کے لئے منعقد کی جائیں۔ میں نے ایک چھوٹی سی کوشش کی تھی، گذشتہ سال اور بائیس سال ملک کے نامور شعراء اور ادباء کو ایک تین روزہ کانفرنس میں مدعو کیا تھا۔ جس میں اتھنک زبانوں کے مغرب میں بقاء کے سوال پر غور و خوض کیا گیا اور مغربی ادباء و شعراء کو تراجم کے ذریعہ اردو سے روشناس کرایا گیا۔ کینیڈا کی منسٹری آف سٹی زن نے انگلش کو سراہنے کے طور پر مجھے ایوارڈ سے بھی نوازا۔ یہ بتانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایسی کوششوں کی ہمت افزائی حکومت کی طرف سے بھی کی جاتی ہے اور ہمارے پاس تمام تر وسائل موجود ہیں لیکن اردو کی اصل خدمت کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ ہم سب اپنی اپنی خدمت اردو کے نام پر کر رہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ یونہی ہی برقرار رہا تو یقین کیجئے اردو کا مغرب میں کوئی مستقبل نہیں

[مضمون "شمالی امریکہ میں تارکین وطن کا سماجی اور ادبی منظر نامہ" سے اقتباس]

606 - COUNTER STREET, KINGSTON
ONTARIO, CANADA K7M 346.

شبنم رومانی

اردو کو شمالی امریکہ میں، بہر حال ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے یہاں ایک طرف آغا بابر پنجاب کے کلچر کو اپنی "سوانح حیات" میں سجا کر پیش کرتے ہیں، جو سہ ماہی "اقدار" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے، تو دوسری جانب محمد مظفر الدین فاروقی ہندی دیومالا کو ایک عجیب تخلیقی شان کے ساتھ اپنے افسانوں میں ذریعۂ اظہار بنا رہے ہیں یہی نہیں وہ اپنی کہانیوں میں شمالی امریکہ کو بھی لکھ رہے ہیں اور ایسی شگفتگی اور شائستگی سے لکھ رہے ہیں کہ انہوں نے ناگفتنی کو بھی گفتنی بنا دیا ہے —— اور ان کی کہانی "چٹان" جو اقدار میں شائع ہوئی تھی اس سال کی سب سے اچھی کہانی قرار پائی۔ یہیں ایک طرف رضیہ فصیح احمد اور خالد سہیل تخلیقی سطح پر ایک نئے سماجی تناظر سے دوچار ہیں تو دوسری طرف شکیلہ رفیق اور شائستہ سید امین نے مشرق کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے یہاں ایک طرف افتخار نسیم نے شاعری میں سچ بولنے کے ساتھ نثر میں بھی سچ لکھنے کا بڑا رسک لے رکھا ہے تو دوسری طرف عابد اللہ غازی نثر کے ذریعے امشنری کا کام کر رہے ہیں۔ ادھر حمیرا رحمان او رفرحت زاہد نے اپنے اندر کے سچ کو زندہ رکھنے اور اسے زندہ لوگوں تک پہنچانے کی ٹھان رکھی ہے، ادھر عرفانہ عزیز، اشفاق حسین، نسیم سید اور عابد جعفری ہیں جو ترقی پسندی یا نو ترقی پسندی کی خوبصورت تعبیروں میں مصروف ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو اردو کے نئے آفاق سے آشنا کر سکتی ہے اس تخلیقی فضا میں اردو کے عالمی مشاعروں کی جو روایت جڑ پکڑ رہی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد بھی اردو سے نئی نسل کی دلچسپی کو قائم رکھنے پر آمادہ کرنا ہے۔ شاعری کا اپنا جادو ہوتا ہے اور یہ وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اگر تفریح کے ذریعے تعلیم اور ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جب مساجد کے ایک حصے میں دینی اور تاریخی فلمیں دکھائی جا سکتی ہیں تو مشاعرے کیوں نہ ہوں۔ یہ مشاعرے اردو شاعری کی داخلی توانائی کو بھی ثابت کرتے ہیں اور اس کی وسیع المشربی کو بھی۔

میری ذاتی رائے ہے کہ یہاں کے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور محققوں کو، ترجمے کے ذریعے اردو ادب کے بہترین اور منتخب سرمائے کو انگریزی میں اور انگریزی کا بہترین تخلیقی اور تہذیبی سرمایہ اردو میں منتقل کرنا چاہئے۔ لیکن اس "نقل زمانی" میں

ان اخلاقیات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو ہماری ساکھ اور تہذیب کا تقاضہ ہیں۔ [مدیر "اقدار" کراچی]

● ۲۰۷۔ گھڑیالی بلڈنگ۔ صدر۔ کراچی۔ (پاکستان)

عطاء الحق قاسمی

یورپ اور امریکہ میں آباد پاکستانیوں کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی آئندہ نسل کے روحانی اور ثقافتی تشخص کو برقرار رکھنا ہے اور یہ خاصہ مشکل کام ہے۔ ایک فارسی شاعر کا کہنا ہے۔

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یعنی تو نے مجھے باندھ کر دریا میں پھینک دیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ دیکھنا کہیں دامن گیلا نہ ہو جائے۔ کچھ اسی طرح کی بات جنابِ غالب نے بھی کہی ہے۔

جس کو ہوں جان و دل سے عزیز ، اس کی گلی میں جائے کیوں

لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود، مغرب میں آباد پاکستانی اپنی پہچان کے ضمن میں برابر کوشاں رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ پاکستان سے علماء "درآمد" کرتے ہیں۔ پیر فقیر بلاتے ہیں شعراء کو "زحمت" دیتے ہیں۔ ثقافتی طائفے بلائے جاتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے بچوں کی اسلامی اور پاکستانی خطوط پر تعلیم و تربیت کے لئے بڑے بڑے ادارے قائم کر رکھے ہیں غرضیکہ ان کے بس میں جو کچھ ہے وہ کرتے ہیں۔ سوائے ایک چیز کے جس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے لیکن جو بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ یہ گھریلو تربیت ہے جس کے لئے والدین کو اپنے بچوں کیلئے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اس گھریلو تربیت میں بچوں کو اپنی زبان سے روشناس کرانا بھی شامل ہے۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مغرب میں پرورش پانے والا جو بچہ اپنی زبان روانی سے بولنے کے قابل ہو جائے گا۔ بلکہ جو اس زبان میں اظہار کرتے وقت فرحت محسوس کرے گا وہ مغرب کے ثقافتی طوفان کی زد سے نکل جائے گا۔

زبان آدھا مذہب ہے۔ میں مالک رام، جگن ناتھ آزاد اور دوسرے ہندو ادیبوں سے ملا ہوں جو اردو کے ادیب ہیں وہ سب ثقافتی طور پر مسلمان ہیں۔ بات بات پر بسم اللہ، الحمد للہ، ماشاء اللہ کہتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کے بچوں کے نام بھی مسلمانوں والے ہیں اور یوں میں یہ بات شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ مغرب میں پرورش پانے والے بچوں کو اگر طوفانِ مغرب سے بچانا ہے تو ہمیں ان کا رشتہ اپنی زبان سے قائم کرنا ہوگا۔

["انگریزی کے سمندر میں اردو کے جزیرے" سے اقتباس]

● العطا۔ سی ۵۲/۴ جہان زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور

اشفاق حسین

یہ پہلا موقع تھا کہ میں پاکستان سے باہر، کینیڈا کی سرزمین پر ایک ادبی محفل میں شریک تھا۔ سب کچھ وہی تھا جیسا کہ پاک و ہند کے کسی مشاعرے میں متوقع ہو سکتا ہے۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ یہ آل پاکستان یا آل انڈیا مشاعرہ نہ تھا بلکہ آل کینیڈا و امریکہ مشاعرہ تھا۔ شعراء جن شہروں سے شرکت کے لئے آئے تھے۔ ان میں دہلی لکھنؤ، کراچی یا لاہور کے بجائے نیویارک، لاس اینجلس، ٹورنٹو اور مانٹریال وغیرہ کے نام تھے۔ یہ محفل مشاعرہ صبح تک جاری رہی لیکن مشاعرے کے بعد، گھر لوٹتے ہوئے۔ کافی دیر تک میں یہ سوچتا رہا کہ اس تمام ادبی شب بیداری کے نقشے میں شمالی امریکہ کہاں تھا۔؟ سوائے اس کے کہ بعض شعرا کے ہاں ہلکے سے ایک آدھ ایسے اشارے ضرور ملے جن میں پردیس میں دل پہ گذرنے والی واردات کا بیان یا غریب الوطنی کا دکھ تھا۔ یا ہجرت کے وہی پچھے چیدے نوا نے تھے۔ جس کی طرز کے ڈانڈے "خوش رہو اہل چمن ہم تو چمن چھوڑ چلے" والی کیفیات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے تھے اس پورے وجود میں کہیں کہیں دل کی دھڑکنیں محسوس کی جا سکتی تھیں۔ لیکن ایسا تھا کہ آنکھیں نہیں تھیں۔ بے آنکھوں کی اس چہرے کی تحریریں کو پڑھنا اور پھر ان تحریروں سے معنی کی ایسی لکیروں کو جنم دینا جو کسی واضح پیکر کے خدوخال کو نمایاں کر سکیں اگر ناممکن نہیں تو

مشکل ضرور ہے۔

شمالی امریکہ اردو ادب کے منظرنامے میں دلوں کی دھڑکنیں تو ہیں (شاعری کی حد تک) منتظر آنکھیں، وہ بھی روشن آنکھیں، خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اس میں اردو شاعری کی کچھ اپنی لغت کی مجبوریاں اور خصوصاً غزل کے مزاج کی پابندیاں بھی مانع ہیں۔ البتہ نثر کے میدان میں امکانات کا ایک شہر مثال ضرور بسایا جا سکتا ہے لیکن اسی شہر مثال کی تعمیر کے لئے جس گارے اور مٹی کی ضرورت ہے وہ ابھی تک صحیح معنوں میں تیار نہیں ہے۔

[خالد سہیل کے افسانوں پر مضمون ”روشن آنکھیں اور شہر مثال“ سے اقتباس]

805 LOCKWOOD CIRCLE NEW MARKET
ONTARIO CANADA L3X 1K8

مقصود الٰہی شیخ

اس عید پر، حسن اتفاق سے گذشتہ تین ہفتے پہلے نئی نسل کے بارے میں شروع ہوئی چھوٹی سی بات از خود اس نہج پر آ گئی ہے کہ اپنے گھر میں بزرگوں بالخصوص والدین کے ہاتھ میں ایک خاموش تحریک کی باگ ڈور آ گئی ہے اس کے فائدے ہر باشعور فرد پر ظاہر ہیں۔ مشاہیر یا تاریخ ساز شخصیتوں کے قول و اقوال گنوانے یا ماضی کے قصے یا تاریخی حوالے دینے کی ضرورت نہیں لطف یہ کہ نقصان کچھ بھی نہیں۔ اتنی سی بات ہے کہ بچوں کو عیدی یا عید کا تحفہ دیتے ہوئے اس میں تھوڑا سا اضافہ کر کے بس اتنی سی ترغیب دینی ہے کہ وہ آپ سے، آپس میں اردو بولیں اگر وہ اردو لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیں تو آئندہ عید پر انہیں انعام ملے گا۔ گھر سے بھی اور ”راوی“ سے بھی

انکی تخلیقی صلاحیت ابھارنے کے لئے یہ خوشخبری بھی ہے کہ وہ اپنی کاوش ”راوی“ کو بھیجیں گے تو اشاعت پر ان کا بڑا نام ہوگا۔

اس طرح آپ اپنے بچوں کے ذریعہ اپنی تاریخ، کلچر اور ثقافت کی بقا کی مستقل بنیاد رکھنے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خاموش تحریک خوش گفتاری سے شروع ہو کر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ گھر گھر پھیل سکتی ہے اس میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ ہر کوئی اپنے فعل کا ذمہ دار ہے وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ اپنی قومی زبان، اپنی قدروں اور اپنے مذہب کے بقا کی سمت یہ پہلا قدم ہے ایک ایسی خدمت ہے جو ہم سب پر لازم ہے۔ آخر کون چاہتا ہے کہ ہمارا قیمتی اثاثہ جو ہمارے ساتھ ہمارے نئے وطن میں آیا ہے اور قابلِ فخر ہے ایک روز لاوارث ہو کر مٹ جائے؟ پھر اس طرف سے غفلت کی بھی جائے تو حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ جب کہ یہ اکیلا قدم ہی اپنی پہچان، اپنے قیمتی سرمایہ دانش کی بقا اور تحفظ کے نصب العین کے حصول کا سبب بن سکتا ہے۔

یہ ڈھکی چھپی بات نہیں سب جانتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا نے اردو کو ان ہونٹوں اور کانوں تک پہنچا دیا ہے جہاں کسی حکومت کی بہترین کوششوں سے بھی رسائی ممکن نہ تھی۔ اس خداداد امکان کو دیرپا بنانے اور ہمیشگی دینے کے لئے اگر ہم مستقبل میں جھانکتے ہوئے یہ قدم اٹھانا گوارہ کریں تو ہم کو زبان کی بقا کے ساتھ ساتھ جڑی انفرادی / اجتماعی کمائی کی وسعت بھی دکھائی دے گی۔ کسی کی روزی روٹی محض دفتر اور دفتروں میں سرکاری سرپرستی میں استعمال ہونے والی زبان سے ہی پیوست نہیں ہے۔ ابلاغ، ادب اور فن نے آج فنکاروں کا ایمیج بدل دیا ہے ان کی تنگ دستی کو قصۂ پارینہ یا پرانی کہانی بنا دیا ہے۔

اس خاموش گھریلو تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہم اس کے مزید پہلوؤں پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ آپ کو شمولیت کی دعوت دیتے ہیں آپ کا تعاون مل جائے اور آپ یہ اطلاع دے دیں کہ اس دور رس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے آپ نے اپنے یہاں بچوں سے بات کر لی ہے تو ہم انشاءاللہ آئندہ سال عید کی آمد پر بچوں کی اردو میں ترقی کے بارے میں اپنی بساط بھر یہ واقفیت حاصل کر لیں گے کہ گھر گھر میں اردو نے کس حد تک جڑ پکڑی ہے۔ اور کس بچے کو کتنا یا کیا انعام ملے؟

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا آپ کی طرف سے ابتدائی اطلاع کے ہم منتظر ہیں۔ اردو کے گھریلو فروغ کے لئے آپ کا تعاون و حمایت درکار ہے۔!! دو میٹھے بول بکنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ (اداریہ)

[ہفت روزہ ”راوی“ بریڈ فورڈ — ۱۶ فروری ۹۶ء]

"RAVI HOUSE" UNIT E1 LEGRAMS LANE
BRADFORD BD7 1NS. (U.K)

ساقی فاروقی

100 - SUNNY GARDENS ROAD
LONDON NW4 1RY
U K

پانچ جدید شاعر

ایک خط

پیارے بھائی اور دوست حمید نسیم، آپ کی مذہبی کتابوں کو تو خیر میں نے دیکھا ہی نہیں مگر آپ کے اور میرے مشترک دوستوں کا کہنا ہے کہ ان میں آپ معرفت، حِلم، علم کلام اور تحیّر کی عجیب عجیب منزلوں سے گزرے ہیں۔ اب رہیں آپ کی ادبی کتابیں (آپ بیتی، مضامین، شاعری) تو آپ کے دو خطوط کے مطابق وہ آپ نے پچھلے سال مجھے بھیجیں بلکہ بھجوائیں بھی مگر ضیا جالندھری صاحب کے سدھائے ہوئے ڈاکیوں نے وہ چیزیں مجھ تک نہیں پہنچنے دیں کہ مبادا میں استفادہ کرلوں۔ مگر اس بار ضیا جالندھری آئے تو " ۵ جدید شاعر " مجھے جلانے کے لئے لیتے آئے سو چند سطریں اس کتاب کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ میرے دل میں آپ کی محبت بسی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی۔ وہ ہے آپ کی عزت۔ یہ صرف اس لئے نہیں کہ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں بلکہ یہ عزت آپ نے کمائی ہے اُن پچیس[۲۵] تیس[۳۰] غزلوں کی وجہ سے جو آپ نے ۵۸ء اور ۹۳ء کے درمیان لکھیں۔ (افسوس اپنی تازہ غزلوں میں آپ وہ VIVACIOUS EXUBERANCE قائم نہ رکھ سکے۔ مگر اس پر بات آپ کی غزلوں کی کتاب پڑھ کر تفصیل سے کروں گا۔ آج اس کا موقع نہیں)

" پانچ جدید شاعر " میں آپ کا علم، فراست، زبان و بیان پر آپ کا کنٹرول، لغت، مغرب و مشرق و ماضی و حال سے آگاہی، جمالیات سے آشنائی اور سب سے بڑھ کر آپ کی نثر کی روانی ——— ایسی چیزیں ہیں کہ مجھ جیسا کٹّر قاری بھی آپ کو سلام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

روزنامہ جنگ کے ذریعے میں الطاف گوہر کی ایک رائے سے واقف ہوں ۔ آپ کو دکھی ہونے کی ضرورت نہیں کہ جہاں تک ادب کا تعلق ہے وہ ایک DEAD DUCK ہیں۔ (مگر میں ادب کے ساتھ زیادتی کروں گا اگر ایک ہی سانس میں یہ نہ کہہ دوں کہ میرا جی سمیت ان کے دو مضامین ایسے ہیں جن میں زندہ رہنے کی بو باس ہے)

اصل میں قصّہ یہ ہے کہ الطاف گوہر میں اور آپ میں ایک چیز مشترک ہے ۔ ۳۰ برس تک " ادب باہر " رہنا اور آخری وقت میں ادب میں داخلے کی کوشش ۔ " روحانی پلانٹ " ہو کر " P . G . A کا طائفہ " اصل میں دونوں ایک ہیں ۔ (بلکہ بقول شخصے " قید حیات و بند و غم اصل میں چاروں ایک ہیں ") آپ دونوں " رزق نکالنے " کے بعد مذہب سے مباشرت اور عاقبت سے منافقت کرتے نظر آتے ہیں۔ لازیب کہ یہ ایک اسلامی مسئلہ ہے ۔ ۔ ۔

میرا جی، فیض اور راشد پر پچاسوں مضامین لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جائیں گے کہ وہ تینوں اقبال کے بعد جدید شاعری کے سب سے اہم ستون ہیں۔ آپ چونکہ اس زمانے میں اللہ کے طلسم میں گرفتار تھے اس لئے شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ اُن تینوں کو ایک ساتھ منتخب کرنے کا فریضہ میں نے انجام دیا تھا۔ ۳۰، ۳۵ سال پہلے ۔ گواہ ضیا جالندھری اور مشفق خواجہ اور ۱۹۶۱ء کا " نیا دور "۔ آفتاب احمد کو مجھ سے شکایت ہونی چاہیئے نہ کہ آپ سے کہ میں وہ پہلا آدمی ہوں جس نے " میرے بھی ہیں کچھ خواب " کو مارٹن لوتھر کنگ کی تقریر کا ماخذ بتایا تھا (۱۹۶۱ء)۔ حوالے کے لئے میری کتاب " بازگشت و بازیافت " نکالی ہے جسے مشفق نے ۷ سال پہلے شائع کی اور ضیا جالندھری نے آپ کو پڑھوائی۔

راشد اور فیض پر آپ کے مضامین نہایت خوبصورت ہیں مگر ان مضامین میں لگتا ہے آپ ان کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں

جیسے وہ آپ کے برخوردار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اُن کے برخوردار ہیں اور رہیں گے۔

میرا جی والا مضمون آپ کی شریعت کے خلاف ہے۔ اندر سے آپ کا جمالی شاعر انھیں ناپسند کرتا ہے مگر میرا جی کا زبان و بیان کے جھول کے باوجود اہم ہو جانا ایسا کرشمہ ہے کہ آپ بھی ان کی متابعت کرتے نظر آتے ہیں (کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا) ممکن ہے کہ آپ ضیا جالندھری کی رائے سے متاثر ہو گئے ہوں۔ یا اپنے دشمن الطاف گوہر کی رائے سے یا میری رائے سے۔ (یاد رکھیے کہ میرا "میں" آپ کے "میں" سے کم نہیں)۔ ثالث اپنے اعجاز بٹالوی۔ اگر وہ میرے "دعویٰ" کو رد کردیں گے تو میں شکست قبول کرلوں گا کہ میں اُن کا مرید ہوں۔

ضیا جالندھری کو میں (غزل اور نظم دونوں وجوہات کے باعث) مدنی سے اہم شاعر سمجھتا ہوں مگر "پانچ جدید شاعر" میں ضیا بھی نہیں آتے کہ اختر الایمان، مجید امجد، ناصر کاظمی، یہاں تک کہ منیر نیازی تک نے زبان و بیان کے الجھاوے کے باوجود (ناصر کو چھوڑ کے) نہ جانے کیا کرتب دکھایا ہے کہ جدید اردو شاعری میں معتبر ٹھہرے ہیں۔ ان کا اعتبار کب تک رہے گا یہ نہیں معلوم۔ نہ جانے کون سا جادو ہے جو شاعروں کو اہمیت دیتا ہے۔ میرا جی نے اپنی تمام خامیوں کے باوجود اپنا مقام کیوں بنایا یہ خدا کو ہی معلوم ہے مگر HE IS THERE

عزیز حامد مدنی والے مضمون میں آپ کی محبت اس طرح پھوٹی ہے کہ آپ کی انگلیاں چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ مدنی کی غزل کو آپ نے جس طرح اٹھایا ہے وہ اس کی اس سے بھی زیادہ کی مستحق تھی۔ خوش رہیے۔ وہ کمال کے اور ضیا سے بڑے غزل گو تھے۔ ان کی نظم پر آپ بزطوقی میں ایمان لائے۔

مگر خیالات اور علم اور ٹکنولوجی شاعری نہیں ہیں۔ خیالات اگلنے، علم بگھارنے اور ٹکنولوجی کی اصلاحات اختیار کرنے سے نظم نہیں بنتی بلکہ ان تمام چیزوں کو اپنی ذات میں اتار لینے کے بعد تمام تر جمالیات کے ساتھ اُن کا اظہار نظم کے مصرعوں کو سیّال اور سریع الحرکت کرتا ہے۔ مدنی ۵ یا ۷ نظموں میں کامیاب ہیں بقیوں میں منجمد۔ (یہ سب میں محمود ایاز کے رسالے میں ۲ سال پہلے لکھ چکا ہوں، آپ نے بھی پڑھ لیا ہوگا۔ اس پر یاد آیا کہ اس جاہل بے ایمان نے ۳۰ سال پہلے یوسف ظفر پر میرا ایک مضمون اپنے نام سے چھاپ دیا تھا اور مجھ سے یہ کہا کہ "کاتب" سے غلطی ہو گئی مگر اس کی تصحیح آج تک نہیں کی) ضیا کا علم اور فکر ان کے ہر مصرعے میں رچا بسا ہوتا ہے مگر کیا مجال ہے کہ بہاؤ کو ذرا سی بھی ٹھیس لگے۔ وہ آٹھ دس سال تک ٹی وی کی صحافت اور "نوکر شاہی" کی لعنت میں مبتلا رہے جو ان کی شخصیت پر داغ ہے مگر اپنے درویشانہ مزاج کے باعث وہ ہمیشہ ادب کے مرکزی دھارے میں بہتے رہے اور جبریہ خاموشی کے بعد واپس آئے تو مصرعہ وہاں سے اُٹھایا جہاں چھوڑا تھا بلکہ نظم ہو کہ غزل، دونوں کی تہہ داری بڑھ گئی ہے۔ دو چار باتیں اور نقاد کو اس پر ناز نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ تیس سال تک ادب "باہر" رہا اس لئے اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس درمیان کیا ہوتا رہا۔ یہ فخر کا نہیں بلکہ شرمندگی کا مقام ہے۔

مذہب کی طرف آپ کی مراجعت سے میں سمجھا تھا کہ آپ نے "میں" کو دفن کر دیا ہوگا مگر کتاب میں لکھا ہے گا ہے عزیزی قمر جمیل، عزیزی ہمدانی بلکہ بیٹی شفقت تک (کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اس رشتے سے ضیا جالندھری آپ کے داماد ٹھہرے) دیکھ کر رنجیدہ ہوا (میں کو مجھ جیسے غیر مذہبی چنگیزیوں کے لئے چھوڑ دیجیے) شعری تنقید میں بڑائی "عمر رسیدہ" ہونے کی وجہ سے نہیں "شعر رسیدہ" ہونے کی وجہ سے آتی ہے۔ کتاب کا سب سے بڑا ستم اس کا سیاق و سباق والا المیہ ہے یعنی POINT OF REFERENCE کہ یہ ان پانچ شاعروں پر ہے جو اقبال کے بعد آئے اور اپنی غزل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی نظم کی وجہ سے جدید ہیں۔ سعدی، حافظ، قتیل، صائب نظیری کو ان لوگوں نے نیو کے طور پر ضرور استعمال کیا مگر ان شعرا کا اصل حوالہ پونڈ، ملارمے، کافکا، جوائس، ایلیٹ، رانبو، پاترا، نرودا، لارنس، آڈن بلکہ تھامس اور لارکن تک ہیں۔

مگر فی الحال ان باتوں کو بھول جایئے اور مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کی لگن، محنت، دور بینی، علم (افسوس کہ حلم نہیں) نظموں کی کلید کی فراہمی (UNLOCKING THE TEXT) ایسی خوبیاں ہیں جو کتاب کو معتبر بناتی ہیں اور نظم کی تنقید میں اضافہ ہیں۔ پہلے تین شاعروں کے مقام سے صد فی صد متفق ہوں مگر ضیا اور مدنی کے مقامات کے تعین میں آپ نے عجلت سے کام لیا ہے۔ آپ افعل التفضیل کا صیغہ استعمال کرنے میں نہایت سخاوت سے کام لیتے ہیں مثلاً اپنے خط میں مجھے آپ نے لکھا کہ "ساقی، ۳۰ ۳۴ برس پہلے جو مطلع تم نے لکھا

[باقی صفحہ ۵ پر دیکھیے]

محمد صلاح الدین پرویز

دو نظمیں دو منظر

پہلی نظم

کبھی اشجار ہو جاتے ہیں خالی رحمتوں سے
کبھی شاخیں بھی ہو جاتی ہیں سونی پتیوں سے
چلا کرتے ہیں جن پہ اَن گنت جسموں کے پاؤں
کبھی رستے بھی ہو جاتے ہیں قبرستان جیسے
خدا بھی اس میں رہ جاتا ہے چھپ کے
کبھی اُڑتی ہے اتنی دھول گہری آسماں پہ۔
یہ پت جھڑ کا ہے منظر، سچ بتاؤ!
تمہیں میں بھی نظر آتا ہوں کیا اس میں برہنہ!!
یا پھر میں بھی خدا جیسے چھپا پھرتا ہوں اِس میں کچھ کھونا!!!

دوسری نظم

سنو، پیڑوں کو رشتے مل گئے ہیں
سنو، شاخوں کی شادی ہو گئی ہے
سنو، پت جھڑ کا وُسا کچھ ہو رہا ہے
سنو، رستوں پہ نہریں بن گئی ہیں
سنو، چہرے پہ آنکھیں کھل گئی ہیں
سنو، آکاشں گیلا ہو رہا ہے
یہ پت جھڑ کا نہیں، جَل کا ہے منظر
میں تم سب کی نگاہوں سے ذرا کچھ دور بیٹھا
خدا کی اور اپنی
میں دونوں کی نگاہوں کے اُفق میں
ہزاروں میل تک پھیلی ہوئی
آنسو کی دنیا دیکھتا ہوں۔

طویل رات اور میں!

طویل رات ہے
اور آسماں پہ چاند نہیں
میں کس سے بات کروں
نہ میرے پاس گھنی زلف ہے تری کہ جسے
میں اپنی آنکھوں پہ رکھ کے قرار پا جاؤں
نہ میرے پاس ترا ہاتھ ہے حنائی جسے
میں اپنے ہونٹوں پہ رکھ کے نثار ہو جاؤں
ابھی تلک تو فقط چند پل پہلے تک
تھی میرے پاس تری یاد
لے گیا وہ بھی، ہوا کا جھونکا
ابھی جو ادھر سے گذرا تھا
سنا ہے پاس ہی اک گاؤں ہے
وہاں کوئی
طویل رات میں قندیلِ جاں جلاتا ہے
اُسے بلائے کوئی، کچھ سناؤں اس کی سنوں
مگر یہ ہو نہیں سکتا
کہ آس پاس مرے
نہیں ہے کوئی
فقط میں اور اک طویل سی رات!
طویل رات ہے اور آسماں پہ چاند نہیں!!

یہ نشہ اتنا بڑھے

میری رگ رگ میں وہ کچھ ایسے ڈھلا جاتا ہے
جیسے بلور پیالوں میں شراب
جیسے مدہوش نگاہوں میں خمار
جیسے دو جسم ہوں اک وصل کی شب میں بیتاب
رات کا گرم فسوں
عشق کا سبز سبو
کوئی آئے اور آتارے مجھ میں
یہ نشہ اتنا بڑھے، اتنا بڑھے، اتنا بڑھے
قربتیں، فاصلے بن جائیں
پیالے، آنکھیں
اور آنکھوں سے بہت دور بہت دور
کسی رات کے سائے میں جلیں، لکڑیاں وصل کی
دو جسم جنھیں دیکھا کریں۔

تمہارے جسم سے آواز میری آئیگی

چراغ شب کو ڈبو کے تمہاری آنکھوں میں
لکھے ہیں ہم نے کئی گیت آنسوؤں والے
کئے جو تم نے نہیں، پھر بھی چھوڑ آئے ہیں
تمہارے در پہ کبھی اک نظر پڑے تو انہیں
اُٹھا کے اپنے گریباں میں تم چھپا لینا
کبھی جو رات گئے،
ایک بند کمرے میں بجھا کے روشنی
اپنے آتار و پیراہن
تو ان کو گرنے نہ دینا زمین پہ ہرگز
تمہاری آنکھوں سے پھوٹیں گے چاند کے قمقم
تمہارے ہونٹوں پہ پھر اک الاؤ دہکے گا
تمہارے جسم سے آواز میری آئے گی!

اپنا گھر

زمین پہ تو نہیں مل سکا ہمیں کوئی
فلک کے دشت میں ڈھونڈیں گے اب کے اپنا گھر
وہاں بنائیں گے اک خواب گاہ چھوٹی سی
کہ جس میں ہوگا پُر اسرار روشنی کا عمل
اُجالا دیکھیں گے اس میں گھنا گھنا سا ہم
اندھیرا دیکھیں گے جیسے دئے کی لو کم کم
وہاں گلاب کے پھولوں کا باغ بھی ہوگا
ہر ایک پھول میں جلتا چراغ بھی ہوگا
چنار و سرو کے کچھ پیڑ بھی وہاں ہونگے
کہ جن کے سایوں سے احساس مہرباں ہونگے
ندی بھی ہوگی جہاں ایک جھلملاتی ہوئی
ملے گی موج وہاں ہم کو مسکراتی ہوئی
ندی کے صاف کنارے پہ بیٹھ کے پھر ہم
ڈبو کے بادۂ احمر میں بے خودی کا قلم
ہوا میں اڑتے ہوئے بے قرار کاغذ پر
لکھیں گے، جنگتے رہو، سو گئے رفیقو کیا!
تمہاری آنکھیں بہت آج بھی غنیمت ہیں
تمہاری آنکھوں میں پھیلی ہوئی زمینوں سے
کہ ہم نے پایا نہیں جو وہ سوچ سکتے ہیں
ہم ان سے آج بھی کچھ خواب دیکھ سکتے ہیں

حسن شکیل مظہری

آوارہ وطن

ہم کتنا واقفِ آداب ہیں اے شہر نگار
اجنبی میرے لئے ہے، تیرا عنوان کرم
اجنبی تیری زمیں، تیرا فلک تیرا دیار
اجنبی رنگ شفق بوئے وفا، صبح بہار
ہم کہ ناواقف آداب ہیں اے شہر نگار
اجنبی ہے ترے دلداروں میں جینے کا چلن
آبروئے حسن کی الجھی ہوئی پیمانوں میں
آتشیں جسم لبھاتے ہوئے میخانوں میں
نہ محبت، نہ مروت نہ رفاقت کی کرن
کیسے اس شہر میں رہتے ہیں بھلا دل والے
ہم اک ناواقف آداب ہیں اے شہر نگار

16, BROADACRE, STALY BRIDGE
CHESHIRE SK 152TX U K.

شاھین

چاند سے اپنی کہانی کہہ لے
اور جو دکھ ہے وہ تنہا سہہ لے

اپنی ہستی کو تماشہ نہ بنا
یار اخبار سے باہر رہ لے

کل رواں ہوگی یہاں کشتیٔ گل
آج دریا سرِ مژگاں بہہ لے

میلگوں خواب بیاں کرتے تھے
زرد پردوں سے دریچے پہلے

اب تو پردیس کی ٹھانی ہم نے
اور یوں بھی نہ اگرچہ پہلے ؟

POST BOX NO 2276,STATION - D
OTTAWA ONTARIO
CANADA, KIP 5W4

اکبر حیدر آبادی

خوف کا زینہ

اس گھر کے کسی گوشۂ تاریک میں ہوگا
وہ خوف کا زینہ
غم جس سے دبے پاؤں اترتے رہے دل میں
وہ خواب کہ تھے میرے سن و سال کا حاصل
مرتے رہے دل میں
اک منظرِ خوش رنگ نگاہوں میں تھا روشن
اس کو بھی چرا لے گئے نومیدی کے رہزن
خالی ہے مکاں
اب کوئی آواز —
نہ آواز کا سایہ
نہ کسی خواب کی چلمن
نہ کسی درد کی دھڑکن
بے عکس ہے دل
ملگجے آئینے کی مانند

بے چاپ ہے
اک ٹوٹے ہوئے زینے کی مانند !

30 - TUFFLEY ROAD,
BRISTOL BS10 5EO
WESTBURY ON TRYM
AVON, U K

خالد سہیل

یہ کیسی آزمائش کی گھڑی ہے
کہ ہم نے خودکشی کی ٹھان لی ہے

یہ کس نے کارخانوں کے دھوئیں کی
ہر اک چہرے پہ کالک سی مَلی ہے

ہر اک موسم ہوا ہے بے ثمر کیوں
درختوں کی جوانی پوچھتی ہے

بھری تیزاب کی یہ کس نے بوتل
سنہرے بادلوں پہ پھینک دی ہے

یہ کس نے زہر گھولا پانیوں میں
کسے ان مچھلیوں سے دشمنی ہے

زمیں کی کوکھ میں مردہ ہیں بچے
نہ جانے بد دعا کس کی لگی ہے

ہمارے عہد کی یہ آگہی کیوں
بنی خالد جوازِ خودکشی ہے

PENT HOUSE NO - 6
100 WHITE OAKS CRT, WHITBY ONTARIO
CANADA L1P 1B7

ہمایوں ظفر زیدی

دھواں ہوئی وہ شام دل غبار ہو کے رہ گیا
چہار سمت صرف انتشار ہو کے رہ گیا

وہ دوستی کی باہمی مسرتیں کہاں گئیں
یہاں تو ہر رفیق غمگسار ہو کے رہ گیا

کمند ڈالنے چلا تھا میں "مہ و نجوم پر"
بس ایک جست ہی میں خود شکار ہو کے رہ گیا

مجھے تو آسماں کی بلندیوں پہ کام تھا
یہ کیا ہوا کہ میں بھی خاکسار ہو کے رہ گیا

یہ آرزو تھی سب کی سرگرانیاں سبک کروں
مرا وجود خود مجھی پہ بار ہو کے رہ گیا

جس خیال و خواب کے طلسم بُن رہا تھا میں
یہ کیا کہ پھر اسیر روزگار ہو کے رہ گیا

میں لمحہ لمحہ جمع کر رہا تھا اپنے آپ کو
مگر نہ جانے کیسا انتشار ہو کے رہ گیا

P O BOX NO 3843
RUWI - 112 MUSCAT
(SULTANAT OF OMAN)

ذکاء صدیقی

پکار لیں گے اس کو، اتنا آسرا تو چاہیئے
دعا خلافِ وضع ہے، مگر خدا تو چاہیئے

میں اپنے چہرے کی تلاش کس کے عکس میں کروں
مجھے بھی زیست نام کا ایک آئینا تو چاہیئے

بجا، کہ میں نے زندگی سے کھائے ہیں بہت فریب
مگر، فریب کھانے کو بھی حوصلا تو چاہیئے

یہ کیا، کہ سر جھکا کے خنجروں کو چومتے رہیں
ستمگروں کو کچھ نہیں تو، ٹوکنا تو چاہیئے

چمن کو ہم سے ضد سہی، گلوں کی بات اور ہے
صبا کے ہاتھ اک پیام بھیجنا تو چاہیئے

نہ اُن کے پاس وقت ہے، نہ ہم کو فرصتِ نظر
جنوں کے واسطے بھی کوئی مسئلا تو چاہیئے!

P O. BOX 435
DAHRAN - 31261
K S.A.

اطہر راز

غمِ تنہائی سے بچنا ہے تو گاتے رہنا
کون دیکھے گا تمہیں شور مچاتے رہنا

آئینے کو بھی ہے تقریبِ ملاقات کا شوق
خود پہ ہنسنا ہے تو اُس کو بھی ہنساتے رہنا

کچھ حسیں خواب حقیقت میں بدل جاتے ہیں
اپنے خوابوں کو تصوّر میں جگاتے رہنا

شہر کے اونچے مکانوں سے بہت دور کہیں
تم گھروندے کسی ساحل پہ بناتے رہنا

کیا خبر کوئی چلا آئے یکایک گھر میں
گھر کو کچھ تازہ گلابوں سے سجاتے رہنا

گھر کی دیواروں کو ہے حسن عداوت کا شعور
حال ان کو بھی اداسی کا سناتے رہنا

چند لمحوں کی ہیں مہمان کسی کی یادیں
راز یادوں سے خیالوں کو بچاتے رہنا

PRESIDENT, ASIAN WRITERS GUILD
21 - COLWOOD GARDENS,
COLLIERS WOOD,
LONDON SW 19 2DS, U K.

نسیم سحر

روشنی شہر پہ کب اُتری ہے!
شب گذرنے پہ بھی شب اُتری ہے

آزمائش کی گھڑی دھیرے سے
پھر سرِ شہرِ طرب اُتری ہے

منتظر کتنے بھنور اُس کے ہیں
ناؤ پانی میں جو اَب اُتری ہے

سلسلے آبِ رواں کے ہیں کئی
پیاس ہم پر بھی عجب اُتری ہے

دھوپ سے کھیت سبھی جل بھی چکے
اور بارش کہیں اب اُتری ہے

نیم خوابیدہ تھے اس وقت نسیم
یہ غزل آخرِ شب اُتری ہے

P O BOX 5925
JEDDAH - 21432, K S A.

قاضی فراز احمد

چلتے چلتے ہو جاتی ہے چلنے سے معذور ہوا
جیسے ایک حباب کے اندر پانی میں محصور ہوا

زہر اٹھائے پھرتی ہے یہ سانسیں حسرت اور دھواں
شمشانوں سے قبروں تک ہے دھرتی کا ناسور ہوا

لوگ ہوا میں اُڑتے بھی ہیں آخر کو گر جاتے ہیں
شیشہ ٹوٹا بکھر گیا ہے کیسی چکنا چور ہوا

آندھی اور طوفانوں سے تنکا تنکا ہوا ہوا
کل تک چن کر خود لاتی تھی یہ تنکے مزدور ہوا

ایک سرابِ صحرا سا ہے چہرہ گرم ہواؤں کا
ایک ہے خوشبو اور صبا تک یہ چشمِ بد دور ہوا

دُور زمیں سے جانے والے اور فراز تو پہنچیں گے
لیکن دھیرے دھیرے ان سے ہو جائے گی دور ہوا

P O BOX NO 1021
DOHA - QATAR - (A G)

نسیم سیّد

مشورہ

خواہشوں کی تتلی کے
پرتراشس کر رکھنا
دور دور تک پھیلے
رنگ کے اُجالوں میں
خوشبوؤں کے جنگل میں
عنکبوتی لمحے بھی
سانس لیتے رہتے ہیں
جال بُنتے رہتے ہیں
خوش گماں اڑانوں کے
پر بریدہ جسموں کو
بے بسی کے منظر میں
قید کرتے رہتے ہیں
بے بسی کے سب منظر
اپنے دھیان پر رکھنا
خواہشوں کی تتلی کے
پر تراشس کر رکھنا

606 - COUNTER STREET
KINGSTON, ONTARIO
CANADA K7M 346

نیّر جہاں

نیا منظر - پُرانا غم

ایک جلتے کاغذ کا
یاد کے سمندر سے
جانے کیسا رشتہ ہے

ہے دھواں دھواں ہر سو
اس دبیز کہرے میں
سائے سے اُبھرتے ہیں
نیلے نیلے کاغذ پر
دھندلے دھندلے سائے پھر
جیسے جلتے حرفوں میں
دھیرے دھیرے ڈھلتے ہیں
آگ اور دھواں ہر سو
جیسے پھیل جاتا ہے
اک عذاب بینائی!
آنکھ پر گزرتا ہے

ہم نے صرف دیکھا تھا
ایک جلتے کاغذ کو

721 - HILL STREET, SUIT III
SANTA MONICA, CA 90405
U S A

عذرا نقوی

دیواریں

سدا ہم نے توڑیں دیواریں، گرائی فصیلیں
بہت حبس تھا
دم گھٹا جا رہا تھا
روشنی کی کمی تھی

شوق تھا
دیکھیں دیوار کی اس طرف
ایک نادیدہ جنّت کے سپنے لئے
کچھ نیا ڈھونڈ لینے کی خواہش میں
کب گھر سے نکلے تھے بندھن جھٹک کر
چاہتوں کے دیئے ٹمٹماتے رہے، گھر کی دہلیز پر

کون سا شہر ہے
کون سا سال ہے۔
کس قدر تیز ہے یہ ہوا
دم گھٹا جا رہا ہے۔
کاش دیوار ہوتی کہیں
سر چھپانے کا کونہ ہی ہوتا
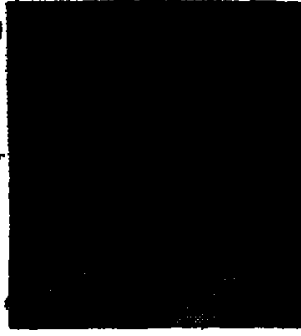
C/O DR PARVEZ AHMED
COLLEGE OF COMPUTER SCIENCE
KING SAUD UNIVERSITY
P O BOX 51178, RIYADH - 51143
K.S A

اقبال فرید

U A C, P O. BOX NO 335
DAMMAM 31411, K S.A.

ہنگامۂ ہستی میں جو میں ڈوب گیا ہوں
دنیا یہی کہتی ہے تمہیں بھول چکا ہوں

اک بار ذرا میرے قریب آ کے تو دیکھو (ق)
اب بھی اسی شدت سے تمہیں پوج رہا ہوں

مہلت ہی نہیں پرسشِ احوال کی تم کو
اور میں بھی عجب کشمکشِ دل میں پڑا ہوں

کیا جانے کہاں لے کے اڑیں مجھکو ہوائیں
سوکھے ہوئے پتے کی طرح ڈول رہا ہوں

اک وقت ہے آئیگا تو روئے گا زمانہ
میں آج تو چپ چاپ ہوں راضی برضا ہوں

ہے کون جو آئے مری تنہائی کو بانٹے
صحرا کا شجر ہوں بڑی مدت سے کھڑا ہوں

نیرنگئ دنیا پہ فرید ہنستا تھا پہلے
اب جب بھی ذرا وقت ملا خود پہ ہنسا ہوں

گلشن کھنہ

42 - OSBORN ROAD
HOUNSLOW, MIDDX TW3 3PT U K

نیچے نہ آ گرے کہیں اونچی اڑان سے
چھتر نہ پھینک کانچ کے نازک مکان سے

ہر منزلِ حیات پہ جو سربلند تھے
بے بس ہوئے ہیں آپکی میٹھی زبان سے

حد سے سوا ستم نہ کرو ہم پہ ظالمو
برقِ تپاں گرے نہ کہیں آسمان سے

سب کو بچانے آئے گا پھر کوئی دیوتا
چھوڑے گا تیر جب کوئی ظالم کمان سے

طغیانیوں کے زعم میں اٹھی تھی موجِ آب
ٹکرا کے لوٹ آئی ہے اونچی چٹان سے

گلشن میں رقص کرتی ہیں صحرا کی آندھیاں
سچائیوں کا ذکر کریں کس زبان سے

طاہر مجید

BAHNHOF STR 71
63263 - NEU ISENBURG GERMANY

جو لوگ سرِ کوئے ملامت نہیں آئے
اس موڑ سے گذرے تو سلامت نہیں آئے

جس گھر میں ہو موجود کوئی حشر کی صورت
اس جگہ کوئی اور قیامت نہیں آئے

روٹھی تو ہوا، حبس یہاں چھوڑ گئی ہے
اب لوٹ کے طوفان کی صورت نہیں آئے

میخانے سے ہم لوٹ کے مسجد ہی تھے پہنچے
مسجد سے جو نکلے تھے وہ حضرت نہیں آئے

ہر سمت مکاں اپنے مکینوں سے ہوں خالی
اس بات کی پھر شہر میں نوبت نہیں آئے

طوفاں سے گذرتا ہوں میں اک کھیل سمجھ کر
راہوں میں مری آج بھی پربت نہیں آئے

طاہر کی یہی ایک دعا ہے میرے مالک
جب آؤں ترے پاس، ندامت نہیں آئے

مصطفیٰ شہاب

14 THE GARDENS
PINNER MIDDLESEX HA5 5DW U K

وہ لہو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا
میری خو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

خوف اک بلندی سے پستیوں میں رُلنے کا
آب جو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

دفعتاً رگِ جاں سے بولتا ہے وہ قطرہ
جو سبو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

اک خوشی کا آنسو بھی میرے دیدۂ نم کا
آبرو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

دل وہ ایک پاگل ہے جو شہاب دنیا کی
آرزو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

ارشد غازی

P O BOX NO. 1435 JEDDAH K.S.A.

جو سوئے دار سفر کا کبھی ارادہ کرو
تو تجرباتِ زمانہ سے استفادہ کرو

ہوا کی طرح گذر جاؤ گے تو پاؤ گے کیا
تمہیں جو شوقِ سفر ہے تو پا پیادہ کرو

شعور و فلسفہ و علم و آگہی کا نصاب
کتابِ زیست میں الفاظِ نظم سادہ کرو

سکوں پذیر دلوں پہ صیقل ہے وقت کی تلوار
صلیب و منبر و میزان ایستادہ کرو

انہیں خبر ہی نہیں کل سبو پہ کیا گذری
جو کہہ رہے تھے "درِ میکدہ کشادہ کرو"

تبسم حیدرآبادی

P O BOX NO 24327 SAFAT CODE 13104 KUWAIT (A G)

جگر کے خون سے پُر نور جس نظر کو کیا
اُسی چراغ نے تاریک میرے گھر کو کیا

تمام عمر گذاری ہے دشت گردی میں
تمام عمر بہت یاد اپنے گھر کو کیا

غموں کی دھوپ میں بیگانہ ہو گیا وہ بھی
لہو سے سینچ کے سرسبز جس شجر کو کیا

اسی کے فیض سے خوش حال میرا گنبد ہے
کہ اپنے سجدوں سے آباد جس کے در کو کیا

وہ میرا دل تھا تبسم کسی کو کیا معلوم
کہ اپنے ہاتھوں سے برباد جس نگر کو کیا

بخش لائلپوری

33Y- STAZAES ROAD
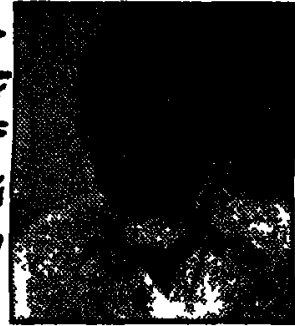
جہانِ جبہ و دستار کی حمایت کیا
یزیدِ وقت ہے کیا اور اس کی بیعت کیا

منافقانہ روش عام ہوتی جاتی ہے
نقاب پوشئ احباب کی شکایت کیا

کسی بھی شخص کو اب حرفِ حق کا پاس نہیں
پنپ رہا ہے یہاں یہ دروغِ حکمت کیا

مجاورانِ جہالت کے بالاخانوں میں
سخن طرازئ علم و ادب کی قیمت کیا

مزہ تو جب ہے کہ رنگِ سخن ہو وجہ نمود
جو اشتہار کی محتاج ہو وہ شہرت کیا

جو مل رہا ہے تمہیں غیر کی عنایت سے
یہی ہے سانس تو اس سانس کی قیمت کیا

چمٹ رہے ہیں سبھی سیم و زر کے لقموں پر
ہوس گری ہے فقط منصب و وزارت کیا

فیاض الدین صاحب

P O BOX 17813 BAYBELEY HILLS CALIFORNIA

روح جب درد کی شدت سے گذر آتی ہے
ایک تصویر بہت خوب نظر آتی ہے

رات آنکھوں میں نیا شہر بسا لیتا ہوں
موم کے شہر میں پھر دھوپ اتر آتی ہے

کچے آنگن میں جو سایہ تھی برائے تعمیر
اب تجاوز میں وہی شاخِ شجر آتی ہے

میں کہ سچ بول کے سولی پہ چڑھا ہوں لیکن
اپنے ہونے کی مجھے آج خبر آتی ہے

ان کے آنے کی تمنا تو تمنا ہی رہی
کاش کرتے وہی امید جو بر آتی ہے

سوچتا ہوں کہ گرا دوں میں یہ دیوارِ خرد
یار کے شہر سے جب دیدۂ تر آتی ہے

سحر اکبر آبادی
P O BOX NO 13159 DAIYA CODE 35452 KUWAIT (A.G)

تدبیر کا کرم تھا، مقدر میں کچھ نہ تھا
وہ عزم آدمی تھا، سکندر میں کچھ نہ تھا

تیرے کرم کی بات تھی، گھر میرا جل گیا
ورنہ میں جانتا ہوں مرے گھر میں کچھ نہ تھا

معراج میکدے میں میسر ہوئی مجھے
تیری نظر کا کیف تھا، ساغر میں کچھ نہ تھا

ساحل خموش تھا کہ کوئی حادثہ ہوا
کچھ لوگ کہہ رہے تھے، سمندر میں کچھ نہ تھا

اشکوں سے جھانکتی تھی مرے خوں کی روشنی
میرے لہو کی آب تھی، گوہر میں کچھ نہ تھا

دامن پہ میرے خوں کے نشاں تک نہیں ملے
تیری نظر کا وار تھا، خنجر میں کچھ نہ تھا

مجید اختر
19625 JACOB AVE CERRITOS, CA 90703 USA

حرمت حرف ہے ارزاں سر بازار اب کے
ہو گئے ہیں اہلِ قلم شر کے طرفدار اب کے

دل تو ٹوٹا تھا کئی بار سرِ دشتِ وفا
ٹوٹ جائے نہ کہیں جسم کی دیوار اب کے

یوں تو پہلے بھی رہے مجھ پہ بہت انکے کرم
میری نظروں سے نہ گر جائیں مرے یار اب کے

روشیں خون میں تر، شاخ سے اٹھتا ہے دھواں
کیسے حالات سے گذرا ہے چمن زار اب کے

تیر نظروں سے چھپا رکھے ہوں شاید اختر
ہے جو مائل بہ کرم شہرِ ستمگار اب کے

احسن عزیز
6 MILNER CLOSE TEMPLE STOWE AUSTRALIA 3106

دِل ہر شئے کا محور ہے
ساری دُنیا اندر ہے

منزل ڈھونڈھنے خود آئے
اِس کا نام مُقدر ہے

شام یہ کس کی یاد آئی
سارا درد معطر ہے

دشت نہ آجائے جس میں
ایسا گھر بھی کیا گھر ہے

انساں پاگل ہو جائے
دُنیا جادُو منتر ہے

آنکھیں ملتے رہیئے یوں
سارا خواب کا منظر ہے

تھوڑی دیر تو ہنس لیجیے
جینا یوں بھی دوبھر ہے

عبد اللہ ساجد
P O BOX NO 4575 SAFAT 13046 KUWAIT (A.G)

دور جو امکاں کی سرحد سے گذرتا ہے ابھی
تو پکارے تو پلٹ آئیگا زندہ ہے ابھی

خواہشوں کی وسعتیں چھبتی ہیں میرے جسم میں
زندگی صحرا میں آوارہ بگولہ ہے ابھی

گھر کے آنگن میں کھلی کلیوں کی خوشبو کے سوا
اس جہاں میں اور کیا میرا اثاثہ ہے ابھی

کیا پتہ کب اپنی منزل کا ملے مجھکو نشاں
ہر طرف لاسمتیت کا ایک صحرا ہے ابھی

حوصلہ ٹوٹا تو ڈس لیں گی اسے تنہائیاں
چیختے، کالے جزیرے میں اکیلا ہے ابھی

آکے منزل پر بھی ساجد پاؤں قابو میں نہیں
راستے کا بوجھ جیسے سر پہ رکھا ہے ابھی!

آغا بابر

BOX 177, WHITE PLAINS ROAD
TARRY TOWN NY 10591
U.S.A.

تِکھل

"آپ کی وہ آرہی ہے۔ گول گول ڈھیلے مٹکانے والی۔ اس کے ساتھ آنکھیں ملا کر تڑک تڑک باتیں نہ کیجئے گا۔ وہ بھی آپ کے آگے پیچھے پھری تو مجھ سے رواداری نہ ہو سکے گی۔ گھر آئی کی بے عزتی کر دوں گی۔"

ایک ہی سانس میں حرارتِ عزیزی کتنی بڑھتی جا رہی تھی۔

سلامت نے کہا "میری جان سات بجے ان کی گاڑی آئے گی میں سات سے پہلے ہی دوست کے ہاں چلا جاؤں گا۔ کھانا بھی وہیں کھاؤں گا اور پھر دیر سے آؤں گا۔ کالے منہ والا ان کے منہ ہی لگتا۔"

"وہ ہوں کالے منہ والے آپ کیوں۔"

حرارت کا پارہ ایک دم سے گر گیا۔ احمد سلامت علی خوش ہوا۔

"عارفہ کا ذکر ہو تو میرا ہی منہ کالا ہوتا ہے۔ کتنے رشتے شادی سے پہلے آتے ہیں مگر رشتہ وہیں ہوتا ہے جہاں سنجوگ ہو حد یہ کہ ہر دفعہ مجھے ہی اپنی تختی دھونی پڑتی ہے۔

"کیا پکاؤں اُن کے لئے؟"

رشتے دار جتنے تمہارے اتنے میرے۔ جو جی چاہے پکاؤ"

وہ جب ٹیکسی پر واپس آیا کئی دکانیں بند کئی نکڑوں پہ کتے بھونکے کئی ٹیکسی کے پیچھے بھاگے۔

نوکر نے دروازہ کھولا۔ پوچھا۔ "مہمان آگئے۔"

"جی"

"کہاں اتارا؟"

"نیچے برآمدے میں میاں صاحب۔ اوپر کے کمرے میں بی بی جی"

وہ کپڑے بدلنے کو اپنے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ پلنگ کو اپنی جگہ سے کھینچ کر کھلی کھڑکی کے سامنے بچھایا گیا تھا۔ گرمیوں کے موسم کے بعد گلابی موسم تھا۔ کبھی سردی کبھی گرمی۔ آدمی بھی ساتھ ساتھ کبھی سرد کبھی گرم۔

کھڑکی سے باہر چاند چمک رہا تھا۔ مدہم مدہم روشنی عارفہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے کمرے کے کونے میں رکھی جناتی الماری کی اوٹ میں کپڑے بدلے اور چور نگاہ سے اس کو دیکھتا رہا۔ جس نے کروٹ بدل لی۔ گردن سے نیچے چادر جو کھسکی تو اس کی گردن کی گولائی اور ٹھوڑی کا خم دکھائی دینے لگا۔ اس کے کندھے کتنے گول تھے ایک ایسی جامد تصویر معلوم ہو رہی تھی جس کے بدن کا اونچا نیچا گلدستہ نالائق چادر کے چوکھٹے کے نیچے دب گیا تھا۔ اس کا جی چادر کو کھینچ کر بستر پہ سوئی ہوئی بچپن کی منگیتر کی پوری تصویر دیکھنے کو کیوں چاہا؟ یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی کہ وہ اس بدن کو اسیر کرے جس کا صرف چہرہ چادر سے باہر تھا۔ روزنِ حسن کا یہی تھا جو سمٹا اس سے بھرا بھرا تھا۔ اس کے نتھنے کتنے خوبصورت تھے جو سانس لینے سے گلابی ہوتے جا رہے تھے دو شادیاں عارفہ کی ناکام رہیں۔ اولاد کا نہ ہونا وجہ تھی۔ سلامت ڈر بھی رہا تھا اور ڈر کر کوئی طاقت باہر دھکیل بھی رہی تھی۔ وہ ہمت سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے میں کیا غیبی طاقت تھی کہ عارفہ کی آنکھ کھلتے ہی حلقۂ زلف اور گوشۂ رخسار کے ساتھ گفتگوئیں سانسوں میں ہونے لگیں۔ جس طرح بدلیاں پانی کے ڈول بھر بھر کر لائیں اسی طرح گھٹا چکرا کر ایسی برسی کی جل تھل کر گئی۔

برابر کے کمرے میں کھانے کی میز تھی۔ اگلے کمرے میں چار بچوں کو لے کر سلامت علی کی ساس سو رہی تھی۔ وہ بغیر آہٹ کے فرج کے پاس سے گزر گیا۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی فرج کھولنے سے روشنی ہو جاتی اس نے کچن کے نلکے سے پانی کا گلاس بھرا

اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اوپر برساتی میں اس کی بیوی دو سوتی کی چادر سے بے خبر سو رہی تھی اس نے ساتھ بچھی چارپائی پر لیٹ کر چادر اپنے اوپر کھینچ لی پھر کروٹ بدل کر اپنا ہاتھ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کچھ سوچ کر بیوی کی چادر میں جا گھسا۔ نیچے اس کا بچہ رونے لگا۔ سلامت علی کی ساس نے پچکار کر سلانا چاہا مگر وہ روتا رہا۔ اپنے کمرے سے آکر عارفہ نے اٹھا لیا۔ بچہ چپ ہو گیا "خالہ میں ساتھ لٹا لوں۔ سوئے تو اٹھا لینا۔ چاہے میرے ساتھ ہی لیٹا رہے۔"

بچے کو اس نے اپنے سینے کے نرم و گداز کشن پر لٹا کر ملائم پیار سے تھپکا تو بچہ نئی عورت کے سینے کی نرمی گرمی کی بو باس کی ٹکور میں چکرا کر سو گیا۔

صبح ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہی الیاس نے پہلا کام یہ کیا کہ بچے کے ہاتھ میں سو کا نوٹ دے کر بولا۔

"یہ بچے کا حق ہوتا ہے۔ میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ بہت مبارک ہو" سلامت اور مہرو نے ممنونیت کا جذبہ محسوس کیا۔ مہرو اوپر اوپر سے بولی "نہیں چچا جان۔"

الیاس نے کہا "مہرو! کتنی خوشی کی بات ہے۔ تین بیٹیوں کے بعد بھائی ہوا اب سلامت یہاں مجھے یہ بتاؤ انٹرویو میں کیسے سوال عارفہ سے پوچھے جائیں گے۔

"بس چچا پرسنل سے سوال ہوا کرتے ہیں اور یہ محکمہ بھی تو نیا نیا کھلا ہے سوال پرسنل ہی ہوں گے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اللہ کو جو منظور"، الیاس نے کہا۔

اللہ کو جو منظور میں ایک شکستگی کا لہجہ تھا جس پر ڈھکنا رکھنے کو سلامت علی نے اطمینان دلانا چاہا مگر کچھ نہیں پایا۔ صرف یہ کہا "ہاں چچا جو اللہ کو منظور۔ دیکھئے نا آپ، دوسری بار ہمارا خیال تھا لڑکا ہوگا۔ لڑکی ہوئی۔ تیسری بار پھر لڑکی ہوئی۔ ہم نے خیال چھوڑ دیا تو اب تین لڑکیوں کے بعد لڑکا ہوا۔ لوگ کہتے ہیں تین لڑکیوں کے بعد کا لڑکا تکھل ہوتا ہے۔ اب بتائیں یہ تکھل کیا ہوتا ہے؟"

دیکھو نا کتنی باتیں ہمارے خیال نے بنائی ہوئی ہیں اور پھر یہ کہ خیال میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ خیال مسلط ہو جائے تو آدمی چکرا جاتا ہے۔ خیال کو وہم بھی کہا جاتا ہے۔ وہم میں کتنی طاقت ہوتی ہے پاگل کر دیتا ہے۔ کچھ ڈھکوسلے بھی وہم اور خیال سے بنتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ عارفہ ہمارے سامنے ہے۔ پہلی شادی ناکام۔ دوسری میں بیوہ ہو گئی۔ بتاؤ یہ تکھل تھی۔

مہرو نے معصومیت سے پوچھا۔ "چچا تکھل کے معنی کیا؟

"چرخے میں جو تکلا لگا ہوتا ہے جو گھومتا ہے اور روئی سے دھاگا کھینچتا ہے اس کی تیز نوک کو تکھل کہا جاتا ہے۔"

نوکر بھاپ نکلتے تلے ہوئے گرم گرم گوشت لایا جو مہرو نے الیاس احمد اور عارفہ کے سامنے رکھ دیے تو بات کا رخ بدل گیا۔

"وہ انٹرویو میں کامیاب ہو گئی تو پھر تین مہینے کی ٹریننگ۔ ٹریننگ کے بعد امتحان۔ پاس ہو گئی تو ملازمت۔ نہ ہوئی تو جواب" عارفہ نے جب یہ بات کہی تو اس کے لہجے میں ہمت اور دلیری تھی جس سے مہرو متاثر ہو کر بولی "سب ٹھیک ہو جائے گا عارفہ۔"

عارفہ اپنی دلیری کے لہجے سے چاہتی بھی یہی تھی کہ مہرو متاثر ہو جائے۔

الیاس احمد نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "انٹرویو سے فارغ ہو کر ہم سیدھے وہیں سے واپس چلے جائیں گے۔

جیتی رہو مہرو تم نے ہمارے لئے بہت تکلف کیا۔"

"میاں بیوی دونوں مہمانوں کو نیچے ٹیکسی تک چھوڑنے گئے۔ مہرو نے مسکرا کر کہا "آپ نے اب کے بہت اچھا بھلا ہو گیا۔ آنکھیں اس نے بھی نہیں مٹکائیں۔"

اس نے مہرو کا ہاتھ چوم کر کہا "شکر ہے تم خوش ہو گئیں۔

عارفہ کو انٹرویو میں چن لئے جانے کی خبر سے دونوں کو خوشی ہوئی یہ خبر اس وقت آئی جب تکھل کی نحوست کی کہانیاں سن سن کر احمد سلامت علی کے اندر کی مضبوطی کمزور ہونے لگی تھی دفتر کے بعض لوگ بھی یہی کہتے کہ تکھل بیٹا بیٹیوں کے لئے منحوس ہوا کرتا ہے ایک نے ایک طرف کونے جا کر کہا "کس خیال کے پیچھے لگ گئے ہو ڈھکوسلے ہیں۔"

بعض یہ کہتے "یہ سب ستاروں کے کھیل ہیں۔ سب کچھ جاننے کے باوجود ہم کچھ نہیں جانتے۔ داناؤں کے اقوال ڈھکوسلے نہیں ہوتے تجربے دانش غور و نظر کی پیداوار ہوتے ہیں گردش عمل جاتی ہے مگر آتی ضرور ہے۔

وہ کبھی بھی اس موضوع پر بیوی سے بات نہ کرتا بعض مرتبہ عورت سے زیادہ مرد عقیدے اعتقاد میں کمزور ہوتا چلا جاتا ہے

بیٹا اس کو روز بروز اچھا لگتا۔ جب وہ اس سے کھیلتا پیار کرتا۔ گو بولو کھل کھل ہنستا۔

سب سے بڑی لڑکی کو ایک روز سردی سے بخار ہو گیا بالکل بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا خون ٹیسٹ کراؤ۔ خدشہ ہے کہیں گردن توڑ بخار نہ ہو۔ ٹائیفائیڈ نہ ہو۔ ایک دن مہر و سارا دن بہت بہت ہی پریشان ہو کر اس کی چارپائی پر بیٹھی رو رو کر دعا کرتی رہی۔ بخار کو بارہ دن ہو گئے۔ ہمدانی سلامت کا دوست سمجھدار کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ جب سلامت نے اس کو یہ بتایا کہ کئی دنوں سے اسے خراب خراب خواب دکھائی دے رہے ہیں کہ بچی مر گئی ہے اور اس کے سرہانے اس کا بچہ کھل کھل ہنس رہا ہے تو ہمدانی نے کہا۔ بچوں والے گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار شیمار ہو ہی جاتا ہے۔ تم وہم مت کرو۔ ایک بزرگ اللہ والا بندہ ہے وہ مجھ سے آنے ہی والا ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔

بچی کی بیماری کے دوران انہیں خبر ملی کہ عارفہ نے نہر میں ڈوب کر خودکشی کر لی ہے۔ چچا الیاس کا برا حال ہے ٹریننگ کے بعد کے امتحان میں وہ فیل ہو گئی تھی اس نے جو خط چھوڑا اس میں لکھا ہے۔ " میں بڑی منحوس ہوں۔ میری دونوں شادیاں ناکام ہوئیں۔

چاہا تھا ملازمت کر لوں وہ بھی نہ ملی۔ اس دنیا میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ کوئی خوشی نہیں کوئی کامیابی نہیں۔ حیران ہوں اس دنیا میں مجھے کیوں بھیجا گیا اب میں اور دکھ نہیں سہہ سکتی اپنی مرضی سے ڈوبنے جا رہی ہوں۔

پھر یہ بھی سنا۔ بڑی مشکلوں سے اس کی نعش ملی جو سخت پھولی ہوئی تھی۔

حاجی پھوندی یہاں اپنی کوٹھری میں بچھی دری کے ٹکڑے پر بیٹھے کہہ رہے تھے " میں نے رات کو استخارہ کیا ہے۔ کچھ نئے دریافتیں بھی ہوئی ہیں۔ پھر چپ ہو گئے۔

سامنے بیٹھے احمد سلامت علی کی طرف دیکھ کر بولنا چاہا۔ مگر چپ ہو گئے کمرے میں بے کیفی پھیل گئی۔

سلامت علی اور سید ہمدانی دونوں کے دونوں پھر تذبذب سے دیکھنے لگے کہ وہ کچھ بولیں۔ ہمدانی نے ہمت کر کے کہا " تو پھر بتلایئے سرکار میاں۔ "

" مجھے سرکار میاں نہ کہہ ہمدانی پتر۔ میں تو گندی نالی کی اینٹ ہوں۔ کس گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اے ایاز اوقات پہچان یہ سب بڑی سرکار کا دیا ہوا ہے۔ مجھے اور اپنے دوست کو تنہا چھوڑ دو۔ ذرا پردے کی بات ہے۔

ہمدانی باہر جا کھڑا ہوا تو کمرے میں خاموشی کا بوجھل پن زیادہ ہو گیا۔ پھوندی میاں نے اس بوجھل پن میں ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ بولے " ڈوبنے والی تمہاری سب نحوستیں ساتھ لے کر چلی گئی۔ تمہارا بیٹا اگر نکھل تھا بھی اب نہیں ہے۔ نحوستوں سے دھل گیا۔ مرنے والی نے قربانی دے دی۔

یہ سن کر سلامت علی نے پھوندی میاں کے گھٹنے جا پکڑے اور بولا " آپ کو کس طاقت نے بتایا۔ کوئی ڈوبی کوئی مری بھی۔

اللہ والے بندے نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ " اب تن من سے سارا وہم سارا وسواس نکال دو مسٹر " مسٹر احمد سلامت علی حیران ہو کر پھوندی میاں کی نظروں میں نظریں ڈالے دیکھ رہا تھا اور پھوندی میاں کی آنکھیں کسی خیال سے ابل رہی تھیں۔

" دیکھو مرنے والی کی پیٹ میں تین مہینے کا تمہارا ہی بچہ تھا اب خوف کس بات کا۔ تمہارا بچہ تمہارے بچے پر قربان ہو گیا۔ وہ خودکشی نہ کرتی تو کیا کرتی بھٹکی ہوئی روح تھی۔ خاموشی کے دھوئیں نے پھوندی میاں نے آواز دی " سید ہمدانی اندر آ جاؤ۔ "

ہمدانی نے دیکھا پھوندی میاں شیشی سے عطر لے کر سلامت کے کپڑوں پر لگا رہا ہے پھر ہمدانی کے کپڑوں پر ملا اپنے چہرے پر لگایا اور بولا۔ میں نچڑ گیا ہوں ہمدانی پتر۔ تھک کر چور ہو گیا ہوں دماغ سکڑ گیا میں بڑی آزمائش میں تھا۔ شکر ہے سب کچھ صحیح نکلا یہ دریافتیں تیری کرامات ہیں بڑی سرکار۔ میں تو امرتسر کی نالی کی اینٹ ہوں میرے مولیٰ۔

یہ کہہ کر اس نے عاجزی سے آنکھیں بند کر لیں۔ سید ہمدانی نے کہا آپ بہت تھک گئے ہیں پھوندی سرکار۔ چلئے آپ کو چل کر چائے پلوائیں۔

وہ ایک گرمیٔ نشاط سے بولا " وہاں دلجان بائی کے ہاں پیئوں گا وہ میری ننھیال میں سے ہے " ہمدانی نے بشاشت سے کہا۔ " وہ چائے بھی پلائے گی گانا بھی سنائے گی۔

پھوندی میاں نے آنکھیں کھول کر کہا۔ تیرا دوست میرے

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھئے]

افتخار نسیم

1111N CLARK STREET
CHICAGO, IL 60610
U S A

پانچویں سمت

شہلا تیار بھی ہو چکی تھی اور احمد ابھی تک بستر میں تھا۔ شہلا نے اُسے دوبارہ آواز دی۔

اٹھ جاؤ ورنہ میں پانی پھینک دوں گی

اس کی یہ دھمکی ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسے دوسرے واش روم سے شاور کی آواز آئی۔ کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو پورے اپارٹمنٹ میں پھیل گئی۔ آٹومیٹک ڈرپ نے بڑبڑانا شروع کیا۔ ابھی دفتر جانے میں پونا گھنٹہ باقی ہے۔ شہلا نے آملیٹ کے لیے فرائی پین میں تھوڑا سا آئل ڈالا۔

اتنے میں احمد بھی آگیا۔

" مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

شہلا ناشتے میں صرف ایک کافی یا ایک آدھ ٹوسٹ پر گزارا کرتی ہے لیکن پچھلے دس سالوں سے وہ احمد کی اشتہا دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

اُسے ابھی تک یاد ہے جب وہ اُسے ملی تھی۔ پروفیسر راما نادھن نے انڈین پاکستانی اسٹوڈنٹس کو دعوت دی تھی، کھانا ویجیٹیرین تھا۔ شہلا ابھی ابھی لاہور سے آئی تھی۔ اس نے فزکس کے ایڈوانس کورسز میں داخلہ لیا تھا۔

وہاں اس کی ملاقات میبل موسز سے ہو گئی، وہ بمبئی سے تھی اور اُسے ہندوستانی پرانے گانے اور بھجن یاد تھے۔ آج شام کی پارٹی میں وہ دونوں پروفیسر راما نادھن کے گھر جا رہی تھیں جہاں میبل موسز نے کچھ گانے اور بھجن سنانے تھے۔

اپارٹمنٹ میں کوئی دس پندرہ سٹوڈنٹس پہلے ہی آچکے تھے ایک دوسرے سے تعارف ہو رہا تھا۔ مسز راما نادھن جنوبی ہند کی ایک انتہائی مہذب خاتون تھیں۔ اُسے جب علم ہوا کہ شہلا پاکستانی ہے تو وہ ایک لمحے کو غائب ہو گئی اور دوسرے لمحے ایک لڑکے کو پکڑ کے لے آئی جس کی شخصیت انتہائی غیر متاثر کن تھی۔

"یہ احمد ہے اور یہ بھی پاکستانی ہے۔ راولپنڈی سے شاید۔"

فضا میں کوئی آتش بازی نہ ہوئی نہ در و دیوار ہلے نہ کوئی زلزلہ آیا لیکن دونوں کو ایسے لگا جیسے وہ ایک تباہ شدہ بحری جہاز کے مسافر ایک بہت بڑے جزیرے میں گم شدہ، صدیوں کے بعد ایک دوسرے سے اچانک مل گئے ہیں۔

دو سال بعد انہوں نے شادی کر لی۔

شہلا کو شکاگو یونیورسٹی میں نوکری مل گئی اور احمد ایک آرکیٹیکچرل فرم میں انجینئر بن گیا۔ اپارٹمنٹ کے لکڑی کے فلور پر جب کسی ننھے منے قدموں کی آواز نہ آئی تو شہلا اُداس رہنے لگی۔ اس پر ڈیپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ جلد سو جاتی لیکن احمد کو رات گئے تک جاگنے کی عادت تھی۔ وہ کئی بار ڈاکٹر کے پاس گئے لیکن ڈاکٹر ہر ٹسٹ کے بعد دونوں کو "او کے" کہہ دیتا

آج بھی انہیں ڈاکٹر ہارش کے پاس جانا تھا

ڈاکٹر نے دونوں کو کمرے میں بلایا اور بڑی احتیاط سے اور نپے تلے لہجے میں یہ کہہ دیا کہ شہلا اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔

احمد نے شہلا کو سینے سے لگا لیا جو بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے دفتر سے چھٹی کر لی۔ سارا دن اکٹھے گزارا اور رات کا کھانا باہر ہی کھا کر گھر آ گئے۔

حسبِ معمول شہلا جلد سونے لگی لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی احمد کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا شہلا نے لیمپ کو بجھایا اور سو گئی۔

احمد نے محسوس کیا جیسے اس کے بستر کے گرد کچھ لوگ کھڑے ہیں تھوڑی دیر کے بعد اُسے آواز آئی۔

" مبارک ہو بیٹی پیدا ہوئی ہے " وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ایک نرس نے اُسے کندھے سے پکڑ لیا۔

" آپ اپنی بیٹی کا منہ نہیں دیکھیں گے؟ "

احمد نے اس کی ننھی منی شکل کو دیکھا جس کے ابھی نین نقش بھی نہیں بنے
تھے۔ پھر بھی وہ اُسے بہت پیاری لگی اس نے اُسے سینے سے لگایا اتنے
میں ایک نرس دودھ کی بوتل لائی۔

"مجھے دے دیجئے اس کا فیڈنگ ٹائم ہوگیا ہے۔"

احمد نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس نرس کے حوالے کردیا۔

اتنے میں اس کے کانوں میں شہلا کی آواز آئی

"اب اٹھ بھی جائیے کافی وقت ہوگیا ہے"

وہ شہلا کی پہلی ہی آواز سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن تھکا تھکا سا جیسے وہ رات
بھر نہ سویا ہو۔

وہ دفتر میں جلدی جلدی کام ختم کر رہا تھا۔ جیسے اُسے کہیں جانا ہے
شام کے پانچ بجتے ہی وہ دفتر سے نکل گیا۔ اور گھر آگیا۔ شہلا نے
دروازہ کھولا۔

احمد کچھ پکار رہا تھا۔

"آج میں تمہیں زبردست ڈنر کھلاؤں گا۔"

دونوں نے کھانا کھایا، ٹی وی دیکھا، دس بجے کی خبریں سننے کے
بعد بستر پہ آگئے۔

شہلا واش روم سے باہر آئی تو احمد سوچکا تھا وہ حیران رہ گئی اتنی
جلدی تو وہ کبھی نہیں سویا۔

احمد نرس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ بچی کو لائی

"آپ نے اس کا کوئی نام تجویز کیا ہے؟"

"ہاں اسے سارہ کہئے سارہ احمد"

احمد نے سارہ کو اپنی گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا

ایک دم سارہ بے چین سی ہوگئی۔ نرس سارہ کو اس کی گود سے لے کر
اپنے کندھے سے لگا کر اس کی پشت پر تھپکیاں دینے لگی، سارہ نے
"برپ کیا" پھر نرس نے اس کا ڈائپر بدلا۔

اب سارہ بڑی ہوتی جارہی تھی۔ اس کے دانت نکلنے کے مراحل
سے لے کر پہلا قدم اٹھانے تک احمد اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔

سارہ کا قد جوں جوں بڑھتا گیا، احمد کی عادات بھی تبدیل ہوتی
چلی گئیں۔ اب وہ جلدی سوجاتا تھا اور اُسے پہلے جیسی بھوک بھی نہیں
لگتی تھی۔ وہ سارہ کو کھانا کھلاتے خود بھی کچھ کھالیتا تھا۔

ایک دن نرس نے احمد کو کہا کہ وہ سارہ کو بڑی نرسری اسکول میں داخل
کرادے اب وہ ایک ننھی منی بچی بن گئی۔ احمد کو پہلی بار سارہ سے
جدائی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ اسکول میں باقی بچوں کے ساتھ
ایک ہفتے کے لئے "کیمپنگ" کے لئے گئی۔

احمد کی نیند اڑگئی وہ سارا دن، رات ہونے کا انتظار کرتا لیکن رات
کو اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وہاں اب سارہ نہیں تھی۔ وہ ہفتہ
اس نے دفتر میں اونگھ اونگھ کر وقت گزارا۔

شہلا نے محسوس کیا کہ احمد اب صبح کا ناشتہ بالکل نہیں کرتا۔ صرف کافی
پی لیتا ہے۔ اس نے سوچا شاید یہ بھی احمد کے ڈیپریشن کا ایک حصہ
ہے۔

شہلا نے کئی بار اس سے شکایت کی۔

"آپ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے۔؟"

آج احمد بہت خوش تھا سارہ نے ہائی اسکول پاس کرلیا تھا، پرام نائٹ
پر تو وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ اب اس کی گریجویشن تھی۔

اس دن وہ دفتر میں اپنا بہترین سوٹ پہن کر گیا۔ اس نے دفتر والوں کو
کیک بھی کھلایا لیکن اس کی کوئی وجہ نہ بتائی کہ کہیں وہ اُسے پاگل نہ سمجھنا
شروع کردیں۔

سارہ نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ احمد کے بال سفید ہونا شروع
ہوگئے۔

جب سارہ نے کالج گریجویشن کی اس وقت تک شہلا اور احمد "مڈل
ایج" میں داخل ہوچکے تھے۔

ایک دن سارا نے احمد سے کہا

"ڈیڈی میں اپنے دوست سے آپ کو ملانا چاہتی ہوں" احمد نے
چونک کر سارہ کی طرف دیکھا۔

وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اچھا تو اب وہ وقت آپہنچا ہے جب بیٹی اپنے باپ سے جدا ہو
کر اپنے جیون ساتھی کے ساتھ اپنے رستے پر گامزن ہوجاتی ہے۔

"ضرور میں اس سے ضرور ملوں گا"

احمد نے صبح صبح اٹھ کر تیار ہونا شروع کردیا۔ شہلا حیران تھی کہ
آج اُسے احمد کو جگانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

مارگریٹ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ ہر ہفتے آکر اپارٹمنٹ
کی صفائی کرتی تھی۔ احمد اس سے پہلے گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"کافی دوں" شہلا نے پوچھا

"نہیں میں خود لے لوں گا۔ آج تم گاڑی لے جاؤ مجھے ذرا بینک رکنا ہے

[باقی صفحہ ۷۹ پر دیکھئے]

جاوید دانش
333 DOVEDALE DRV
WHITBY ONTARIO L1N 1Z8
CANADA

نجات

کردار ـــــــ

جارج ـــ ایڈز کا مریض جو بستر مرگ پر ہے!
فرنانڈو ـــ جارج کا ہمزاد!
ڈاکٹر ڈوکٹر ـــ جارج کا ڈاکٹر!
فادر ولسن ـــ ایک رومن کیتھولک پادری!
انتھونی ـــ جارج کا بھائی!
مسٹر اور مسز اسمتھ ـــ جارج کے والدین!
مسٹر ریگن ـــ فیونرل ہوم کا انچارج!
سین ـــ فیر لان نرسنگ ہوم ـــ

جارج نرسنگ ہوم کے بیڈ پر زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے اس پر جاں کنی کا عالم ہے۔ نقاہت کے ساتھ وہ بے چین نظر آرہا ہے اسے ڈرپ لگی ہوئی ہے اس کے سرہانے فرنانڈو کھڑا ہے۔ جس پر رقت طاری ہے۔ اس نے جارج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اسے سہلا رہا ہے۔ وہ وقفے کے ساتھ جارج کی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا ہے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتا ہے اور دروازے کی طرف بھی دیکھتا ہے۔ شام کے چھ بج رہے ہیں۔ دور کسی گرجا کے گھنٹے کی آواز سنائی دے رہی ہے پس منظر میں گہرا اندھیرا ہے یہ لوگ ایک ہلکے SPOT LIGHT میں نظر آرہے ہیں۔ فضا میں دھنوں کی دل سوز موسیقی مدھم ہوتی سنائی دے رہی ہے۔ جارج کے ہونٹ کانپ رہے ہیں جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

فرنانڈو۔ (جذبات پر قابو پاتے ہوئے مسکراتا ہے) تم بہت بہادر ہو جارج ڈاکٹر ڈوکٹر کہہ رہا تھا کہ آج ایک نیا انجکشن (آواز بھرا جاتی ہے اور وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے)

جارج۔ (نقاہت کے ساتھ) فرنانڈو! مجھے جھوٹی تسلیاں مت دو۔!

فرنانڈو۔ (اس کی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے) نہیں جارج تم ابھی ہارے نہیں۔

جارج۔ (آہستہ سے) مگر میں تھک گیا ہوں ڈیئر (PAUSE) آج اس وقت خود کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کر رہا ہوں۔ (کھانستا ہے) لگتا ہے میرے پر لگ گئے ہوں۔ اور۔ اور میں اڑ رہا ہوں۔ PAUSE اچانک درد کہیں غائب ہوگیا ہے یا اب مجھے محسوس ہی..... (کھانستا ہے کراہتا ہے) کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ (آنکھیں بند کرتے ہوئے) ایک عجیب سی بوجھل خوشبو ہے فضا میں سانس (زور زور سے سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے) سانس بھاری ہوتی جا رہی ہے (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)۔

فرنانڈو۔ (جارج کو اٹھنے سے روکتے ہوئے) نہیں جارج۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔

جارج۔ (پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ) آرام! ہاں مجھے نیند بھی آرہی ہے۔ (سانس درست کرتے ہوئے) میں خوش ہوں تم میرے پاس ہو۔ (جارج کا ہاتھ فرنانڈو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے)۔ میرے ہمدم تم بزدل نہیں ہو، تم میری طرح اپنے نفس کا دم نہ توڑنا۔ اب جب ساری آزمائشیں ختم ہونے کو ہیں تو۔ اڑنے کو جی چاہ رہا ہے۔ چیخ کر دنیا کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ہیں جارج اسمتھ۔ ایک انسان۔ (کھانسنے لگتا ہے)

فرنانڈو (بے بس ہو کر) جارج پلیز!

جارج۔ (سانس درست کرتے ہوئے) آج تک تو میں خاموش ہی رہا اپنی زندگی کی خاطر آج جب..... (کھانستا ہے) بولنے دو مجھے صرف ایک بار۔ فرنانڈو۔ وعدہ کرو۔ میری آخری خواہش پوری کرو گے۔

فرانڈو۔ (جلدی سے) ہاں میں وعدہ کرتا ہوں جارج! پورا کیا جائے گا

جارج۔ (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) اب میں ——— سکون کی نیند سو سکوں گا۔ (فرانڈو رومال سے اس کی پیشانی پونچھتا ہے) آج ——— شاید ——— میری آخری رات ہے ——— جو وقعت مجھے زندگی نے نہیں دی ——— وہ موت سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کفن دفن باعزت کیتھولک طریقے سے کرنا ——— تمام رشتہ داروں ——— اور دوستوں ——— کو بلانا۔ ——— اور مجھے ——— اپنے خاندان کے ... قبرستان میں ——— دفن کروانا۔ اور کتبے پر پورا نام جارج اسمتھ کندہ کروانا۔ بس (زور زور سے سانس لیتا ہے) اور میری تمام چیزیں تم اپنے مصرف میں رکھنا۔ (کھانستا ہے) صرف میرے گلے کا لاکٹ ——— میری ماں ——— کو دے دینا۔ ——— اور ——— اس کو رونے نہ دینا۔ اور

فرانڈو۔ (بات کاٹتے ہوئے) بس بس جارج ——— بس خاموش ہو جاؤ۔ (اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے)۔ میں تمہاری آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں!

(ڈاکٹر دکتر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ فرانڈو ——— آؤ میرے ساتھ (ڈاکٹر فرانڈو کو ایک کنارے لے جاتا ہے)

فرانڈو۔ (التجا کرتے ہوئے، ڈاکٹر مجھ سے اب جارج کی حالت دیکھی نہیں جاتی ——— اسے نیند کا انجکشن کیوں نہیں دیتے ڈاکٹر!

ڈاکٹر۔ حقیقت سے آنکھیں مت چراؤ فرانڈو ——— تمہیں معلوم ہے جارج اب صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ کیا تم اس کے گھر والوں کو خبر نہیں کرو گے؟ یا شاید آخری تیاریاں بھی تمہیں ہی کرنا ہیں ——— ہمت سے کام لو ——— اور جاؤ ——— وقت بہت کم ہے تمہارے پاس۔

فرانڈو۔ مگر ڈاکٹر اس حالت میں جارج کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں ——— کیا پتہ کس وقت ——— ——— ———

ڈاکٹر۔ تم اس کی فکر مت کرو ہم لوگ تو ہیں ——— !

فرانڈو۔ (خود کو سنبھالتے ہوئے) ٹھیک ہے ڈاکٹر (جارج کے پاس جا کر) میں تمہیں باعزت طریقے سے رخصت کروں گا جارج ——— تمہاری ہر خواہش کو پورا کروں گا (جھک کر جارج کی پیشانی چومتا ہے۔ جارج خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہا ہے۔ فرانڈو جاتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھتا ہے اور روشنی مدھم پڑ جاتی ہے)

(اسٹیج کے دوسرے سرے پر SPOT LIGHT میں ایک پادری بیٹھا بائبل پڑھ رہا ہے۔ اور فرانڈو گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

فرانڈو۔ گھبراہٹ کے ساتھ (فادر آج آپ انکار نہ کرنا ——— "جارج اب صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ پلیز فادر پلیز" FOR HEAVEN SAKE میرے ساتھ چلیں ——— اور اس کے لئے دعا کریں ——— اسے آپ کی BLESSINGS کی ضرورت ہے۔

فادر۔ (بیزاری سے) میری BLESSINGS اسے جہنم کی آگ سے نہیں بچا سکتی۔ اس نے فطرت اور قدرت کے خلاف ورزی کی ہے ——— اسے اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔ میں مجبور ہوں۔ ITS TOO LATE MY SON

فرانڈو۔ (الجھتے ہوئے) نہیں فادر ——— اب بھی دیر نہیں ہوئی ——— ایک پادری کا کام دعا دینا ہے ——— سزا سنانا نہیں ——— آپ بھی تو اپنی فطرت کے خلاف ضد کر رہے ہیں۔ پلیز فادر، اس کی آخری خواہش کا ہمیں احترام ......

فادر۔ (ناراضگی کے ساتھ) کیسا احترام! ——— جس نے قدرت اور اس کے قانون کا احترام نہ کیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔

فرانڈو۔ (التجا کرتے ہوئے) دنیا کی تمام مقدس کتابیں محبت اور سلامتی کا درس دیتی ہیں فادر آپ کو بھی محبت اور رحم دلی ....

فادر۔ (جھڑکتے ہوئے) مجھے محبت اور رحم دلی کا سبق مت پڑھاؤ ——— میں نے کبھی کر میں اپنے گرجا کے اصولوں کے خلاف نہیں جا سکتا۔ اور پھر جب تمہیں دنیا کے مذاہب کی اتنی معلومات ہے تو جاؤ کسی اور کو پکڑ کر BLESSINGS (زیر لب) مذہب اور قانونِ قدرت کا مذاق بنا رکھا ہے

تم لوگوں نے۔ اب برائے مہربانی جاؤ اور اپنے گناہ میں مجھے شریک نہ کرو۔ ــــ یہاں آنے کے بجائے تمہیں بھی اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔

فرنانڈو۔ فادر! ہم نے سنا تھا مذہبی رہنما بڑے خدا ترس اور رحم دل ہوتے ہیں۔ آج معلوم ہوا یہ سب جھوٹا پہلاوا ہے۔ ــــــــ مگر آپ نے اپنی سفید پوشی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ فادر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(فرنانڈو واپسی کے لئے مڑتا ہے فادر سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے اور روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔)

(SPOTLIGHT میں مسٹر اسمتھ دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہیں۔ قریب ہی مسز اسمتھ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی رو رہی ہے۔ ــــ سامنے فرنانڈو کھڑا اپنا ہاتھ مل رہا ہے۔ اور مضطرب نظر آرہا ہے۔)

فرنانڈو۔ (دھیمے لہجے میں) مسٹر اسمتھ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ جارج آپ کا بیٹا آپ کا خون ہے۔ پھر،

مسٹر اسمتھ۔ غصے سے پلٹتا ہے) یہی تو افسوس ہے۔ کہ وہ بدبخت میری اولاد ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ آج یہ سب دیکھنے کو میں زندہ ہوں (اپنا سر پکڑ لیتا ہے)

فرنانڈو۔ (دھیمے لہجے میں) اور آپ مسز اسمتھ آپ بھی۔ ــــ

مسز اسمتھ۔ (روتے ہوئے) میں کیا کروں! مجھے کچھ نہیں معلوم ــــ ــــ پتہ نہیں مجھ سے کہاں کون سی بھول ہوگئی۔

(دوبارہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے۔)

فرنانڈو۔ (غمگسار لہجے میں) بھول آپ سے نہیں، یہ بھول قدرت کی ہے کہ انہیں آدھے ادھورے بناکر ــــ خیر یہ بحث پھر کبھی ــــ میں ایک بار پھر آپ لوگوں سے گذارش کروں گا کہ تمام غصہ اور نفرت بھول کر اس وقت جارج کے پاس چلیں وہ آخری ہچکیاں لے رہا ہوگا۔ یا شاید تمام آزمائشوں اور کلفتوں سے نجات حاصل کرچکا ہوگا (فضا میں گھورتے ہوئے) کاش آپ لوگ اس کی جان کنی دیکھتے CHRIST SAKE فوراً چلیئے اور اسے تمام اذیتوں سے آزاد کرا دیجئے۔ ــــــ شاید

اس کی روح آپ لوگوں سے ملنے کو اٹکی ہو۔

(انتھونی داخل ہوتا ہے اور مسز اسمتھ روتے ہوئے اس کے گلے لگ جاتی ہے۔)

انتھونی۔ (فرنانڈو کو نفرت بھری نظر سے دیکھتا ہے۔) اوہ ۔ ۔ ۔ تم

مسز اسمتھ۔ (روتے ہوئے) جارج ۔ جارج! ہم کیا کریں انتھونی

انتھونی۔ (فرنانڈو کو گھورتے ہوئے) ہم کر بھی کیا سکتے ہیں جو راستہ اس نے اختیار کیا تھا۔ اس کا خاتمہ ایسے ہی شرمناک ہوتا ہے۔

فرنانڈو۔ انتھونی تمہارے اندر بھی اتنی نفرت، تمہیں جارج نے گود میں کھلایا ہے۔ وہ تمہیں اس قدر چاہتا ہے۔

انتھونی۔ (بیزاری سے) یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ عمر کا آدھا حصہ میں نے ایسے شخص کے ساتھ گذارا ہے ــــــــ ڈرتا ہوں مجھے بھی کہیں اس کی بیماری نہ لگ جائے۔

مسز اسمتھ۔ (جلدی سے) نہیں ۔ ــــ !

فرنانڈو۔ (رنجیدہ ہوکر) تمہارے خیالات سن کر بہت افسوس ہوا انتھونی اچھا ہے تم آخری وقت جارج کے پاس نہیں تھے ورنہ اس کی روح کو کبھی سکون نہ ملتا۔

انتھونی۔ ہونہہ۔ افسوس! یہاں شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم لوگ شہر چھوڑنے کا سوچ رہے ہیں۔ اس موت سے کیا ہم لوگوں کے منہ پر لگی کالک صاف ہو جائے گی! (وقفہ۔)

اب تو یہ ساری زندگی کی ذلت اور رسوائی ہے۔

فرنانڈو۔ یہاں مزید بحث کی گنجائش نہیں آپ لوگ میرے ساتھ ہو جائیں گے یا نہیں وقفہ (سب خاموش رہتے ہیں۔) ٹھیک ہے مگر جانے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جارج کی آخری خواہش ہے کہ اسے اسمتھ خاندان کے قبرستان میں دفن کیا جائے کیا آپ لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انتھونی۔ (جلدی سے) کبھی نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیوں ڈیڈی؟ باپ کی طرف دیکھتا ہے)

مسٹر اسمتھ۔ (آہستہ سے) ہوں۔ (نظریں نیچی کر لیتا ہے۔)

مسز اسمتھ۔ (پھوٹ کر روتے ہوئے) میں آخری بار۔ آخری بار جارج کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

انتھونی۔ نہیں ماں بھول جاؤ۔ کہ تمہارا کوئی بیٹا جارج بھی تھا۔

اب تم فرنانڈو جا سکتے ہو۔ اور آئندہ یہاں کبھی مت آنا۔

فرنانڈو۔ (رنجیدہ ہو کر) میں تو جا رہا ہوں انتونی۔ مگر تمہارا ضمیر تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ تم سب اتنے بزدل اور اس قدر سنگ دل ہو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

(روشنی مدھم پڑجاتی ہے۔)

(SPOTLIGHT میں مسٹر رمین اور فرنانڈو دکھائی دیتے ہیں)

رمین۔ (سمجھاتے ہوئے) دیکھو فرنانڈو۔ مجھے تم سے اور تمہارے دوست سے پورا ہمدردی ہے۔ مگر ہر کاروبار کی طرح ہمارے دھندے کے بھی کچھ اصول تھوڑی مجبوریاں ہیں۔ ہم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔

فرنانڈو۔ (حیرت سے) میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کا کام "کاروبار" فرض جو کہہ لیجئے۔ یہ ہے کہ آپ مرنے والے کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں۔ اور اپنی فیس لیتے ہیں۔ اس میں مجبوری کیسی۔

رمین۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ مرنے والا کون ہے موت کیسے واقع ہوئی ہے۔ کوئی مرڈر کیس تو نہیں ہے۔ کوئی ایڈس کا مریض تو نہیں ہے۔

(ادھر ادھر دیکھ کر) یہ چھوٹا سا ٹاؤن ہے۔ یہاں ہر ایک کو دوسرے کی خبر ہوتی ہے۔ کسی نے یہ سن لیا کہ میں ایڈز کے جنازے EMBALM کرنے لگا ہوں تو شرفا میرے یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔ اور میرا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔

فرنانڈو۔ دیکھئے۔ میں نے اپنے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ با عزت طریقے سے اس کا فیونرل ہوگا۔ آپ مجھے مایوس نہ کریں۔ انسانیت کے ناطے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مرنے والے کی آخری خواہش . . . .

رمین۔ (بات کاٹتے ہوئے) دیکھو میرے دوست تم اس وقت کچھ جذباتی ہو رہے ہو۔ اور میرے دھندے میں اپنا سنگار حقا تاہے۔ جذبات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رونا گانا تو ہم صبح و شام دیکھتے رہتے ہیں۔

فرنانڈو۔ ہم آپ کو منہ مانگی فیس دیں گے۔ کوئی صورت نکالئے۔
ایک صورت ہے۔

فرنانڈو۔ (جلدی سے) کیا؟ میں کوئی بھی رقم دینے کو تیار ہوں۔

رمین۔ دیکھو بھائی! میرے یہاں تو یہ کسی بھی قیمت پر ممکن نہیں۔ ہاں دفن کرنے کے بجائے تم CREMATION کے بارے میں سوچ سکتے ہو۔ خرچ بھی کم اور کام بھی جلدی کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

فرنانڈو۔ (سوچتے ہوئے) CREMATION نہیں جارج کی آخری خواہش تھی۔

رمین (بات کاٹتے ہوئے) ارے کیا آخری خواہش آخری خواہش کی رٹ لگا رکھی ہے۔ (منہ بناتے ہوئے) ایڈز کا مریض ہے جلدی سے ٹھکانے لگاؤ۔ ورنہ اس کی مصیبت تمہارے سر آجائے گی۔

فرنانڈو۔ (غصے میں) بند کرو اپنی بکواس (پیچ و تاب کھاتے ہوئے) آج معلوم ہوا میں کس جہنم میں سانس لے رہا ہوں۔ لعنت ہے تم لوگوں پر اور ایسی زندگی پر۔

رمین۔ (دھیمے سے) بھائی صاحب مجھ پر غصہ اتارنے کے بجائے ذرا اپنے کرتوت پر بھی نظر ڈالو (وقفہ) شکر کرو کہ لوگوں نے اب تک اپنی نفرت دلوں میں رکھی ہے۔

فرنانڈو۔ (فضا کو گھورتے ہوئے) اب زندگی سے تو موت اچھی۔

رمین۔ (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) میرا بھی یہی خیال ہے مگر مرنے کے بعد مسئلہ حل نہیں ہوتا اب جاؤ اور خاموشی سے مرنے والے کو CREMATE کروا دو منٹوں میں بجلی کی لپک ساری برائی اور جراثیم کو چاٹ کر ختم کر دے گی

(فرنانڈو جانے کے لئے گھومتا ہے اور روشنی مدھم پڑجاتی ہے)

اسٹیج پر گھپ اندھیرا ہے پس منظر میں ماتمی کی PATHOS میوزک کے ساتھ BLUE SPOT LIGHT میں جارج کا بستر نظر آتا ہے وہ مر چکا ہے اس کے چہرے تک سفید چادر پڑی ہوئی ہے فرنانڈو خاموشی سے بستر کے سامنے دو زانو ہے کچھ دیر بعد وہ آہستہ سے سر اٹھاتا ہے وہ جیسے کسی عالم میں ہے

فرنانڈو۔ (دھیمے لہجے میں) اچھا ہوا تم مر گئے جارج ورنہ اس وقت میں تم سے نظریں نہیں ملا سکتا ـــــ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کہ تمہاری آخری خواہش پوری نہ کر سکا (وقفہ) [illegible]

میں نے بہت کوشش کی بہت سمجھایا۔ منتیں کیں مگر کسی کو رحم نہ آیا کسی کا دل نہ پسیجا۔ جیسے سب پتھر کے ہوگئے۔ کوئی بھی تمہارے غم میں شامل نہیں صرف میں ہوں۔ اب اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا خوش بختی سب سہہ کر اور سارا کچھ دیکھ کر بھی زندہ ہوں۔ میں تمہارے غم کے ساتھ جیوں گا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں بزدل نہیں اور نہ میں اپنے خول میں بند ہو کر دم توڑ دوں گا۔ میں ساری آزمائشوں کے ساتھ زندہ رہوں گا۔ تمہاری کہانی نہیں تمہارا المیہ سنانے کو زندہ رہوں گا جارج (پھوٹ کر رونے لگتا ہے) وقفہ (لمبی سرد آہ بھرتے ہوئے) انسان ہونے کے ناطے۔ میں ایک بار صرف ایک بار۔ اس شہر کے لوگوں سے پوچھوں گا کہ کیا واقعی صرف جارج یا اس جیسے مقصور وار ہیں۔ کیا اس سانحے میں قدرت کی کوئی ذمہ داری نہیں!

(فرانڈو FREEZE ہوجاتا ہے ـــ رفتہ رفتہ روشنی مدھم ہورہی ہے پس منظر سے ایک نظم فضا میں تحلیل ہوتی سنائی دیتی ہے۔

اپنے اپنے جسموں میں ہم
اپنی اپنی موت چھپائے
لمحہ لمحہ
رفتہ رفتہ
قسطوں میں مرتے رہتے ہیں
کاش کسی مرنے والے کو
اتنی لمبی موت نہ آئے!! ❁

[پردہ]

◆ بقیہ صفحہ ۲۲ تکمل ◆

علم کے سامنے بے پردہ ہوگیا ہے۔

اے سیّد زادے مجھے بھی بے پردہ کر میری ملامت کر کہ میں امرتسر کی ایک مشہور گانے والی طوائف کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ لالہ ہمراج وہاں کا بڑا رئیس تھا۔ دلجان بائی میری رشتہ دار ہے اس کا گانا سنتا ہوں تو رونے لگتا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑو مجھے اٹھاؤ۔ اس کے ہاں چلو جس کے ہاتھ میں کئی دل اور کئی جانیں ہیں ❁

◆ بقیہ صفحہ ۲۴ پانچویں سمت ◆

وہاں سے ٹریننگ لے کر دفتر چلا جاؤں گا۔"

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ احمد نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ ڈورمین نے مارگریٹ کے آنے کی اطلاع دی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" شہلا نے تشویش ناک نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں بابا میں ٹھیک ہوں۔"

شہلا نے مارگریٹ کے لیے دروازہ کھولا احمد کی پیشانی چوما اور دروازے سے باہر چلی گئی۔

مارگریٹ نے کچن کی صفائی شروع کردی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی

"ہاں انہیں اوپر بھیج دو۔"

وہ اپنے کمرے میں کوٹ پہننے کے لیے گیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

مارگریٹ نے دروازہ کھول دیا۔

احمد دو دن ہوگئے گھر سے غائب تھا شہلا کی رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اس کی دو تین سہیلیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ پولیس مارگریٹ سے بیان لے رہی تھی۔

"میں نے دروازہ کھولا تو ایک خوبصورت لڑکی اور ایک بڑا ہینڈسم لڑکا کھڑا تھا۔ انہوں نے مسٹر احمد کے بارے میں پوچھا اتنے میں مسٹر احمد بھی آگئے۔

لڑکی ان سے "ڈیڈی" کہہ کر لپٹ گئی۔ میں کچن میں آگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ان کے قدموں کی باہر جاتے ہوئے اور دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اور کچھ بھی نہیں" ❁

آپ کی مدّت خریداری مارچ ۹۶ء کے اس شمارے کیساتھ ختم ہورہی ہے

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدّت خریداری مارچ ۹۶ء کے اس شمارے کیساتھ ختم ہورہی ہے۔ نئے سال اپریل ۹۶ء تا مارچ ۹۷ء کے لئے اپنا زرِ تعاون ارسال کرکے ممنون کیجئے۔

P O BOX NO. 11671
DOHA - QATAR
(ARABIAN GULF)

محجوب

خبر کیا تھی ایک دھماکہ تھا کہ حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے۔ نواب وقار الزماں کا غصہ عروج کی اس منزل پہ تھا کہ اگر خبر دینے والی ان کی اپنی بیگم کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو اسے شوٹ کر دیتے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ان کا اپنا بیٹا نواب وقار الزماں کا بیٹا حویلی کی ایک معمولی جاروب کش کی لڑکی سے شادی کی خواہش کرے۔ نواب صاحب نے صاف صاف کہدیا۔ "اگر دوبارہ اس کے لبوں پر اس قسم کی گھناؤنی خواہش نے کروٹیں لیں تو اسے عاق کر دوں گا کہد دیجئے گا اپنے لاڈلے سے، اور سنئے" انہوں نے خوفزدہ بیگم کو روک کر کہا۔ "آئندہ آپ بھی اس قسم کی لغو واہیات اور بیہودہ باتوں سے احتراز کریں کیوں کہ اس حویلی کے بام و در اپنی تمام تر سابقہ روایات کے ساتھ آج بھی مضبوط اور زندہ ہیں ... اس خاندان کی بیگمات کو، اپنا وقار، اپنی عزت، اپنے منصب کو نہیں بھولنا چاہئیے ہم سے کچھ کہنے سے قبل لفظوں کو اتنا تو تول لو، اتنا تراشو کہ جب وہ آپ کی زبان سے نکل کر اس ماحول میں مرتعش ہوں۔ تو اس میں وزن ہو۔ اور وہ بات آپ کی شایانِ شان ہو۔ ورنہ لونڈی اور بیگم کا فرق مٹ جائے گا۔ ہمارے در و دیوار اس قسم کے تغیرات کے عادی نہیں ہیں، تشریف لے جائیے۔"

حویلی کا ہر فرد اس حقیقت سے واقف تھا کہ نواب صاحب کے فیصلے اٹل ہوا کرتے ہیں۔ پتھر کی لکیر کا محاورہ بھی ان کے فیصلوں کے سامنے سبک ہے۔

ادھر نواب خلیق الزماں اپنی ضد پہ قائم کہ شادی کروں گا تو سلمیٰ سے۔ واقعی سلمیٰ کی جگمگ جگمگ کرتی جوانی ایسی ہی تھی کہ حالات کیسے بھی طوفان ہوں۔ ٹکرا جانے کو جی چاہے۔ ماں نے لاکھ سمجھایا... دودھ کا واسطہ دیا، خاندان کی عزت اور .... ریت رواج کی دیوار میں دراڑ پڑ جانے کے تہلکہ خیز نتائج سے آگاہ کیا۔ بھائی نے سمجھایا کہ ابا حضور معتوب قرار دیں گے۔ ان کے فیصلے سورج کے طلوع و غروب کی طرح اٹل ہوتے ہیں۔ مگر خلیق الزماں کے سر میں سلمیٰ کے حسن کا سودا جو سمایا تو تمام مراتب تمام عیش و عشرت کو نگاہِ حقارت سے ٹھکرا کر سلمیٰ سے نکاح کر لیا۔ حویلی کے جاہ و حشم پہ ضرب پڑنی تھی سو پڑ کے رہی۔

ہٹ دھرمی اور چٹان کی طرح اٹل فیصلے جو اس خاندان کا طرۂ امتیاز تھے، خلیق الزماں کو بھی وراثت میں ملے تھے نواب وقار الزماں اس خاندانی وراثت پہ کوئی قدغن نہ لگا سکے۔ یوں تو نواب صاحب کی جاہ و حشمت کو بٹا لگا۔ حویلی کی عظمت کچھ گھٹی ضرور۔ مگر وہ مطمئن کہ ان کی انا کی دیوار میں ہنوز ناقابل تسخیر ہیں۔

ادھر ناز و نعم، عیش و عشرت میں پلے خلیق الزماں سے حویلی کی آسائشیں چھوٹیں۔ نا مساعد حالات، آلام و مصائب کے ناگفتہ بہ مناظر کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ خوش کہ حویلی کی پابندیوں سے پرے اپنی خوشی سے اپنے طور پہ زندگی گزارنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ لہٰذا مشقت کی تجربہ گاہ میں آئے تو حویلی کی تمام قدروں کو دفن کر کے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لیا کسی طرح جوڑ گانٹھ کر روپے اکٹھا کیئے اور ایک معمولی سی دکان سے زندگی کی تگ و دو میں لگ گئے پھر کبھی پلٹ کر نہ دیکھا کہ حویلی کی دیواریں ان کے لئے مزید بلند ہوئیں کہ نہیں۔ ہاں باپ بیٹے کی یہ جنگ پورے دم خم کے ساتھ جاری رہی۔ وقت کو گذرنا ہے گذرتا رہا۔ تین سال کے عرصے میں سلمیٰ چاند جیسے دو بیٹوں کی ماں بھی بن گئی۔ زندگی ہنسی خوشی تو نہیں ہاں مطمئن گذر رہی تھی سلمیٰ نے اپنے شوہر کے اس ایثار کو ایمان سمجھ کر خدمت کو شعار

بنالیا اور خلیق الزماں سلمیٰ کی مسکراہٹوں کے سہارے ہر مشکل آسان کر لیتے۔ آدمی حالات سے سمجھوتہ کرے تو حالات کیسے بھی ہوں وقت کٹ ہی جاتا ہے اور چار نفوس پہ مشتمل یہ زندگیاں زمانہ برتے رہی تھیں۔ آغاز میں سلمیٰ احساسات کے پیچیدہ اور ہراساں لمحوں سے دوچار رہی کہ پہاڑ جیسی زندگی کی رہگذر پہ خلیق الزماں کے قدم اس کے ساتھ چل سکیں گے۔ مگر جب آنگن دو بیٹوں کی کلیلوں سے آراستہ ہو گیا تو خوف اور احتمال کے بادل خود بخود چھٹ گئے بچے بھی اتنے پیارے کہ جو دیکھتا کہے بغیر نہ رہتا کہ شہزادے ہیں۔ مصائب کی بھٹی میں تپ رہے ہیں۔ محلّے کی لڑکیاں گودوں لئے پھرا کرتیں۔

کبھی کبھی مسائل اتنے تواتر کے ساتھ ابھرتے ہیں کہ چٹان جیسا جگر رکھنے والے بھی حوصلہ ہار بیٹھیں۔ شام کا وقت خلیق الزماں سینہ پکڑے داخل ہوئے سلمیٰ نے سہارا دیا۔ پلنگ پر لیٹے سینے میں درد کی شکایت کی اس سے پہلے کہ کوئی طبّی امداد پہنچے سلمیٰ کی کلائی پکڑے بیٹوں کو گود میں سمیٹے یہ جادہ جامرت کی اس بھیانک آندھی میں سلمیٰ کے سہاگ کے ساتھ بیٹوں کا مستقبل بھی اجڑ گیا۔ روتے روتے جب آنکھوں کی نہریں خشک ہو گئیں تو خیال آیا کہ بچوں نے کچھ کھایا کہ نہیں۔ محلّے کی عورتوں نے اطمینان دلایا کہ بچوں نے کھانا کھا لیا ہے۔ چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہوتے بچوں کو قریب کیا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں... مسلسل جاگی ہوئی آنکھوں میں نیند کے جھکڑ جانے کب تک چلتے اگر بچوں کی بھوک بھوک سے سکوتِ سماعت نہ ٹوٹ جاتا، دل تڑپ گیا۔ سوچا وہ بچے جنہیں کھانا کھلانے کے لئے خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں۔ اس نے بچوں کو بھینچ لیا۔ دیکھا تپائی پہ کھانا رکھا ہوا ہے۔ اس نے بھی تو کئی وقت سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھوک تو بڑے بڑے تحمل مزاج لوگوں سے مزاج پوچھ لیتی ہے، وہ تو ایک عورت ہے جس کے دو بچے بھی ہیں شہزادوں جیسے۔ بچوں کو خوب پیار کیا۔ ایک بھوک مٹی تو سانس اور وجود کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے دوسری بھوک کا ازالہ کیا اور یوں زندگی میں پھر حرکت آگئی۔ کچھ دنوں محلّے والوں کی عنایتوں نے جینے دیا مگر ایک دن جب کھلے دروازے پہ کسی بھی پڑوسی کی چاپ نہ سنائی دی تو سلمیٰ نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے۔ کب تک کوئی کسی کو کھلا سکتا ہے۔ شام بھی ہونے والی ہے۔ بچے کھانے کا تقاضہ کریں گے۔ یا اللہ کیا کروں!

"حویلی" ایک کوندا سا لپکا، حویلی کا گوشہ گوشہ اس کی نگاہوں میں روشن ہو گیا۔ یقیناً اب تو یہی ایک راستہ ہے آخر وہاں بھی تو انسان ہی رہتے ہیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر تو غیروں کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں... خیر سے یہ بچے تو اس حویلی کے چشم و چراغ ہیں۔ مجھے جانا چاہیئے۔ مزید غور کرنے میں کیا حرج ہے بچوں کو صاف ستھرے کپڑے پہنائے، بالوں کو سنوارا، انگلی تھامی۔ حویلی کا رخ کیا۔ چوکیدار نے راستہ روکا۔ مگر بچوں کو دیکھ کر دل پسیج گیا۔ کہنے لگا "جائیں بی بی جی، آپ جائیں" میری نوکری چلی جائے، مگر ان پھول جیسے بچوں کا گنہگار نہیں بنوں گا سلمیٰ نے صحن میں قدم رکھا۔ کوئی نئی تو تھی نہیں حویلی کے حویلی کے تمام قاعدے قانون سے واقف تھی تمام اوقات ازبر تھے۔ ناشتے کا وقت کھانے کا وقت۔ قیلولے کا وقت۔ چائے کا وقت۔ کتب بینی کا وقت... نواب صاحب کو اس وقت کتب خانے میں ہونا چاہیئے۔ فضا کتنی ہموار ہے۔ ماحول کتنا سازگار ہے۔ جدھر سے گذر رہی ہوں لوگ مجھے رستہ دے رہے ہیں۔ سب کی آنکھوں میں بچوں کے لئے پیار ہے۔ بس کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ بڑھ کر بچوں کو اٹھا لے۔ جب بغیر کسی آواز کے کتب خانے میں داخل ہوئی تو اس کے پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے نواب صاحب مطالعے میں مصروف تھے۔

کون؟ بارعب دار گونجتی ہوئی آواز سے سلمیٰ کی رہی سہی ہمت ٹوٹ گئی۔ زبان گنگ ہو گئی۔

"میں پوچھتا ہوں کون ہے تو... جو بغیر اجازت... حویلی کے باہر کی لگتی ہو۔"

میں... میں... آپ کی... نہیں... نہیں سلمیٰ ہوں...

یہ بچے آپ کے پوتے ہیں۔

"حویلی کا قانون اتنا کمزور نہیں کہ خلیق الزماں کی موت سے ٹوٹ جائے، چلی جاؤ"۔

سرکار قانون نہ ٹوٹے۔ مگر بے کس، لاچار، مجبور کو سہارا تو دے سکتے ہیں۔ لونڈی کی طرح کسی کونے میں پڑی رہوں گی "لونڈیاں پہلے سے ہی کافی موجود ہیں۔

اچھا یہ بچے تو آپ کے ہیں ، آپ کا خون ہیں ، ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے ۔ ان کے تابناک مستقبل کے لئے ۔ میں دل پر پتھر رکھ کر کہیں بھی جی لوں گی ۔

[illegible] جس خون میں آمیزش ہو جائے ، ملاوٹ ہو جائے ... وہ حویلیوں کا خون نہیں ہوا کرتا ۔

میں اپنے بچوں کے لئے قانون کا سہارا لوں گی ۔ عدالت کے دروازے کھٹکھٹاؤں گی ۔ میں اپنے بچوں کے لئے ایک بار موت کے گریبان پہ بھی ہاتھ ڈال سکتی ہوں .... آپ ۔ آپ ... آپ یہ .... اب سلمیٰ رو دینا چاہتی تھی ۔

نواب صاحب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں ... چہرہ لال بھبوکا ہو گیا چند لمحے حویلی کے اس کتب خانہ میں موت کا سا سکوت چھایا رہا ۔ اور پھر نواب صاحب کی جاہ و حشمت سے لبریز ، تراش خراش سے مزین ، جلالی ماحول کی نذر ہوا ۔ ذلیل ، کمینی ، جاروب کش کی خود سر بد تمیز لڑکی ، تجھے تو غیر حویلیوں میں گفتگو کے آداب کیا آئیں گے ۔ نواب وقار الزماں سے قانون کی بات کرتی ہے ۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعت کی رو سے یہ بچے مجوب ہو چکے ہیں ۔ بیگم نواب وقار الزماں کی ایک چیخ بلند ہوئی ۔ نہیں ۔ نہیں ... ایسا نہ کیجئے ۔ تڑپ کے گریں اور بیہوش ہو گئیں کہ نواب صاحب کی زبان سے نکلا ہوا جملہ فیصلہ کن ہوتا ہے ۔

سلمیٰ کے ذہن میں مجوب کے جھکڑ چلے تو اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب وہ بچوں کے ساتھ حویلی کے باہر آ گئی ۔ ہوش اس وقت آیا جب سامنے کی مسجد سے " اللہ اکبر " کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ...
سلمیٰ نے آنچل پھیلایا ، آسمان کی جانب بلند کیا ۔ اے میرے پروردگار اے موت و حیات پہ قادر ! خلیق الزماں تیری امانت تھا ۔ تو نے اپنی امانت واپس لے لی ۔ بیوہ ہو گئی ، بچے مجوب ہو گئے ! میرے مالک بس اتنا بتا دے کہ باپ کے مرجانے میں ان معصوم فرشتوں کا کیا قصور ہے ؟ .... !

بین الاقوامی اردو رسائل و جرائد

M.E.SHAIKH,
EDITOR,
'RAWI'
RAWI HOUSE,UNIT 1.,
LEGRANS LANE,
BRADFORD BO7 INS

ATHAR RAZ,
EDITOR,
'SADA'
24-A,FARM AVENUE,
STREATHAM,
LONDON SW16 2UT.

ANWER SHAIKH,
EDITOR,
'LIBERTY'
POST BOX NO. 918,
CARDIFF
GREAT BRITAIN
CF 2 UYP.

KANEEZ FATIMA
EDITOR
'BAZM-E-URDU'
21,BAULKHAM HILL ROAD,
NSW-2153
AUSTRALIA

MOHD.MUMTAZ RASHID,
EDITOR,
'KHAYAL-O-FUN'
POST BOX NO.41.,
DRAWING SECTION
D O H A
STATE OF QATAR
(ARABIAN GULF)

HYDER QURESHI,
EDITOR,
'JADEED ADAB'
SUDRING-75,
65795-HATTERSHEIM
GERMANY

MRS.TANVEER ALI,
EDITOR,
'NIDA'
148)-CUBBLEGATE LANE
REYNOLDBURG
O H I O 43068
U.S.A

REHMAN SIDDIQUI
EDITOR,
'URDU LINK'
POST BOX NO.351447,
LOS ANGELES
CA 90035 U.S.A

JAMEEL AHSAN,
EDITOR,
'MANZIL'
HAGALUNDSG,42 7TR,
17150 SOLNA
SWEDEN

W.A.SHAHEEN,
EDITOR,
'URDU CANADA'
POST BOX NO.2276,
STATION D
OTTAWA ONTARIO,
CANADA K1P 5W4

JAMSHED MASROOR,
EDITOR,
'BAZGASHT'
LINDEBERGASEN 46A,
N-1068,
O S L O-10,
(NORWAY)

RAZA-UL-JABBAR,
EDITOR,
'DOOR DESH'
3311,KINGSTON ROAD,
SUITE NO. 901,
SARBOROUGH ONT.
M1M 1R1
C A N A D A

MR.RAHIM ANJAN,
EDITOR,
'MULAQAT'
180,CHESTERLE BLVD,
SCARBOROUGH
ONTARIO
M1W 2M9
CANADA

شاعر

شاعر

شاعر
ہم عصر اُردو اَدب نمبر

شاعر

۱۹۹۵-۹۶ء
[دوؔ جلدوں میں]

شاعر

اُردو شعروادب کا ایک خوب سیرت
عالمی گاؤں

شاعر

اس نوتعمیر تخلیقی عالمی گاؤں کی سجاوٹوں میں اپنی مصنوعات
کے اشتہارات بھی شامل کیجیے۔ قارئین و قلم کار حضرات
رعایتی شرح پر اشتہارات دیں۔ ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر
نرخ نامہ طلب کیجیے۔ بڑے اور معیاری اشتہارات کی
فراہمی میں آپ سے تعاون کی گذارش ہے۔

شاعر

شاعر

شاعر

شاعر

شاعر

ہم عصر اُردو ادب نمبر

دو جلدوں میں

اُردو شعر و ادب کا ایک خوب سیرت

عالمی گاؤں

کئی ہزار صفحات پر پھیلا ہوا یہ غیر روایتی تخلیقی کام اپنے وقت پر شائع نہیں ہو سکا۔ تاخیر، انتظار، صبر، سب کچھ اپنی حدوں سے گذر گیا۔ مثال بن گیا۔ پوری اُردو دنیا اس خاص نمبر کے لئے گویا ٹھہر سی گئی ہے۔ ہم محسوس کر رہے اور شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں مگر اب یہ مثالی انتظار ختم ہونے کو ہے ——— کیونکہ

ایک ہزار صفحات سے زائد

جلد اوّل

فکرِ امروز

اتحادِ زبان کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ ہر مذہب کے معتقدین اردو بولتے ہیں اور بعض اوقات یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ متکلم مسلمان ہے یا عیسائی یہودی ہے یا ہندو۔ ادھر مغربی تعلیم نے لباس کی مغائرت دور کر دی ہے۔ ادھر اتحادِ زبان نے، زبان کی تفریق مٹا دی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتحادِ لسانی ہی ایک دن بین الاقوامی اتحاد کی تمہید بننے والا ہے۔

اردو زبان عہدِ موجودہ کی ایک عالمگیر، علمی، تعلیمی تجارتی، سیاسی، ادبی اور تاریخی، مکمل زبان ہے اردو کے مستقبل کو زیادہ تابناک اور مستحکم بنانے کے لئے تین چار باتوں پر عمل کی ضرورت ہے۔

اردو کو تعلیمی اساس بنانے کی مسلسل کوشش کی جائے۔

جو علوم و فنون اردو میں ہنوز منتقل نہیں ہوئے ہیں انہیں اردو میں منتقل کر لیا جائے۔

یہ اندیشہ غلط ہے کہ اردو مٹائی جا سکتی ہے۔

[۱۲واں خطبہ : ۲۸ فروری ۱۹۳۴ء]

سیماب اکبرآبادی

جلد — ۶
شمارہ — ۴
فون: ۳۸۲۹۹۰۴

اپریل ۱۹۹۶ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۲۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

افتخار عارف کے نام

بیروت

۲۶، مئی ۱۹۸۱ء

عزیزی افتخار عارف

آپ نے عسکری مرحوم کی کتاب کے بارے میں رائے طلب کی ہے دینی اور فلسفیانہ مسائل کے بارے میں ہم جیسے کم علم لوگوں کو حرف زنی کا حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے ہمارا لکھنا تنقید نہیں محض تاثرات ہیں پہلا تاثر تو یہی ہے کہ اگر آپ کسی بھی مسئلے کے بارے میں پہلے ہی سے اپنے منتخب کردہ نظریے کو بغیر کسی وضاحت، ثبوت یا استدلال کے صدق قرار دے لیں اور اس کے بعد اس نظریے سے اختلاف یا انحراف کو گمراہی تصور کریں تو آپ سے بحث لاحاصل ہے کوئی دوسرا فریق اسی طرح کسی مخالف نظریے کو اسی تحکمانہ انداز میں حرف آخر قرار دے کر آپ کی ہر بات کا توڑ کر سکتا ہے۔ مزید برآں اگر آپ نے منطقی یا عقلی استدلال کو جزوی عقل قرار دے کر پہلے ہی سے غیر معتبر ٹھہرا لیا تو بات آگے کیسے چلے۔ چنانچہ اگر آپ تصوف، حدیث یا روحانیت (جس کی کوئی تعریف بھی آپ نے نہیں فرمائی) کو صداقت فرض کر لیتے ہیں اور پھر اس کی رو سے مغرب کی گمراہیاں گنوانا شروع کرتے ہیں تو اسی طور کوئی مادیت کے نظریے کا قائل ایسی ہی فہرست مشرقی گمراہیوں کی تیار کر سکتا ہے۔ ایمان یا عقیدہ تو لکم دینکم ولی دین کی ضمن میں آتا ہے اس کے بارے میں بحث کیسی؟ یہ تو ایک بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ نے ایک بنیادی مفروضے کو دلیل ٹھہرا لیا تو پھر آپ اسی کی بنا پر اور کئی مفروضات کو حقائق قرار دینے پر مصر ہوں گے۔ جدیدیت ایسے ہی مفروضات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً یورپ کا ذہن پچھلے چھ سو سال سے بتدریج مسخ ہوتا رہا ہے اور صداقت کو سمجھنے کی صلاحیت کھوتا رہا ہے اس کے خلاف علامہ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سو سال سے ہم مسلمانوں نے ذہن کے دروازے بند کر رکھے ہیں اور تفکر و تدبر کے احکامات الٰہی سے روگردانی کر چکے ہیں اس لیے ہم میں صداقت کو سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ پھر عسکری صاحب کو مغربیوں سے بنیادی شکایت یہ ہے کہ ان لوگوں نے بآسماں پرداختن کے بجائے کار جہاں نکو ساختن کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہے۔ جو بہت بڑی گمراہی ہے۔ لیکن یہ گمراہی تو شیخ سعدی سے لے کر (چی شود رو بامداد فرزندم "یاراں فراموش کردند عشق" وغیرہ) علامہ اقبال تک کئی مشرقی افکار میں بھی مل جائے گی پھر انسان دوستی، انفرادیت پرستی، اعمال و اخلاق کی اہمیت ان سب کو بھی آپ اہل مغرب کی بدعتیں قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں SECRETS OF EAST کے دیباچے پر ایک نظر ڈال لیجئے ہمارا کچھ کہنا سند نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک سو انیسویں گمراہی یہ ہے کہ بعیت اور تصوف کے سلسلوں کو دین سے خارج قرار دینا تو کیا ہم نے دہابیت بھی مغرب سے درآمد کی تھی روایت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ معتزلہ وغیرہ کو روایت سے منسلک نہیں کیا جا سکتا تو بعض بزرگوں کی نظر میں فقہ جعفریہ حتی کہ تصوف کے بعض مسالک بھی بدعتیں ہیں انہیں کیا کیجیے گا۔ اسی طرح موجودات اور ماسوا دونوں کو حقیقی سمجھنا یہ بھی گمراہی ہے لیکن قرآن حکیم میں بھی ایک جانب یہ فرمایا گیا ہے کہ "حیواۃ الدنیا الا لہو ولعب" تو دوسری جانب یہی ہے "فلنتا ہذا الدنیا باطلا" اگر یہ دنیا باطل نہیں تو حقیقی ہوگی۔

آخر میں مغربی فلسفہ اور سائنس کی بہت عمدہ تلخیص کے بعد (جو میری رائے میں اس کتاب کا قابل قدر حصہ ہے) ان سب کو گمراہی کی مختلف صورتیں قرار دیا گیا ہے۔ چلئے تسلیم۔ لیکن ہمارے مکرم دوست ڈاکٹر اجمل تو اس کتاب کو کورس میں شامل کر دینا چاہتے ہیں اس کورس میں ان مغربی خرافات، یہ تضیع اوقات کی کیا ضرورت ہے بہتر یہی ہے کہ اس کے بجائے حضرت بلھے شاہ کے ارشاد پر عمل کیا جائے۔ یعنی

علموں بس کریں او یار

اکو الف تینوں درکار

بچارے ہمارے علماء کو جنہیں معقولات میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پر بھی پورا عبور نہیں ہے آپ روسو اور کانٹ، فرائڈ اور سارتر کے چکر میں کیوں ڈالنا چاہتے ہیں۔ تفصیلی مطالعے کے بغیر محض آپ کے چند جملوں پہ تکیہ کر کے یہ حضرات کسی بحث پر کیسے پورا اتریں گے۔

شعر و ادب کے معاملات میں عسکری مرحوم کی بصیرت کا میں ہمیشہ سے معترف ہوں اگر وہ جدیدیت کی ادبی گمراہیوں پر متوجہ ہوتے تو غالباً بہتوں کا بھلا ہوگا۔ یہ تصنیف تو انہی حضرات کے کام آ سکتی ہے جو پہلے ہی سے علم مغربی سے فیضیاب ہیں اور پھر دینی مسائل کی تفسیر و تشریح پر تو بقول عسکری صاحب کے علماء کا اجارہ ہے کالانعام کے لیے یہی بہتر ہے کہ "بلھیا چپ کر کے ٹر جا" (آپ نے اتنی پنجابی تو سیکھ لی ہوگی) اگرچہ ہم عوام کے لیے پھر یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے بہتر میں سے کس فرقے کے علماء کو معتبر جانیں اور یہ بھی ہے کہ ابن عبدہ، طہٰ حسین، جمال الدین افغانی، علامہ اقبال وغیرہ بھی عسکری صاحب کے علما میں شمار کیے جائیں کہ نہیں۔

لیکن یہ سب جزوی عقل کی باتیں ہیں جو بجائے خود گمراہ کن ہے البتہ ان سب باتوں سے قطع نظر عسکری مرحوم کی تحریر ART FOR ARTS SAKE کے لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

افتخار عارف کے نام فیض احمد فیض کا یہ اہم خط۔ اشفاق حسین (کنیڈا) کی مرتبہ کتاب "مطالعہ فیض یورپ میں" [مطبوعہ ۱۹۹۲ء دہلی] سے لیا گیا ہے۔

سرورق ـــــ شعراز اقبال
خطاطی ـــــ غلام الہندی

اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان و ادب کے مسائل کے ساتھ معاشی تنگ و دو اور ثقافتی سرگرمیوں اور ذاتی دلچسپیوں کے بھی اپنے مسائل ہیں اور ایسے نازک مسائل ہیں کہ ان پر نیک نیتی سے کچھ لکھنا آسان نہیں اردو کی نئی بستیوں کے فرد ہوں یا ادارے، سب اپنے اپنے موقف اور اپنے اپنے طریق کار کے لیکن ان پر تنقید و تبصرے کی بھی گنجائشیں ہیں کیوں کہ اردو زبان کو عالمی سطح پر جو فروغ مل رہا ہے وہ خوش کن ہونے کے باوجود زیادہ مستحکم نہیں کہ جس نسل کے ہاتھوں میں ابھی یہ زبان اور اس کا رسم الخط ہے وہ کوئی بہت بنیادی تعمیری کام نہیں کر پا رہی ہے کہیں کہیں جگہ ہے ادبی رسائل کی اشاعت، کتابوں کی طباعت، سیمینار اور مشاعرے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن ان سرگرمیوں کا تجزیہ و جائزہ ازبس ضروری ہو گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان و ادب کے مسائل کیا ہیں اور ان مسائل کو حل کرنے کیلئے مجموعی لائحہ عمل کیا ہو۔ ہم ان مسائل پر ہم عصر اردو ادب نمبر میں گفتگو کریں گے۔

اردو کی نئی بستیوں کے باہر ہندوپاک میں بھی ان تارکینِ وطن کے لئے خاصہ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ برطانیہ میں اردو ایڈیشن۔ افکار (کراچی) ۱۹۸۱ء
۲۔ اسکینڈے نیویا میں اردو ادب انشاء (کلکتہ) ۱۹۹۵ء
۳۔ سعودی عرب نمبر شگوفہ (حیدرآباد) ۱۹۹۲ء
۴۔ سمندر پار کے اردو قلمکار جریدہ (پشاور) ۱۹۹۵ء
۵۔ خلیجی ریاستوں میں اردو تخلیق (لاہور) زیرِ طبع
۶۔ بیرونی ممالک میں اردو ـــ ڈاکٹر انعام الحق جاوید زیرِ طبع

ہندوپاک کے تمام ادبی رسائل میں اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کو اہتمام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں رسالہ شاعر نے نہایت ہی مثبت اور روشن کردار ادا کیا ہے لیکن مجموعی طور پر اردو کی نئی بستیوں اور ہندوپاک میں ان تارکینِ وطن کے تعلق سے ادبی رسائل کے مدیران اور ادبی حلقوں کا جس طرز پر بھی ہیں ان کے درمیان ہم رسالہ شاعر کیلئے اسکی پوری روایت کے احترام کے ساتھ اپنے صاف ستھرے اصولوں پر بہرحال کام کر رہے ہیں صرف اور صرف اردو زبان کی بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کیلئے ہمیں مسائل و مشکلات کا سامنا بھی ہے تعاون اور عدمِ تعاون یکساں طور پر ... یہ ہے کہ شاعر کو اردو کی تمام نئی بستیوں اور ان بستیوں کے تمام اردو والوں تک پہنچانے میں ہمیں اپنا کوئی ثانی نہیں ... ہم عصر اردو ادب نمبر اور اردو کی نئی بستیاں نمبر کیلئے مواد کی فراہمی میں ... تاکہ کوئی مثالی تاریخی دستاویزی کام انجام پا سکے یہ دونوں شمارے آپ کو کیسے لگے۔ [ادارہ]

جہانِ اردو

پاکستان کے نوجوان شاعر و ادیب فیضان عارف جنگ (لندن) کے ادبی ایڈیشن کے لئے برطانیہ میں مقیم اردو کے اہم اہلِ قلم حضرات سے انٹرویو کر رہے ہیں۔ اس انٹرویو میں دیگر سوالوں کے ساتھ ایک سوال اردو کے بارے میں بھی ہوتا ہے۔ ذیل میں بعض اہلِ قلم کے تاثرات سے برطانیہ میں اردو کی موجودہ صورتِ حال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ کچھ اور اقتباسات بھی دیئے جا رہے ہیں۔ [ادارہ]

اعجاز احمد اعجاز

س : برطانیہ میں اردو کے مستقبل کے حوالے سے آپ کیا سوچتے ہیں؟
ج : یہاں اردو کا مستقبل انتہائی تاریک ہے۔ اردو زبان یہاں صرف اس وقت تک زندہ ہے جب تک وہ لوگ زندہ ہیں جو پاکستان یا بھارت سے اردو زبان سیکھ کر آئے تھے۔ میرے اپنے بچے اردو سمجھ لیتے ہیں لیکن بولتے نہیں ہیں۔ میں ان سے پنجابی میں بات کرتا ہوں اور وہ مجھے اس کا جواب انگریزی میں دیتے ہیں۔

برطانیہ میں اردو زبان مزید پندرہ برس تک کے لئے ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی۔

س : پھر اردو زبان کی بقا کے لئے اردو کے محافظوں کو کیا کرنا چاہیئے؟
ج : اب کچھ نہیں ہو سکتا میں نے افریقہ سے امریکہ تک کے اردو حلقوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ جس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس طرح ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ اسی طرح ہر غالب تہذیب اور زبان چھوٹی اور مغلوب تہذیب اور زبانوں کو کھا جاتی ہے پھر اس کے علاوہ اگر کوئی شخص برطانیہ میں رہ کر اردو میں ایم، اے بھی کر لے گا۔ تو اسے ملازمت کون دے گا۔ دراصل برطانیہ میں اردو لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں اردو کی بقا کے لئے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔

[روزنامہ جنگ ، لندن ۲۷ ؍ اکتوبر ۱۹۹۵ء]

عبید صدیقی

س : کیا برطانیہ میں اردو زندہ رہے گی؟
ج : جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ برطانیہ میں اردو کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ تو یہ بات ریت میں سر دینے کے مترادف ہے۔ برطانیہ میں اردو صرف ان لوگوں کا ہی مسئلہ ہے جو پاکستان سے اردو سیکھ کر یہاں آئے تھے اور ان کی آنے والی نسلوں کا مسئلہ اور ضرورت نہیں ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی نسل اگر افسانہ یا شعر لکھے گی تو وہ اردو میں کیوں لکھے گی؟ کیوں کہ اسے انگریزی پر اتنا ہی عبور حاصل ہے جتنا کہ آپ کو مجھ کو اردو پر ہے۔

[روزنامہ جنگ ، لندن ، ۲۔ نومبر ۱۹۹۵ء]

بلبل کاشمیری

س : برطانیہ میں اردو زبان کا مستقبل کیا ہے۔؟
ج : برطانیہ میں اردو زبان زندہ رہے گی یہ زبان اس ملک سے مٹ نہیں سکتی۔ اب ہم جس دور سے گذر رہے ہیں۔ یہ برطانیہ میں اردو کے لئے ایک سنہرا دور ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ایک روسی مسلمان بھاگ کر بلتستان آیا تو میں وہاں پڑھایا کرتا تھا۔ وہ تین سال تک بلتستان میں رہا مگر بلتی زبان کا ایک لفظ نہیں سیکھ سکا مگر جب وہ سری نگر آیا تو چھ ماہ میں اردو زبان سیکھ گیا۔

[روزنامہ "جنگ" لندن ۲۱۔ دسمبر ۱۹۹۵ء]

صدیقہ شبنم

س : ہماری نئی نسل اردو پڑھنے لکھنے کی طرف کیوں مائل نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے ؟

ج : یہ مسئلہ صرف برطانیہ میں پروان چڑھنے والی ہماری نئی نسل کا نہیں ہے بلکہ مجھے انڈیا اور پاکستان سے اپنے جن عزیز رشتے دار نوجوان بچے بچیوں کے خط آتے ہیں۔ وہ بھی انگریزی میں ہی ہوتے ہیں۔ وہاں بھی چند گھرانوں کے بچے اچھی اردو لکھ، پڑھ اور بول سکتے ہیں۔ برطانیہ میں یہ مسئلہ واقعی گھمبیر ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے بچے زیادہ وقت چونکہ سکول میں گذارتے ہیں اور جب وہ گھر آتے ہیں تو انہیں ماں باپ سے ابلاغ (کمیونیکیشن) کا موقع یا وقت نہیں ملتا جس کے باعث وہ اردو زبان نہیں سیکھ پاتے۔ اس کے علاوہ ماں باپ شعوری طور پر بھی اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانے پر توجہ نہیں دیتے اور جو شاعر ادیب ہیں انہیں صرف اپنے مشاعروں سے غرض رہتی ہے وہ اس بات پر زیادہ دھیان دیتے ہیں کہ انہیں آئندہ مشاعرے میں کون سی غزل پڑھنی ہے۔ بیشتر لوگ اپنے بچوں کی مثبت تفریح اور ان کی دلچسپیوں کا خیال نہیں رکھتے جس کی وجہ سے پہلے ان کی اولاد، زبان سے دور ہو جاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ان سے بھی دور ہونے لگتی ہے۔ برطانیہ میں اب گنتی کے گھرانے ایسے رہ گئے ہیں جن کے بچے اردو بول اور لکھ پڑھ سکتے ہیں جو یقیناً ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ اگرچہ کونسلوں کی طرف سے اردو پڑھانے کا انتظام اب پہلے سے زیادہ بہتر طور پر موجود ہے مگر اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آ رہے بچوں کو اردو سکھانے کے لئے اردو کے محافظوں کو اجتماعی طور پر کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ جس کا پہلا مرحلہ میرے خیال سے گھر میں بچوں سے اردو بول چال کو فروغ دینا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب تک ہم اس ضمن میں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں کریں گے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

[روزنامہ "جنگ" لندن، ۲۸۔ دسمبر ۱۹۹۵ء]

فیروزہ جعفر

س : کیا آپ کے بچے بھی آپ کے اردو افسانے پڑھتے ہیں۔؟

ج : میرے بچے اردو نہیں پڑھ سکتے جس کا میں اعتراف کرتی ہوں۔ کیونکہ میں غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ میرے بچے اردو سمجھ لیتے ہیں۔ میں ان کو اپنی کہانیاں اور افسانے پڑھ کر سناتی ہوں میرے چھوٹے بیٹے سلمان جعفر کو اردو پڑھنے کا بہت شوق ہے اور وہ اٹک اٹک کر اردو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ المیہ ہمارے بیشتر اردو لکھنے والے اہل قلم کو درپیش ہے جو برطانیہ میں رہتے ہیں ان کے بچے ان کی تحریروں کو پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اس سلسلے میں اپنے اور بچوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جس کا مجھے احساس ہے

[روزنامہ "جنگ" لندن، ۷۔ دسمبر ۱۹۹۵ء]

سعید اختر درانی

س : برطانیہ میں اردو کی صورتِ حال کے بارے میں بتائیے

ج : یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے جب میں انجمن ترقی اردو برمنگھم کا صدر تھا تو ہم نے اس موضوع پر ایک مذاکرہ کیا تھا "برطانیہ میں اردو کا مستقبل" اس وقت (۱۹۷۷ء میں) ہم اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ برطانیہ میں اردو کا مستقبل کافی تاریک ہے۔ جب ان دنوں کی موجود نسل جو وطن سے اردو سیکھ کر آئی تھی اور اردو کے شعر و ادب سے واقف تھی اور اردو کے اخبارات پڑھنا پسند کرتی تھی، ختم ہو جائے گی۔ تو اس سے اگلی نسل کو اردو سے دلچسپی بہت کم رہ جائے گی۔ اس کے کوئی معاشی فوائد ان لوگوں کے لئے موجود نہ تھے۔ وہاں کے پاکستانی اور ہندوستانی بچے یہ کہتے تھے کہ ہم جو وقت اردو، ہندی، گجراتی، گرمکھی سیکھنے میں صرف کرتے ہیں وہی وقت فرانسیسی، جرمن یا ہسپانوی سیکھنے میں کیوں نہ لگائیں تاکہ ہمیں آئندہ کی نوکریوں اور روزگار کے مواقع زیادہ میسر ہوں۔ یہ تقریباً وہی صورتِ حال تھی جو شاید چار پانچ صدیاں پہلے ہندوستان میں مغلیہ دور میں مقامی باشندوں کو لاحق آئی ہوگی کہ اگر سرکار دربار میں نوکری کرنی ہے تو فارسی سیکھو لیکن میں آپ کو ایک گونہ خوشی کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب۔

اصل برطانیہ میں اردو کے حالات ماضی قریب میں کس قدر بہتر ہوگئے ہیں۔ برطانیہ کے لوگ اور حکومت کافی حد تک انصاف پسند اور معتدل ہیں۔ انہوں نے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی یہ بات مان لی کہ انہیں ان کی زبان میں بھی تعلیم دینی چاہئے۔ چنانچہ بہت سارے ملکوں میں اب او اور اے لیول تک اردو پڑھائی جا رہی ہے اور بعض اور مادری زبانیں بھی۔ حکومت کے بہت سے شعبوں میں، مثلاً سماجی بہبود، تعلیم اور طبی سہولیات کے پمفلٹ انگریزی کے علاوہ اردو، بنگالی، گرمکھی اور گجراتی زبانوں میں بھی بالالتزام شائع اور تقسیم کئے جاتے ہیں چنانچہ ہمیں چاہیئے کہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور مستقبل میں بھلائی کے لئے توقع بھی رکھیں۔ اس کے حصول کے لئے جدوجہد بھی جاری رکھیں۔ [انٹرویو سے اقتباس۔ گفتگو۔ شکیل احمد منگلوری]

[اخبار اردو۔ مارچ ۱۹۹۶ء]

سلیم الدین قریشی

س: برطانوی معاشرے میں اردو کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

ج: برطانیہ میں اردو کو انگریزی کے بعد دوسری بڑی زبان سمجھا جاتا ہے ریڈیو اور ٹی وی کے مخصوص چینلز سے اردو کی باقاعدہ نشریات میں خبریں ڈرامے۔ موسیقی اور دیگر پروگرام پیش کئے جاتے ہیں اور اب برطانیہ کے اندر اردو میں "اے لیول" کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا ہے۔ اس سے پہلے اردو والوں کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں ہر شہر اور محلے کی پبلک لائبریریوں میں ایشیائی زبانوں کی کتابیں اپنے قارئین کو مہیا کرنے کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اس طرح خاص کر کے ایسے شہر جن میں اپنے لوگوں کی اکثریت ہے وہاں کی لائبریریوں میں اردو کی کتابیں کافی تعداد میں موجود ہیں اور لائبریری والے ہندوستان اور پاکستان سے تازہ ترین علمی اور تحقیقی کتابیں منگواتے رہتے ہیں۔ لندن سے اردو کے دو بڑے روزنامے "جنگ"، اور "آواز"، باقاعدگی سے نکل رہے ہیں اس کے علاوہ کئی ہفت روزہ اور ماہوار اردو کے رسائل بھی نکلتے ہیں۔

ان علاقوں میں جہاں ایشیائی زیادہ آباد ہیں وہاں کونسل کے اسکولوں میں اب باقاعدہ اردو کی کلاس ہوتی ہے اور ان کے لئے اردو کے اساتذہ بھی علیحدہ رکھے گئے ہیں۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کا ایک کالج ہے جہاں پر ڈگری، ایم۔ اے اور ایچ ڈی تک اردو پڑھائی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط سے جاری ہے اب بہت سے تکنیکی کالجوں کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے یہاں بھی کئی یونیورسٹیوں کے اندر اردو تدریس شروع ہو چکی ہے۔

[ممتاز احمد سے گفتگو کا ایک اقتباس
جریدہ۔ (پشاور) پاکستان۔ جنوری ۹۵ء]

منیر الدین احمد

س: جرمن معاشرے میں اردو کی تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟

ج: جرمن میں پاکستانی اور ہندوستانی لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے جو اردو بولنے والے ہیں۔ وہاں دیگر مشکلات کے علاوہ بنیادی مشکل یہ ہے کہ انہیں اردو کا مواد پڑھنے کو نہیں ملتا۔ جہاں تک جرمن جامعات میں اردو پڑھنے پڑھانے کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض میں ایسا انتظام، اگرچہ بالکل ابتدائی قسم کا موجود ہے آسان الفاظ میں یہ کہ جرمن لوگوں کو ابتدائی اردو پڑھنے پڑھانے کا انتظام موجود ہے۔ مگر اس کا معیار ادبی لحاظ سے ہے نہیں۔ میونخ، برن اور ہوم بولٹ HOMBOLDT کے ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں اردو کی ایک باقاعدہ چیئر موجود ہے جہاں آج کل ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ پڑھاتی ہیں۔ انہوں نے قرۃ العین حیدر پر ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے بدقسمتی سے ان سے قبل متعین اصحاب اردو کے لئے لوگوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں پیدا کر سکے تھے۔ ڈاکٹر کرسٹینا نے اردو ادیبوں کے ساتھ ادبی تعلقات قائم کر رکھے ہیں جہاں تک میرے انسٹی ٹیوٹ کا تعلق ہے تو یہ بنیادی طور پر اردو ادب کی ترویج کے لئے نہیں ہے۔ اس میں مشرق وسطیٰ کے سیاسی اور معاشی، معاشرتی مسائل وغیرہ پر تحقیق کی جاتی ہے جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔ میں یہاں پاکستان، ایران، اور افغانستان پر کام کرتا ہوں۔ میں ذاتی دلچسپی کی وجہ سے بیندت

[باقی صفحہ ۹ پہ دیکھئے]

697 - STREET - 97,
G - 9 / 4, ISLAMABAD
PAKISTAN

اردو کہاں کہاں

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام اسلام آباد میں اہل قلم کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں اردو کے کئی نامور اہم اسکالرز بھی شریک ہوئے تھے ان میں سے چند ایک کا تعارف اور ان کے ساتھ ان کے ملک میں اردو کی تعلیم اور اردو کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے جو گفتگو کی تھی اس کا خلاصہ اخبار اردو (اسلام آباد) کے شکریہ کے ساتھ قارئین شاعر کے مطالعہ کے لئے پیش ہے۔ [ادارہ]

یان مارک [جمہوریہ چیک]

یان مارک اردو اور فارسی کے معروف اسکالر ہیں۔ پراگ یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں کے شعبے میں اردو اور فارسی پڑھاتے ہیں۔ ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ لکھنے کے علاوہ علامہ اقبال کے کلام کے انتخاب اور اردو کی کئی کتابوں کا سلووک زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

انہوں نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ وسطی یورپ اور پاکستانی اور ہندوستانی زبانیں "ہند آریائی زبانوں" کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا اردو ہمارے لئے اتنی مشکل نہیں جتنی یہ انگریزوں یا فرانسیسیوں کے لئے ہے۔ تلفظ میں بھی ہمیں زیادہ دقت پیش نہیں آتی اور مشترک الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ سابق چیکوسلوواکیہ اور موجودہ جمہوریہ چیک میں اردو کی تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ پراگ میں چلنے والے "ایوننگ اسکول" یعنی مکتب شب میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے اور پھر ہمارے ہاں پراگ یونیورسٹی میں پانچ سال کا ایم اے کا اردو کا کورس بھی کرایا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں طلبہ کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں پھر بھی جو طلبہ اردو پڑھ رہے ہیں وہ بہت محنت سے اس زبان میں کام کر رہے ہیں۔

DR. JAN MAREK, CSC.
INSTITUTE OF INDOLOGY,
CHARLES UNIVERSITY.
CELETNA 20
116 42 PRAGUE-1,
CZECH REPUBLIC

ہیروشی کان کاگایا [جاپان]

ہیروشی کان کاگایا نے اردو اور مذہبی تاریخ میں ایم اے کیا ہوا ہے اور ۱۹۶۱ء سے اوساکا یونیورسٹی میں اردو اور اسلامیات پڑھا رہے ہیں۔ تصوف ان کا خاص موضوع ہے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ، سرسید، حالی اور علامہ اقبال پر خصوصی مقالات بھی لکھے اور بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ جاپان میں اردو کی باقاعدہ تدریس ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی یعنی جاپان میں اردو کی عمر ۷۵ برس ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹوکیو اور اوساکا کے علاوہ بھی تین اداروں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ جب کہ ریڈیو جاپان سے ہر روز اردو کا ایک پروگرام بھی نشر ہوتا ہے۔ ایک نجی تجارتی کمپنی کے ریڈیو سے بھی اردو کے پروگرام دن میں دو بار نشر ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے طالب علموں کے لئے چالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ایک اردو جاپانی لغت بھی تیار کی ہے۔ جس کا سارا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس لغت کی تیاری میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے میرا کافی ہاتھ بٹایا ہے۔ جب کہ اس کی تیاری میں میرے تیس برس صرف ہوئے۔

انہوں نے کہا کہ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کو میں ایک آسان زبان خیال کرتا ہوں۔

PROF. KAN KAGAYA,
DEPARTMENT OF INDO-PAKISTAN,
OSAKA UNIVERSITY OF FOREIGN STUDIES,
(OSAKA GAIDAI)
JAPAN.

لدمیلا واسی لیوا

محترمہ لدمیلا واسی لیوا روس میں اردو کی نامور اسکالر ہیں۔ انہوں نے اکیڈمی آف سائنسز یو ایس ایس آر سے ۱۹۸۷ء میں اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی۔ اردو اور روسی میں تقریباً ۲۰ کتابوں کی مصنفہ ہیں ماسکو یونیورسٹی میں پڑھاتی رہی ہیں۔ ماسکو ریڈیو سے منسلک رہی ہیں۔ اور اس وقت ماسکو میں ادارۂ شرقی علوم میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔

لدمیلا واسی لیوا نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ روس میں اردو کے حوالے سے کافی کام ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ پاکستان کی بہت سی کتابوں کے روسی میں تراجم بھی ہو چکے ہیں اور ریڈیو ماسکو سے بھی اردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ اردو ایک میٹھی زبان ہے اور اس میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ بآسانی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ پہلے سے ایک روسی اردو لغت موجود تو ہے لیکن اب ضرورت ہے کہ اس کام کو بڑے پیمانے پر کیا جائے تاکہ اردو سیکھنے اور سکھانے والوں کو سہولت میسر آ سکے۔

DR. LUDMILA A. VSILYEVA
KERCHENSKAYS STREET,
HOUSE 21, FLAT 59,
MOSCOW 113461.
RUSSIA.

انیتا سیکلوکا [پولینڈ]

محترمہ انیتا سیکلوکا انڈولوجسٹ ہیں۔ وارسا یونیورسٹی میں ہندی اور پنجابی زبانیں پڑھاتی ہیں۔ اور اردو بہت روانی سے بول لیتی ہیں۔ انہوں نے جدید پنجابی ادب کا پولش زبان میں اور جدید پولش ادب کا پنجابی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وارسا یونیورسٹی میں ۴۰ سال پہلے ہندی اور اردو کا شعبہ کھلا۔ اور اردو اور ہندی اکٹھی پڑھائی جاتی رہیں۔ لیکن اب وہاں صرف ہندی پڑھائی جاتی ہے جو کہ دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت وہاں ہر سمسٹر میں تقریباً ۱۲ سے ۱۵ طلبہ ہیں جب کہ ایم اے کا کورس پانچ سال کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پچھلے دو سال سے یہاں پنجابی کی تعلیم بھی شروع کر دی گئی ہے جو کہ میں پڑھاتی ہوں۔

انہوں نے کہا کہ منٹو کے کچھ افسانوں کا پولش زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے جب کہ اس سلسلے میں مزید کام جاری ہے۔

ANNA SIEKLUCKA,
DEPARTMENT OF INDIAN STUDIES,
ORIENTAL INSTITUTE,
UNIVERSITY OF WARSAW,
KRAKOWSKIE PRZEDMIESCIE 26/28,
00-927 WARSAW, POLAND.

آلئین دیزولیئر [فرانس]

آلئین دیزولیئر نے انڈین اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی اور ۱۹۸۳ء سے فرانس میں مشرقی زبانوں کے قومی ادارے میں اردو پڑھا رہے ہیں۔ فروغ کلچرل سنٹر اسلام آباد کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب اور برصغیر کے مسلمانوں سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ فرانس میں اردو کے مطالعے کا آغاز گارسین دتاسی نے ۱۸۲۸ء میں کیا تھا۔ آج اسی ادارہ میں میں اردو کی تعلیم دے رہا ہوں۔ گویا دتاسی جیسے عالم فاضل کا جانشین ہوں۔ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ لیکن خود کو اس کا اہل ثابت کرنا ہی سب سے مشکل کام ہے۔ ۱۹۷۲ء میں جب مجھے پاکستان جانے کا سرکاری حکم ملا تو یہ وہ زمانہ تھا جب خود اردو کا مستقبل بھی یقینی نہیں تھا مگر آج میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو پوری دنیا کی ایک اہم زبان ہے اس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مقامیت نہیں یعنی یہ کسی خاص علاقے یا افراد کی زبان نہیں۔ بلکہ یہ بولنے والوں کی نہیں استعمال کرنے والوں کی زبان ہے۔ اسے اسی زاویے سے جانچنا چاہئے

MR. ALAIN DESOULIERE,
PROFESSOR URDU DEPT.
3-RUE CORNEILLE,
41000 BLOIS,
FRANCE.

نتالیہ پری گیرانہ [ماسکو]

محترمہ نتالیہ پری گیرانہ نے ادارۂ شرقی علوم ماسکو سے ڈی لٹ کیا اور آج کل اسی شعبے کی سربراہ ہیں۔ بہت سی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ جن میں غالب اور علامہ اقبال کے بارے میں کتب بھی شامل ہیں۔

انہوں نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اردو کو جانے بغیر علامہ اقبال اور غالب کا مطالعہ ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ روس میں علامہ اقبال کے کلام کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ محترمہ نتالیہ نے فارسی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ فارسی زبان اور روسی زبان پر مکمل عبور رکھتی ہیں۔ تاہم اردو زبان پورے طور پر سمجھتی ہیں اور اردو کے ادیبوں اور شعراء کا براہ راست مطالعہ بھی کر سکتی ہیں تاہم روانی سے بول نہیں سکتیں انہوں نے متقدرہ میں جاری ای سی او ممالک کی مشترک فرہنگ کے منصوبے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور اس سلسلے میں متعلقہ مواد ارسال کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اقبال پر انہوں نے جو کتابیں لکھیں ان کے مطالعے سے، اسلام کے بارے میں مغرب میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کا بڑی حد تک ازالہ ہو جائے گا۔

PRIGIRANA, NATALIA,
INSTITUTE OF ORIENTAL STUDIES,
THE RUSSIAN ACADEMY OF SCIENCES,
ROZHDESTVENKA,
12, MOSCOW 103031,
RUSSIA

عبداللہ احمد [ماریشس]

عبداللہ احمد ماریشس میں مقیم ہیں۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے بانی صدر ہیں۔ اردو اور اسلام کے فروغ کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ حال ہی میں اردو میں ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس بھی کرا چکے ہیں

ہمارے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ اردو ایک بہت ہی آسان اور میٹھی زبان ہے۔ ماریشس میں اگرچہ کریول زبان بولی جاتی ہے مگر فرانسیسی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کا چلن بھی عام ہے۔ اردو مدرسوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے اور اب کئی جگہ پر نصاب میں بھی شامل ہے

انہوں نے کہا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے مگر ماریشس کے لوگ بھی اس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔

A. ABDULLA AHMED,
PRESIDENT,
NATIONAL URDU INSTITUTE,
ABDULLASON CO. LTD.
P O BOX 500,
PORT LOUIS,
MAURITIUS.

بقیہ صفحہ ۶ جہانِ اردو

انجام دے رہا ہوں تاریخ برصغیر پر ہم لسانی مذہبی اور سیاسی لحاظ سے تحقیق کرتے ہیں۔ میں وہاں پاک و ہند کی تاریخ پڑھاتا ہوں۔ اس میں مذہبی تاریخ، لسانی تاریخ اور ثقافتی تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ میں نے پچھلے سمسٹر میں صرف ایک موضوع پر لیکچر دیئے ہیں۔ میرا موضوع تھا، موجودہ صدی میں خود نوشت اور سوانح دراصل ہم چاہتے ہیں کہ اسی کے تحت یہاں کے ادیبوں کا نفسیاتی تجزیہ کر سکیں ادب سے لگاؤ تو ذاتی ہے وہاں پر جرمنی زبان میں لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ میں نے جرمنی وہیں سے سیکھی۔ آدمی وہاں تین ماہ میں جرمنی سمجھنے لگتا ہے اور تین ماہ میں مافی الضمیر ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ادبی سرگرمیاں ہیں ضرور لیکن جس قدر ہونی چاہئیں۔ اتنی نہیں۔ لاکھ دو لاکھ اردو بولنے سمجھنے والوں میں نسبتاً بہت کم کام ہو رہا ہے اردو کا کوئی اخبار ہے نہ جریدہ حالانکہ رسالے یا اخبار کے لئے حکومت سے ڈیکلریشن لینے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ریڈیو پر اردو پروگرام تو ہوتا ہے لیکن اس کا بھی فائدہ وہاں والوں کو نہیں ہے۔ ہاں ... البتہ اب کچھ مشاعرے اور مجالس ہونا شروع ہوئی ہیں چند ایک شاعر اور ادیب بھی موجود ہیں اس کے باوجود کوئی باقاعدہ ادبی تنظیم قائم نہیں ہے اس کے برعکس دوسرے ممالک کے لوگوں نے ایسی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔

اردو کی ترویج و ترقی کے لئے ہم لوگ کافی عرصے سے کوشش کر رہے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں اردو شعبہ جات قائم کئے جائیں آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اب پبلک لائبریریوں میں اردو سیکشن قائم کرنے کی منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔ اب ہومبولٹ اور اردگرد کے لوگوں کے لئے یہ مرکز قائم ہو جائے گا۔ لوگ وہاں اردو کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں لیکن انہیں علم نہیں ہے کہ کتابیں پاکستان سے کس طرح منگوائیں۔ ہمیں بہت بدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

[محمد اسلام نشتر سے گفتگو کا ایک اقتباس
جریدہ (پشاور) جنوری ۱۹۹۵ء]

آفتاب اقبال شمیم

گمان کا رومان

نہیں! تم اپنے آنسو کو چھپا رکھو
اسی سے چھن کے سارے فاصلے،
سب روشنی، پوری ہوا شفاف ہوتی ہے
تناظر ہے ابد آباد کا جس میں
اجالے کے مصور نے صلیب و دار و نہرِ خشک کا منظر بنایا ہے
زپاتا، چی گویرا اور ماؤ
ہار کر ہارے نہیں ہیں،
یہ لوِن چکی پہ دھاوا بولنے والے
سدا آتے رہیں گے
کیا کیا جائے یہ مشکیزہ پرانا جب سیا جائے
تو بخیوں سے ٹپکتا ہے
خرابی کارِ سوزن کی ہے
یا پھر چرخ پہ کاتی ہوئی کرنوں کے دھاگے کی!
کہا جاتا ہے نابینا مغنی کو بشارت ہے
گلا کی روشنی مل جائے گی لیکن
زدِ مضراب سے اس کو
ہزاروں تار سارنگی کے پہلے توڑنے ہوں گے

APT NO 63441
P O CODE 100873
FRIENDSHIP HOTEL
BEIJING, CHINA

ستیہ پال آنند

تیسرا زخم

سنبھل جاؤ، ٹھہرو
رکو، عفو و رحمت کو سمجھو
کہ بخشش کا در تو ہمیشہ کھلا ہے
مرے دونوں شانوں پہ بیٹھے ہوئے دو فرشتے
مجھے میرے خالق کی
رحمت کے بارے میں سمجھا رہے ہیں
مگر میرا پندار جو کل تلک خود پرستی تھا
اب خود پرستی نہیں ہے
انابت ہے
خود سے بغاوت ہے
اب آسماں کی طرف مٹھیاں بھینچ کر
دیکھنے کی سبھی جرأتیں مر چکی ہیں
بہت لڑ چکا ہوں
خدا سے فرشتوں سے
تقدیر کے کاتبوں سے
مری منطقی بازخواہی کے سارے علم سرنگوں ہیں
مری خود نگاہی کے لشکر زمیں پر پڑے ہیں
کہیں العطش کی صدا تک نہیں ہے!

میں نظریں اٹھاتا ہوں
اشکوں سے لبریز ساغر اسے پیش کرتا ہوں
جو میرا خالق ہے
کہتا ہوں کلپا مپا، میں غلط راہ پر تھا
میں بخشش نہیں چاہتا، ہر مالک، سزا چاہتا ہوں
یہ سینہ کھلا ہے مرا
تیسرا زخم کھانے کو بیتاب ہے
میرے مولا
سزا میرا حق ہے
مجھے تیسرا زخم بھی اب عطا ہو!

"کلپا مپا" لاطینی میں دعا کی شروعات عموماً اس اقبالِ جرم سے ہوتی ہے۔ "میری غلطی ہے" یا "میں قصوروار ہوں"۔

606, ADAMS STREET
HERNDON VA 22070, U S A.

حنیف اخگر

مجھکو تلاشِ نقشِ کفِ پائے یار ہے
میری جبینِ شوق بہت بے قرار ہے

بے اعتبار زندگی مستعار ہے
عالم تمام غمکدۂ اعتبار ہے

درپیش بے کسی ہی نہیں بے بسی بھی ہے
اپنا ہے وہ نہ دل پہ کوئی اختیار ہے

عہدِ وفا اک عہد ہے لیکن یہ سوچیے
ترکِ وفا بھی جذبۂ بے اختیار ہے

پامال بعدِ مرگ بھی بالواسطہ ہوں میں
زیرِ قدم اب آپ کے میرا مزار ہے

بامِ عروج پر ہے باعزازِ عاجزی
اخگر جسے خمارِ مئے انکسار ہے

85-22 139TH STREET JAMAICA
NEW YORK NY 11432

دلنواز صدیقی

اک چھپی آستیں کا دستِ دعا جھٹک دیا
یہ تو خدا کا ہاتھ تھا، یہ تو نے کیا جھٹک دیا

تو بھی زمیں پہ آکے کر مٹی سے روح تک سفر
میں نے تو سر جھکا دیا، بارِ انا جھٹک دیا

آتشِ انتقام سے اپنے وجود کو بچا
میرا تو ذہن صاف ہے، دل میں جو تھا جھٹک دیا

عیش و طرب کے واسطے بیچ دی چادرِ حیا
علم و خرد کے زعم میں خوفِ خدا جھٹک دیا

اندھی گلی کے موڑ پر آئی تھی روشنی نظر
چونکہ مرا خیال ہی خواب سا تھا جھٹک دیا

510 - RIDGE WOOD ROAD
SHIPPINVILLE PA 16254
U S A

ساحر شیوی

پھیلتا نہیں ہوں، گل سا بکھرتا نہیں ہوں میں
یہ کس کی بد دعا ہے کہ مرتا نہیں ہوں میں

جب بیٹھ تو نہ جاؤں گا منزل کی راہ میں
ماحول کی خلیج سے ڈرتا نہیں ہوں میں

گہرائی کا پتہ تو لگے جو ہے عشق میں
بے جانے بوجھے اس میں اترتا نہیں ہوں میں

دے کر خوشی خریدتا ہوں، ان کے رنج و غم
کیا دوستوں کے واسطے کرتا نہیں ہوں میں

منزل جو ہے نظر میں تو پھر رکنا کس لئے
اک بار چل پڑا تو ٹھہرتا نہیں ہوں میں

ساحر جو اپنے آپ کو کہتا پھرے خدا
دم ایسے شخص کا کبھی بھرتا نہیں ہوں میں

47- SUTTON GARDEN SUNDON PARKS
LUTON BEDS LU3 3AP
ENGLAND - U K

قمر نقوی

بے خانماں

وہ اک شجر جو گر گیا
نہ اس کے برگ زرد تھے
نہ کوئی شاخ خشک تھی
نہ کوئی عارضہ ہوا
بس اک ہوا چلی تھی اور
بس اک حادثہ ہوا
کہ جس کے کرب و درد سے
فضا تمام رات چیختی رہی
ہوا کا بین بھی رہا
نجانے اس کے بعد کیوں
وہی درخت گر گیا
اکھڑ گیا
زمیں بوس ہو گیا
ہوا کا بین رک گیا
فضا کی چیخ تھم گئی
مگر کئی پرند تھے
کہ جنکا ربط و ضبط اس شجر سے تھا
اسی پہ آشیاں بھی تھے
پروں سے وہ سروں کو پیٹتے ہوئے
درخت کا طواف کرتے رہ گئے

6207 S - INDIANA POIS
TULSA OK 74136, U S A

نور ترکار

ایک نظم

شہر دعا کے ذکر میں
اگر ہو سکے تو میری بات
تو بھی سن

کہ جو ہوا ہے سوچا ہی نہیں
جو ہونا ہے اب کسی کے بس میں نہیں
میرے دل کی آیتوں کی گواہیاں
صرف محبتیں سنیں
کسی زباں میں ہوں
میرے خوابوں کے سلسلے تجھی سے جا ملیں...!
میری بات تو بھی سن
کبھی تو دل کو لبیک کہنے دے
کوئی صدا تو سننے دے
کہ تمہارے ہونٹوں کا بے معنی تبسم
بند لبوں کی خاموش غزل ہے
میری نظموں کے بولتے مصرعے
تیری خمدار ابرو کا اثر ہے
تیری زلف کے پیچ و خم سے
میرے ذہن کی وسعتوں تک
تیرے جسم کی مینا بازار سے
تجھے چھونے کی لذتوں تک
گزرے دنوں کی کچھ حکایتیں
اسلاکی غلطیوں کی طرح عام ہیں
نہ کہیں کوئی صبح نہ کوئی شام ہے
شہر وفا کے ذکر میں صرف میرا نام ہے...!!!

P O BOX 528
SAFAT 13006
KUWAIT [illegible]

یوسف اعظمی

میوزیم میں لاش

بارود کی دھول سے
نیم مردہ بدن کو اٹھا کر
اقوام عالم کی آنکھوں کی خاطر
اونچی عمارت میں نیویارک کے رکھ دیا ہے
ہم نے دے کر لہو اس کو پالا ہے برسوں
مگر اب
جسم اور ذہن کی نکہتیں اڑ گئی ہیں
حرارت نہیں ہے لہو کی

شاہراہوں پہ جو بت کھڑا ہے
اس کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں ہیں
تھرتھراتی ہوئی روشنی ہے
اس کے دامن میں زیتون کی شاخ مرجھا رہی ہے
فاختائیں ہیں بارود کی دھول میں
سروں پر ہے چیلوں کا پھیلا ہوا آسماں

6337 N WASHTENAW
CHICAGO IL 60659
U S A

شاہدہ نسیم سالک

مسافر

اِک مُسافر ملا
کچھ پریشان سا
یوں لگا چھوڑ کر قافلہ آ گیا
حسن کی وادیوں پر نشہ چھا گیا
شادماں شادماں
رنگ و نکہت کی دنیا کا باسی تھا وہ
قصۂ درد اس نے سُنایا کبھی
رو پڑا ہنس پڑا، مُسکرایا کبھی
اس کی آنکھوں میں تھیں داستانیں کئی
بس رہی تھی وہاں آرزوئیں کئی
جیسے شاہوں کی دنیا سے آیا ہو، وہ
شیش محلوں کی دنیا میں رہتا ہو، وہ
گفتگو جیسے دریا ہو الفاظ کا
خامشی جیسے سایہ ہو مہتاب کا
اور ہنسی جیسے موسم ہو برسات کا
شادماں، مہرباں
دیکھنے میں تو بالکل بھی سا تھا وہ
عام لوگوں سے لیکن جُدا سا تھا وہ
زندگی کے سفر میں اکیلا تھا وہ!!

8904 SAXTON DRIVE
WESTCHESTER OHIO 45069
U S A.

کاوش عبّاسی

غم کی کوئی شکل بنائیں ان سے غم کا کلام کریں
ذہن میں اُن کو لائیں شمع جلائیں شعر کا کام کریں

دُوری بس افلاک کہیں گم، قُرب کا چاند دمکتا ہوا
آج کی رات بھی خواب جنوں کے قریب تر میں قیام کریں

جن تک یوں تو ہماری بات نہ دل کی کسک کی رسائی ہے
ہوا کے گھر میں اُن کو بٹھائیں روتے لفظ بپا کریں

پانے پر جو خوش نہیں ہوتا، محرومی پہ تڑپتا ہے
اُس ازلی سودائی دِل کے ساتھ سفر دو گام کریں

جھنک رہا ہے عالم اُن کے عکسِ جمال کے رنگوں سے
نظر نظر گل پاشی کریں ہم، جلوہ جلوہ سلام کریں

کاوشؔ شوقِ دید میں اُن کے دیوانے ہوئے دیدہ و دل
ہر اک گام انھیں آتا دیکھیں ہر اک گام سلام کریں

CIVIL ENGINEER (DESIGN)
P O BOX NO 8080
RIYADH - 11482 K S A

یعقوب تصوّر

سکون و امن و اماں کے سامان بے اثر ہیں
فصیلِ جاں میں ہزاروں روزن ہزاروں در ہیں

اس ایک امید پر چراغاں کیا گیا تھا
کہ پیش گوئی ہوا میں ٹھہرے ہوئے بھنور ہیں

کچھ اس لئے بھی ہے جاگزیں خوف زلزلوں کا
زمیں سے اوپر نہیں، زمیں پر ہمارے گھر ہیں

ہر ایک وحشی نگاہ سے دوسرے کو دیکھے
نہ جانے بیٹھے ہوئے دلوں میں یہ کیسے ڈر ہیں

سکوں کا احساس تو اجاگر رہے مسلسل
کشادہ آبادیوں سے بہتر تو اب کھنڈر ہیں

نہیں ہے پابندیٔ نوردی مگر تصوّر
بندھے ہوئے یاں کس کے پاؤں کسی کے پر ہیں

P O BOX 4628
ABU DHABI U A E

حیدر قریشی

آگ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی
کس قدر مہنگی اسے شعلہ بیانی پڑ گئی

صبر کو میرے جو میری بے بسی سمجھے رہا
دیکھا کیسے اس پہ میری بے زبانی پڑ گئی

ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے
پھر مرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی

تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی

اعتبار اک دوسرے پہ کب ہمیں تھا زندگی
جھوٹی موٹی دوستی تھی اور نبھانی پڑ گئی

مشک جیسی کوئی بھی شے کب چھپانے سے چھپی
آپ کو پھر کس لئے صاحب چھپانی پڑ گئی

خوب واقف تھے کسی کے پیار سے حیدر مگر
آزمائی چیز پھر سے آزمانی پڑ گئی

AUF DER KÖOS 7
65795 HATTERSHEIM 1
GERMANY

ارمان نجمی

مرگِ خاموشی سے پہلے یہ صداؤں کا نگر تھا
اس کھنڈر کی خاک میں آباد اک چھوٹا سا گھر تھا
رو رہے تھے اور گلے مل مل کے رخصت ہو رہے تھے
گھر لٹانے والوں کو درپیش یہ کیسا سفر تھا
قافلوں کے قافلے معدوم ہوتے جا رہے تھے
منزلِ جاں کی طرف ہر راستہ زیر و زبر تھا
بستیوں کی بستیاں ویران ہوتی جا رہی تھیں
خیمہ زن گھر گھر میں سناٹا پسِ دیوار و در تھا
دکھ کی ایک کالی مسافت تھی جو کٹتی ہی نہیں تھی
دشتِ شب کی سرحدوں سے دور گلنارِ سحر تھا
کس کنارے پہ اتریں کشتیاں ہجرت زدوں کی
موجِ دریا مضطرب تھی قالبِ ساحل بھنور تھا
ٹوٹی پھوٹی زندگی کی کرچیاں قدموں تلے تھیں
پتھروں کے دیس سے شیشہ مثالوں کا گذر تھا
خاک و خوں میں خواب کے خیمے اجڑتے جا رہے تھے
جاں کی بازی لگی تھی داؤ پہ ایک اک سر تھا

P O BOX NO 64
GIZAN, K.S A.

محمد ممتاز راشد

اس نے [illegible] دیئے رکھے
اور اندھیرے میرے لئے رکھے

موت کو وقت ہی پہ آنا ہے
زہر بے شک کوئی سیئے رکھے

بات کرنی تو تھی مغلط "دل" کی
فیصلے بے سبب کیئے رکھے

تو نہ پل بھر بھی ہو سکے اوجھل
یوں نگاہوں کے زاویے رکھے

لوگ کیا آئیں تیری محفل میں
تو جو خود کو لئے دیے رکھے

حادثے چین ہی نہیں لیتے
کیا کوئی زخمِ دل سیئے رکھے

گیت ہم نے سجائے ہونٹوں پر
اور سینے میں مرثیے رکھے

جب لکھی داستانِ غم راشد
ہم نے سطروں میں حاشیے رکھے

P O. BOX NO 41
DRAWING SECTION
DOHA - QATAR
(ARABIAN GULF)

حنیف ترین

ایک صحرائی منظر

زعفران اوڑھے دھوپ
لو کے کاندھوں پر بیٹھی
قہقہے لگاتی ہے

بچپن

ننھی داستانوں میں
بچہ الجھا رہتا ہے
خواب کی دکانوں میں

تجزیہ

اس کے بوڑھے چہرے کی
جھرّیوں کی ہر تہہ میں
وقت کی ہے سرگوشی

پہلی بارش

جب شراب سی بوندیں
گرمیوں کی شدّت میں
خشک خشک مٹی کا
جسم گدگداتی ہے
سوندھا سوندھا اک نشہ
چارسو بکھرتا ہے

DIRECTOR, MUSTOSAF AL JUDEEDAH
ARAR - NORTH, K.S.A.

مشتاق سنگھ

ایک نظم

بچّو! دروازے بند کرلو
لڑکیو! دالان میں چھپ جاؤ!
اماں! چولہے کی راکھ پہ پانی ڈال دو!
گھر کی بتی گل کردو!
آسمان سے آگ برسنے والی ہے!
مٹھی بھر طوفان توڑنے والوں کو
گرفتار کرنے کے لئے
گھر گھر کی تلاشی ہونے والی ہے!
آگ زنی، بم دھماکوں
اور لڑکیوں کی عصمت دری کی
گھڑی آنے والی ہے!
اپنے ہی شہر میں
اپنے ہی ملک میں
اپنی ہی پولیس کی
حکومت ہونے والی ہے!
انگریز ہمیں وقت رخصت
جو تحفے دے گئے ہیں
ان کی نمائش ہونے والی ہے!
کرفیو کی شام ہونے والی ہے!!

25 - PINDHORN AVENUE
HAYES, MIDDLESEX UB4 ODG
ENGLAND

لطف الرحمان

آئی لینڈ ہاسپس میں ایک سال ★ ISLAND HOSPICE

کروٹ کروٹ تنہائی کی چادر کا آزار
خاموشی کے ہنگامے اور چپ چپ ہر بیمار
سالِ نو کے دامن میں ٹیسوں کا انبار
دوست پرانا کوئی نہیں یاں کوئی نہیں دلدار

یہ رات کچھ خفا سی
یہ رات بددعا سی
بیمار کی سزا سی
یہ رات کب کٹے گی؟
یاں درد کا ہے بستر
اور جسم و جاں کا رشتہ
باہر سے کٹ چکا ہے
اک گونج سی ہے اندر

"اے رات مہرباں ہو"
پچھلی سی دوستی دے
بیمار کی دعا لے
اے رات ضوفشاں ہو

یادوں کی بارات میں جگنو ڈھونڈ رہے ہے
سانسوں کی دہلیز پہ لمحے گنتی کے

★ لاعلاج مریضوں کی تیمارداری کا بین الاقوامی ادارہ۔

SECTION MANAGER MIDLANDS
P.T.C. P.O. BOX NO 274
GWERU, ZIMBABWE

رشید منظر

سکون اس کو اسی طرح آگیا ہوگا
بجھا بجھا سا سرِ شام ہی جلا ہوگا
بچھڑ کے شاخ سے پتے کا اب ٹھکانہ کیا
کیا ہے قتل جسے کل ستم شعاروں نے
جھکی ہوئی ہے سوئے اقتدار سبکی جبیں
تمام شہر میں اک شورِ بے نوائی ہے

❋

اٹھا تھا خاک سے پھر اسیں جا ملا ہوگا
کسی غریب کی ڈیوڑھی کا وہ دیا ہوگا
ہوا کے دوش پہ اُڑتا چلا گیا ہوگا
وہ شخص اپنے گھرانے کا آسرا ہوگا
کہا جو آپ نے، کہتے ہیں سب بجا ہوگا
نہ جانے کتنے غریبوں کا دل دکھا ہوگا

174 WHITTINGTON WAY
PINNER MIDDX HA5 5JY
LONDON U.K.

عتیق انظر

جسم کے گھروندے میں آگ شور کرتی ہے
شام کے دھندلکوں میں ڈوبتا ہے یوں سورج
دن میں ایک ملتی ہے اور دوسری شب میں
باغباں نے روکا، یا لے گیا اُسے بادل
غم کی بند مٹھی میں ریت سا مرا جیون
گاؤں کے پرندے تم، کیا پتا بدیسوں میں

❋

دل میں جب محبت کی چاندنی اترتی ہے
جیسے آرزو کوئی میرے دل میں مرتی ہے
دھوپ جب بکھرتی ہے چاندنی [illegible]
بات کیا ہوئی خوشبو اتنی دیر کر[illegible]
جب ذرا کسی مٹھی، زندگی بکھرتی ہے
رات ہم اکیلوں کی کس طرح گزرتی ہے

POST BOX NO 10894
DOHA QATAR (A G)

جمیل احسن

آہستہ چلنے والوں کو ساتھ ملا کر چل
ہم نے اپنی کتھا سنا کر دل لوٹے ہیں جیت
ایسے گھر میں رہنا کیسا جو پردیس میں ہو
اک آنسو کو پی جانے سے دل کا بوجھ بڑھا
بھیگ گئیں دہقاں کی آنکھیں دیکھ کے بنجر کھیت
میرے دیس میں تنہائی کا خوف جو لے انگڑائی
مدت بعد جمیل یہ عقدہ ہم پہ جا کے کھلا

❋

دل کے ہر اسرار کو جانے آتا جاتا پل
سچ اور جھوٹ کا اندازہ تو شاید ہو گا کل
اپنے وطن کی کٹیا یارو ہم کو تاج محل
خود آرائی کرتے کرتے سوکھ گئے جل تھل
جانے کس دھرتی پر برسے اب کے برس بادل
شاخ پہ تنہا کوئل بولے گونج اٹھے جنگل
دیس نکالا نہیں ہے پیارے ہر مشکل کا حل

HAGALUNDSG 42 7TR
171 50 SOLNA SWEDEN

جمشید مسرور

جو ہو سکے تو مجھے میرے پاس رہنے دے
تمام عمر اسی آگ میں سلگتا رہوں
برہنگی ہے قبا میں کئی زمانوں کی
کتاب رخ پہ لکھی مسکراہٹیں نہ مٹا
نہ جانے کب وہ ہجومِ نظر میں آ نکلے
مرے لئے تو ہیں دو حرفِ آشنائی بہت
نشاطِ شانہ و گیسو بجا سہی جمشید

❋

شب فراق ہے دل کو اداس رہنے دے
برس مگر مری مٹھی میں پیاس رہنے دے
بدن پہ آج ہوا کا لباس رہنے دے
ہمارے نام یہی اقتباس رہنے دے
رگوں میں رنگ ہواؤں میں باس رہنے دے
یہ قیل و قالِ زمانہ شناس رہنے دے
مجھے ابھی کوئی دم محوِ یاس رہنے دے

LINDEBERGASEN 46 A N 1068
OSLO - 10 NORWAY

سوھن راھی

148 THE BROADWAY
TOLWORTH, SURREY KT6 7HT
ENGLAND - (U K)

ایک کھڑکی بھر ہے میرا آسماں
چار دیواری میں ہے سارا جہاں

چوکھٹے میں قید ہوں تصویر سا
کاٹ لی ہے میں نے خود اپنی زباں

جھوٹ کی نقدی ہے میرے ہاتھ میں
کون دے گا آج پھر مجھ کو اماں

حرف کو آواز دی پیکر دیا
دشتِ کاغذ جابجا ہے داستاں

زندگی غم کا الاؤ زندگی
سانس ہے بے رنگ سانسوں میں دھواں

شہر ہی پہچان اپنی کھو گیا
کون جانے کون ہے راہی یہاں

عاصی کاشمیری

788 WOOD BOROUGH ROAD
NOTTINGHAM - NG3 5QJ
ENGLAND - (U K)

سامنے آنکھوں کے منزل دیکھتے رہ جائینگے
کشتیاں ڈوبیں تو ساحل دیکھتے رہ جائینگے

فکر کی پرواز کو بھی مل گئے ہیں بال و پر
اب اڑیں تو اہلِ محفل دیکھتے رہ جائینگے

عمر بھر ہم پہ رہی ہے فکرِ فردا حکمراں
آنے والے بھی کل دیکھتے رہ جائینگے

ڈھونڈنا نہ اب پڑے گا قتل کا کوئی ثبوت
خون خود بولنے لگا۔ قاتل دیکھتے رہ جائینگے

اور ہی کوئی چرالے جائیگا اب مشکِ زلف
ہم فقط خمدار کاکل دیکھتے رہ جائینگے

اب قبائیں چاک کرکے آئیں گے اہلِ خرد
اور حیرانی سے پاگل دیکھتے رہ جائینگے

اشک برسیں گے مری آنکھوں سے عاصی دیر تک
آگ، دریا اور جنگل دیکھتے رہ جائینگے

واصل عثمانی

P O BOX NO 2080
DAMMAM - 31411, K S A

اس طرح میری وفاؤں کا صلہ دے مجھکو
ہر تمنا کی جگہ زخم نیا دے مجھکو

مجھکو جو بات بھی کہنی تھی سرِ عام کہی
مرضیٔ وقت ہے جو چاہے سزا دے مجھکو

میں کہ ہر چند کوئی گوہرِ نایاب نہیں
اتنا سستا بھی نہیں ہوں کہ لٹا دے مجھکو

میں سرِ راہِ وفا ایک لرزتا سا دیا
تیری مرضی ہے جلا دے کہ بجھا دے مجھکو

تیری فرقت میں بھی اب آنکھ سے آنسو نہ بہیں
ایسے آدابِ محبت کے سکھا دے مجھکو

میں ترے عہد کی آواز ہوں پہچان بھی ہوں
قدر کر میری نہ اس طرح گنوا دے مجھکو

خس و خاشاک کی مانند پڑا رہنے دے
خود بکھر جاؤں گا تو یوں نہ اڑا دے مجھکو

اختر نولوی

1- FRIENDSHIP MARKET
CHOCK BAZAR
DHAKA - BANGLADESH

ذاتوں میں خاندانوں میں تقسیم ہو گئے
ہم مادری زبانوں میں تقسیم ہو گئے

مریخ، شمس، زہرہ، عطارد، زحل، قمر
سیارے آسمانوں میں تقسیم ہو گئے

بنتے ہیں اپنی کہیں تو چودھری کہیں
ہتھیار کارخانوں میں تقسیم ہو گئے

افسوس ہے پلے ہوئے اک ماں کی گود کے
دو بھائی دو مکانوں میں تقسیم ہو گئے

اپنا تو راز رہ نہ سکا راز ہی کوئی
سب راز راز دانوں میں تقسیم ہو گئے

تیرِ نگاہِ برق سے کوئی نہ بچ سکا
سب گلستاں نشانوں میں تقسیم ہو گئے

تسبیحِ فکرِ زیست بھلا ہو کہ ختم کیا
اختر جی اسکے دانوں میں تقسیم ہو گئے

عاصم صدیقی

نور ہی نور ہے لامکانی مری
صرف خوشیاں ہی مجھ پہ برستی رہیں
جب گیا گاؤں تو وہ شجر ہی نہ تھا
اس کے زخموں سے خوشبو سی آنے لگی
کیا حسیں سلسلہ تکلم کا تھا
جب میں منزل پہ پہنچا تو رہزن ملے
عاصم اجداد کے جب نشاں مٹ گئے

تیرا چہرہ ہے یا ضوفشانی مری
کتنی بے رنگ ہے زندگانی مری
جس سے وابستہ تھی اک کہانی مری
یہ لبوں کی ہے سب گل فشانی مری
چشم گویا تری ہے زبانی مری
ہنس کے دیکھا تجھے، کامرانی مری
رنگ لائی ہے تب بے مکانی مری

P.O. BOX NO 3255
DAMMAM 31481
K S A

زاھدہ طباطبائی

اے میرے پتھریلے رستو کس کی خیر مناؤں میں
جیسے تیز ہوا کی زد میں ٹہنی پر اک تنہا پھول
ایک ذرا سی بات پہ جو رو رو کر حال برا کر لے
دیکھو ہیجان انھیں رستہ رو کے بیٹھے ہیں
سحر زدہ سی اس بستی میں تند بگولے رقص کریں

میں تم کو گلزار بنا دوں یا پتھر بن جاؤں میں
ہر لحظہ یہ خوف کہ بکھر کر جانے کب اڑ جاؤں میں
اس لڑکی کو کیسے دل کے کاری زخم دکھاؤں میں
شام بکھیرے اپنی کرنیں تو اپنے گھر جاؤں میں
کیسے اپنی آشاؤں کے بجھتے دیے [illegible]

28 FAIR FIELD ROAD
ILFORD ESSEX IG1 2JJ
LONDON U K

کنیز فاطمہ

ظلمتوں سے جنگ اپنا کام بن کر رہ گئی
قافلے آتے رہے پرچم اٹھائے درد کے
ان سے ملنے کی تمنا اور بچھڑنے کا ملال
عشق کے آداب پاس بزم اور دل کی پکار
موسم گل تھا جواں جب بلبلیں تھیں نغمہ خواں
سطح پر ابھرے تو تھے اک پل کو رنگیں بلبلے

یہ عبادت میری صبح و شام بن کر رہ گئی
دل کی وادی شاہراہ عام بن کر رہ گئی
دھوپ چھاؤں زندگی کا دام بن کر رہ گئی
ہوش مندی، بندشوں کا نام بن کر رہ گئی
فصل گل اب تو خیال خام بن کر رہ گئی
زندگی پھر تلخیوں کا جام بن کر رہ گئی

BAZM E URDU
21 BAULKHAM HILL ROAD
NSW 2153 AUSTRALIA

سعید روشن

جب بھی تیری آنکھوں کو پرنم دیکھوں
تیری یاد نے دستک دی ہے پچھلے پہر
رنگ برنگی تتلی دل میں رقص کرے
گرے ہیں لاکھوں پیڑ ہواؤں میں لیکن
اس کی چاہت بھی تھی کچھ ایسی روشن

ہوتا ہوا دریاؤں کا سنگم دیکھوں
زخموں پر پھر لگتا ہوا مرہم دیکھوں
چاروں جانب پیار کا جب موسم دیکھوں
گری نہیں ہے پتوں سے شبنم دیکھوں
جسم سے اپنے لپٹا ہوا ریشم دیکھوں

POST BOX NO 21518
SAFAT 13076
KUWAIT (A G)

C/O M A MAJEED
JEBAH VILLAGE
HAIL K S A

کوئی خوشبو کوئی پیکر نہ کوئی گھر لکھ دے — دشت و صحرا ہیں فقط میرا مقدر لکھ دے
گو نہ خوشبو نہ کوئی اس میں سماتی ہی نہیں — دل تو ویرانہ ہے، ویرانے کو پتھر لکھ دے
اس میں مہتاب کی ٹھنڈک ہے نہ سورج کی تپش — یہ زمیں ہو گی فلک کے نہ برابر لکھ دے
قطرہ قطرہ ہی سہی ہجر کو رو دیں گے مگر — بن نہ پائے گا یہاں کوئی سمندر لکھ دے
منطقی ہے وہ انیسہ تری چاہت میں بہت — تو مگر عشق کو لفظوں سے بھی اوپر لکھ دے

انیسہ تنویر

P O BOX NO 988
SAFAT 13010
KUWAIT (A G)

جسے ممکن نہ تھا تسخیر کرتے — اسے کیا پاؤں کی زنجیر کرتے
ہجوم خواب سے بوجھل تھی آنکھیں — سو کس کس خواب کی تعبیر کرتے
محبت ساحلوں کی ریت ٹھہری — تو گھر کیا ریت سے تعمیر کرتے
کتاب دل کی قرأت چھوڑ دی ہے — کہاں تک درد کی تفسیر کرتے
چھپا کر رکھ لئے آنکھوں میں آنسو — تمہیں پانی سے کیا تحریر کرتے
جو منظر کی طرح گذرا نظر سے — اسے کیا قلب پہ تصویر کرتے
وفا کا نام لینا تج دیا ہے — کہاں تک آپ کی تشہیر کرتے

عابدہ کرامت

P O BOX 2035
ABU DHABI U A E
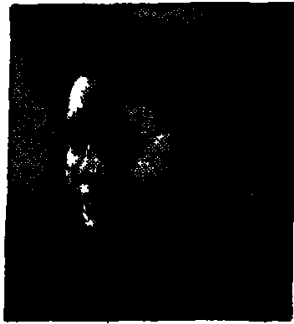
تم زیست گذاری کا ہنر بھول نہ جانا — راس آئے سفر پھر بھی یہ گھر بھول نہ جانا
اے چارہ گرو! درد کے بڑھنے کی دوا دو — اے بے خبرو! میری خبر بھول نہ جانا
کب سے یہ اماوس کی سیاہ رات کھڑی ہے — اے چاند مری راہ گذر بھول نہ جانا
رخصت کی گھڑی آئی تو برگد نے کہا پھر — جس سے ملا سایہ وہ شجر بھول نہ جانا
جس پھول سے ہے باغ کی زینت میں اضافہ — اے بادِ صبا وہ گل تر بھول نہ جانا
دی خانہ بدوشی نے مجھے کہہ کے تسلی — ہے زیست کا مقصد ہی سفر بھول نہ جانا

تسنیم عابدی

گرچہ رہنے کو شیشے کا گھر چاہیئے — پھر بھی کچھ تو ہوا کا گذر چاہیئے
معتبر آپ تھے معتبر آپ ہیں — ہم کو ہم جیسا ہی بے ہنر چاہیئے
بے خودی کی ضرورت بھی اپنی جگہ — دیکھیے رہنا ذرا باخبر چاہیئے
روشنی وہ کرے راستہ دیکھوں میں — ایسا جگنو صفت ہم سفر چاہیئے
اپنی بے چہرگی کا کروں اعتراف — بات کرنے کو کوئی بشر چاہیئے
تم متاعِ غم و دہر بانٹ لو — مجھکو ہر حال میں مال و زر چاہیئے
تیرا چھوٹا تو کھڑی پہ پڑا سنے — میرا مکتب میں لختِ جگر چاہیئے

آصفہ نشاط
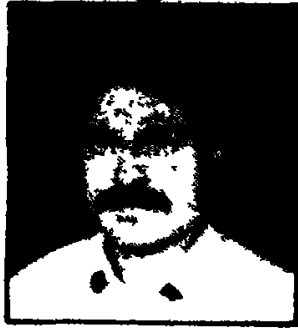
عابد جعفری

10 - 1235 RADOM STRET
PICKERING ONTARIO
CANADA L1W - 1J3

خط

میرے دفتر کی میز پر مختلف مشینوں کے نقشے بکھرے پڑے ہیں۔ اور ان کے درمیان کھلا ہوا ایک خط ہے جس کی ہر سطر ایک تیر کی مانند ذہن میں پیوست ہو چکی ہے۔ اور مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے دماغ کا شگاف ہو قطرہ قطرہ ہو کر میرے دل پر ٹپک رہا ہے۔ جس سے میں اندر ہی اندر لہو لہان ہو رہا ہوں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی دفتر آ گیا ہوں۔ ۔ اس لئے کہ میرے لئے دفتر سے بہتر جائے پناہ کوئی اور نہیں ہے۔ اور اپنی دلی کیفیت چھپانے کے لئے میں نے کام میں مشغول ہونے کی اداکاری بھی شروع کر دی ہے.... مگر وسیم کہاں ٹلنے والا ہے.... وہ مسلسل بات کئے جا رہا ہے....

کل بلیو جیز نے کمال کر دیا.... آخری اننگ میں پانچ رن بنائے اور اوک لینڈ سے سیریز جیت لی.... تم نے کل رات میچ دیکھا ؟

وسیم اور میں ایک ہی کالج کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ گزارا ہے۔ اس کو بھی ایک اتفاق ہی کہہ لیں کہ اس سرکاری محکمے میں ہمیں ایک ساتھ ملازمت بھی مل گئی۔ یوں ہماری دوستی اور گہری ہوتی چلی گئی۔ وسیم کے مشاغل بھی مجھ سے بہت حد تک مشابہ ہیں۔ وہ عام کینیڈینز سے بہت مختلف ہے اور میں عام پاکستانیوں سے، اسے بھی بیس بال کے کھیل سے عشق ہے اور مجھے بھی۔ وہ بھی امریکہ کی سیاسی بازگری سے نالاں رہتا ہے۔ اور میں بھی۔ مختصر یہ کہ ہم رنگ و نسل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہونے کے باوجود ذہنی طور پر بہت حد تک ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

"وسیم... مہربانی کر کے خاموش ہو جاؤ۔ میں اس وقت ذہنی طور بہت پریشان ہوں۔"

"اچھا... معاف کرنا۔ مجھے علم نہیں تھا۔ اس نے شرمندگی سے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اور میں اس خط کو دوبارہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ آج صبح سے بس ایک یہی سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا ہے۔

کالج میں میرے اور وسیم کے علاوہ ایک تیسری ہستی بھی تھی جس سے ہماری دوستی کا تکون مکمل ہوتا تھا اور وہ تھی پٹریشیا۔ نازک اندام، سنہرے بالوں اور دلکش نقوش والی حسینہ.... اس کی ہر ادا میں ایسا بھرپور نشہ تھا کہ میں اس میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اور جب چار گھنٹوں کی جدائی بھی بھاری ہونے لگی تو ایک دن وہ اپنا مختصر سا سامان لے کر میرے اپارٹمنٹ میں آ بسی۔ ہم مہینوں ساتھ رہے۔ اس نے میرے سکون کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیا۔ اور خود کو میری تہذیب کے سانچے میں ڈھونس ڈھونس کر بھرنے لگی۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ مشرقی کھانوں کی ترکیبوں پر ہاتھ صاف کرنے لگی اور حد تو یہ ہے کہ میری زبان کے بہت سے سادہ جملوں کو اپنا خوبصورت لہجہ دینے لگی۔ وسیم کی طرح وہ بھی عام کینیڈین لڑکیوں سے بہت مختلف تھی اتنی کہ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے اس کے نئے پیکر پر کسی پرانی اور دقیانوسی روح کا قبضہ ہے۔ اس کا رہن سہن اور عادات و اطوار بالکل مشرقی لڑکیوں جیسے تھے۔ ایسی مشرقی لڑکیوں جیسا جو اپنے محبوب سے نہ صرف محبت کرتی ہیں بلکہ اس پر دل و جان سے قربان بھی ہو جاتی ہیں۔ اس نے اپنی بے پناہ محبت سے مجھے پوری طرح گرویدہ کر لیا تھا۔ اور اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔

کالج سے فراغت کے بعد ہم تینوں روزگار کی تلاش میں مصروف ہو گئے مجھ پر اور وسیم پر قسمت کی دیوی مہربان تھی اس لئے ہمیں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی۔ مگر بے چاری پٹریشیا کامیاب نہ ہو سکی اور ہزار کوششوں کے باوجود اسے اس شہر میں ملازمت نہ مل سکی مجبوراً اسے ملازمت کے لئے ڈیڑھ دو سو میل دور ایک چھوٹے سے شہر میں منتقل ہونا پڑا۔

مجھے جدائی کی وہ گھڑی آج بھی یاد ہے۔ جب وہ میرے سینے سے لگی

تمام رات آنسو بہاتی رہی اور میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اسی عالم میں ہم نہ جانے کب سو گئے۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو وہ جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی اور اس نے ایک طویل ہدایت نامہ لکھ کر بیڈ روم کے دروازے کی اندرونی طرف چسپاں کر دیا تھا جس میں میرے لیے صبح سے رات تک کے احکامات تحریر تھے۔

مجھے کیا کھانا ہے۔ کیا نہیں کھانا ہے۔ کہاں جانا ہے۔ کہاں نہیں جانا ہے۔ کس سے ملنا ہے کس سے نہیں ملنا ہے۔ بلوں کی ادائیگی کب کرنا ہے۔ پلانٹس کو پانی کب دینا ہے۔ اسے فون کرکے اپنی خیریت سے آگاہ کب کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس ہدایت نامے کو ایک نظر دیکھ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا ممی... ان احکامات پر ضرور عمل کروں گا۔"

اور وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی۔

ابتدا میں اس جدائی کے غم سے ہم دونوں نڈھال رہے۔ اور اس کی شدت میں کمی کے لیے ٹیلی فون کا سہارا لیتے رہے پھر یوں ہوا کہ ہفتہ وار چھٹیوں میں وہ میرے پاس آجاتی یا میں اس کے پاس چلا جاتا آہستہ آہستہ ہم اس جدائی کو قبول کرنے لگے۔

ویم ہماری بے تابیوں سے بخوبی واقف تھا۔ اور بارہا یہ مشورہ دے چکا تھا کہ اب ہم دونوں کو شادی کر لینا چاہیے۔

ایک دن ہم نیاگرہ فالز کے ایک خوبصورت ریستوراں میں بیٹھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبنے اور ابھرنے کے عمل سے گذر رہے تھے کہ اچانک مجھے ویم کا مطالبہ یاد آگیا۔

"مجھ سے شادی کروں گی؟"

"کیا؟" اس کے چہرے سے حیرت اور خوشی کا ایک پورا سمندر گزر گیا۔ اور اس کی آنکھوں کی نیلی روشنی نے اطراف کی ہر چیز کو نیلا کر دیا۔

"تم مجھ سے شادی کروگے؟"

"کیوں نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ اب ہمیں مکمل ہو ہی جانا چاہیے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی سہانی شام تھی۔ ہم دونوں نصف شب تک ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے نیاگرہ کی بپھری ہوئی موجوں کو زمین کی گہرائیوں میں گرتا ہوا دیکھتے رہے۔ ہلکی ہلکی پھوار نے ہمیں تقریباً بھگو دیا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر پانی کی بے شمار ننھی ننھی بوندیں تازہ گلاب پر شبنم کے قطروں کی طرح مچل رہی تھیں۔ آبشار پر ڈالے جانے والی مختلف روشنیوں کا عکس اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ کر رہا تھا۔ اور وہ ان تماشوں سے بالکل بے نیاز کبھی میری آنکھوں اور کبھی آبشار کو تکے جا رہی تھی مسرت نے اس کی آنکھوں میں بے شمار جگنو بھر دیئے تھے۔

ہم نے دیر تک مستقبل کے حسین خواب دیکھے۔ کاش وہ وقت یہیں رک جاتا۔۔۔۔۔

میں نے ایک مرتبہ پھر لفافے میں سے وہ خط نکالا اور اس کے ہر لفظ پر غور کرنے لگا یہ سارے الفاظ وہی تھے جو میں بارہا سن چکا ہوں۔

زندگی میں میں نے صرف اور صرف تم سے محبت کی ہے۔ تم ہی وہ پہلے شخص ہو جس نے میرے جسم کو اس طرح چھوا ہے۔ تم نے ہی میرے دل میں پیار کی جوت جگائی ہے۔۔۔۔۔"

میں نے وہ خط دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔ اور اس پر لکھے ہوئے پتے پر غور کرنے لگا۔ کون ہو سکتا ہے یہ شخص؟ ثریا کو شادی کا پیغام دینا میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ بن گیا ہے۔ اب وہ میری پوری ہستی پر قابض ہو چکی تھی۔ اور اس نے دل کی کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی تھی۔ یوں تو میں اس کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔ ہماری رفاقت نئی نہیں تھی۔ اس کے خاندان والوں، چاہنے والوں اور دوستوں سے کم از کم نام کی حد تک ضرور واقف تھا۔ وہ سال میں تین چار مرتبہ "سارنیہ" ضرور جاتی تھی۔ جہاں اس کا خاندان آباد تھا۔ اس کے والدین بھی مجھ سے واقف تھے۔ اس کے باوجود اس نے وہ ساری باتیں مجھے بتا دیں، جن کا تعلق اس کی ذات سے تھا۔

میں نے کرب سے پہلو بدلا۔ "ثریا میں تمہارا مجرم ہوں۔" "تمہاری تباہی کا تنہا ذمہ دار... جان ہو سکے تو مجھ کو معاف کر دینا۔ ویم اب میرے حصے کا کام نمٹا رہا تھا۔ اور میں سوچوں میں غلطاں تھا۔

ثریا... میری ممی کا خط آیا ہے۔ ..... بہت بیمار ہیں۔ مجھے پاکستان جانا پڑے گا۔ کیوں کہ ان کا میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میں ان کا واحد بیٹا ہوں۔"

"اچھا کب جا رہے ہو؟" ثریا نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کل ہی"
"واپس کب آؤ گے؟" اس کا لہجہ مزید ڈوب گیا۔
"پتہ نہیں" "کچھ وقت تو لگے گا ہی۔"
"مل کر بھی نہیں جاؤ گے؟" اس کی آواز فرطِ غم سے تقریباً لرز گئی
"ملنا تو چاہتا ہوں۔ مگر یہ ممکن نہیں... وقت بہت محدود ہے

اور کام بہت۔"
"اچھا سلامت رہو" یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔
"کوئی نصف شب گذر چکی ہو گی۔ میں ابھی تک جانے کی تیاریوں
میں مصروف تھا کہ وہ آ گئی اور آتے ہی بڑے والہانہ انداز میں مجھ
سے چمٹ گئی۔
"ارے اتنی رات گئے تم اکیلی آ گئیں"، میں نے تعجب سے
پوچھا۔
"ہاں مگر تمہیں رخصت کرنے نہیں آئی ہوں۔ تم تو مجھ سے ملے
بغیر جانا چاہتے ہو ناں... میں تو صرف تمہارا سوٹ کیس دیکھنا چاہتی
ہوں کہ ضرورت کی سب چیزیں تم نے رکھ لی ہیں کہ نہیں؟"
مجھے اس پر بے اختیار پیار آ گیا اور میں نے اسے باہوں میں بھرتے
ہوئے کہا۔
"جاناں! سب سے اہم شے تو تم ہو، جب تمہیں ہی چھوڑے
جا رہا ہوں تو پھر کسی اور چیز کا غم کیا..."
"مجھے بھی ساتھ لے چلو نا"۔ اس کے چہرے پر سرخ گلاب کھل اٹھے۔
"نہیں ابھی نہیں... آئندہ پروگرام بنا کر جائیں گے۔"
"مجھے یاد کرو گے؟" اس نے مجھے اپنے مزید قریب کرتے ہوئے کہا
"نہیں بھول جاؤں گا"
میں نے اسے چھیڑا تو اس نے دانت بھینچ کر میرے سینے پر دو تین
ہاتھ مارے اور مصنوعی غصے سے بولی۔
"جان سے مار دوں گی اگر مجھے بھولے۔"
"کافی حاضر ہے" ندیم نے کافی کا پیالہ میری میز پر رکھا اور اپنی
میز کی طرف بڑھ گیا۔
"شکریہ۔ مجھے اس کی شدید ضرورت تھی۔" مجھے اپنے اعصاب
میں کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ سر بھاری تھا اور بخار کی سی کیفیت مجھ
پر طاری تھی...
"اماں کیسی ہیں آپ؟" میں نے اپنی سوچ کا لنگر پھر ماضی پر

ڈالا
میری بوڑھی ماں ہسپتال کے ایک بستر پر ساکت پڑی تھی۔ کینسر کے
کینسر نے انہیں دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ صرف سانسوں
کی آمد و رفت باقی تھی۔
انہوں نے بڑی نقاہت سے آنکھیں کھولیں... اور شفقت
سے میری طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے گویا ہوئیں۔
"تو آ گیا میرے لال میں تیرا ہی انتظار کر رہی تھی...... آ
میرے پاس بیٹھ"
میں ان کے پاس بستر پر ہی بیٹھ گیا۔ ہسپتال کا کمرہ رشتہ داروں
سے بھرا ہوا تھا... اسی مجمع میں سے ایک دبلی پتلی اور قدرے سہمی ہوئی
لڑکی کو اماں نے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ پھر مسکرا کر مجھ سے وہ
مخاطب ہوئیں۔
"یہ ہے تیری دلہن۔ آسیہ... میرے مرحوم چچا زاد بھائی کی
بچی ہے۔ بہت ہی پیاری، تعلیم یافتہ اور سگھڑ ہے۔ تجھے ساری زندگی
خوش رکھے گی۔"
"اماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں یہاں شادی کرنے کے
لئے نہیں آیا ہوں... آپ کی خدمت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اس
وقت تو ایسی باتیں مت کیجئے۔ آپ بیمار ہیں۔ میں نے تڑپ کر کہا
"خدمت تو میری یہ کر رہی ہے۔ میری دیکھ بھال میں اس بیچاری
نے دن رات ایک کر دیا ہے۔ اس نے کبھی مجھے تیری کمی محسوس نہیں
ہونے دی۔ میں نے اس کے مرحوم باپ کو زبان دی ہے۔ کہ یہ میری بہو
بنے گی۔"
"ٹھیک ہے... مگر یہ ان باتوں کا موقع نہیں۔ اس وقت
آپ کو بہو کی نہیں... دوا اور آرام کی ضرورت ہے۔" میں نے اس
حادثے کو ٹالنے کی کوشش کی۔
"میرے بچے مجھے مایوس نہ کر... یہ تیری مرتی ہوئی ماں کی آخری
خواہش ہے۔ اسے اس طرح رد نہ کر۔ میں تیرے سر پر سہرا دیکھنے کی حسرت
قبر میں لے کر نہیں جانا چاہتی۔" اماں کی آنکھوں سے بے شمار آنسو
بہہ نکلے۔

پھر جیسے سارے رشتہ دار مجھ پر ٹوٹ پڑے۔
کیسے کٹھور دل ہو میاں!
کیا تم اپنی ماں کی آخری خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟

"ارے یہ تو سوچو کہ تمہارے علاوہ ان کا ہے ہی کون؟"

"تمہیں پتہ ہے تمہاری ماں نے تمہیں کن مشقتوں سے پروان چڑھایا ہے۔؟"

"کیا اسی دن کے لئے انہوں نے تمہیں پیدا کیا تھا؟"

"جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں بھی۔۔۔۔

اسی شام ہسپتال کے کمرے میں میرا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ اماں نے ہونٹوں پر ایک خفیف تبسم اور آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسوؤں سے میری شادی کا منظر دیکھا اس وقت مجھے اپنا وجود ایک ایسے کھلونے کی مانند لگا جس کی ہر حرکت کو کھلونا بنانے والا اپنی خواہش کے مطابق متعین کر لیتا پھر اس کھلونے میں جب بھی چابی بھری جائے۔ وہ ویسی ہی حرکت کرتا ہے۔ میرے وجود میں بھی فرائض کی ادائیگی اور احساس ذمہ داری کی چابی پوری قوت سے بھر دی گئی تھی اور میں اماں کی متعین کی ہوئی حرکات و سکنات کی نمائش کر رہا تھا۔

یہ بات نہیں کہ میں نے اماں کو ثریا کے بارے میں نہ بتایا ہو۔ میں نے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔ کہ ثریا میری زندگی ہے ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور ایک ساتھ زندگی گذارنے کے عہد و پیماں کر چکے ہیں۔۔۔۔ مگر اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتیں ایک ہیبت ناک مونچھوں والے خاندان کے بزرگ بھنویں چڑھا کر بولے۔۔۔۔

"کیا کہہ رہے ہو میاں؟۔۔۔۔ انگریز لڑکی سے شادی کرو گے خاندان کی عزت و آبرو خاک میں ملانے کا ارادہ ہے کیا۔؟۔۔۔۔ تم نے کبھی غور کیا کہ تمہاری آنے والی نسل کا کیا ہو گا۔ اور صاحبزادے انگریز عورت کسی سے وفا نہیں کر سکتی اسکے تو خون میں ہی بے وفائی ہوتی ہے۔۔۔۔ خاندان کی جس لڑکی سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ وہ ایثار و وفا اور شرافت و پاکیزگی کا نمونہ ہے۔ زندگی بھر تمہاری خدمت کرے گی۔ تم سے محبت کرے گی اور زندگی کے ہر کٹھن مرحلے میں تمہارا ساتھ دے گی۔"

وہ بزرگ تقریر کرتے رہے۔ اور اماں کا چہرہ بجھتا رہا۔۔۔ پھر انہوں نے اپنے نحیف ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تجھے میری قسم۔۔۔ خاندان کی آبرو کو خاک میں مت ملا اور اس لڑکی سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

شادی کی رات میں اور میری بیوی آسیہ اماں کے پاس رہے۔۔۔

اماں کچھ دیر جاگتی رہیں۔۔۔۔ مگر کچھ بولیں نہیں بس کبھی کبھی آنکھیں کھول کر وہ ہم دونوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھ لیتیں۔ کچھ دیر بعد وہ سکون سے سو گئیں۔ اور ہم ان کے بستر سے لگے بیٹھے رہے۔۔۔۔ اس دوران آسیہ بھی چپ رہی اور میرے پاس تو کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ ثریا سے بے وفائی کا احساس میری رگ رگ میں دکھ کی چنگاریاں بھر گیا تھا۔ اور میں ذہنی طور پر بالکل منتشر ہو کر رہ گیا تھا اسی عالم میں صبح ہو گئی۔۔۔ اماں اب بھی اسی اطمینان سے سو رہی تھیں۔۔۔ پھر نرس آئی۔۔۔ کچھ دیر ٹھہری اور تیزی سے باہر نکل گئی۔۔۔۔ پھر ڈاکٹر آیا۔۔۔ اس نے اماں کا معائنہ کیا۔ اور مجھ سے کہا کہ تمہاری اماں اب کبھی بیدار نہ ہونگی۔ وہ ابدی نیند سو گئی ہیں۔"

"اماں کیا مریں۔۔۔۔ میرے احساسات و جذبات ہی دم توڑ گئے۔۔۔ کئی دن تک تو مجھے اپنے وجود کا احساس ہی نہ رہا۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔ کہاں سے آیا ہوں۔۔۔ دل اماں سے بار بار شکایت کرتا تھا۔۔۔۔ کہ اماں میں نے تو آپ کی خوشی کے لئے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔۔۔۔ آپ پھر بھی روٹھ گئیں۔۔۔

ایک رات کئی دنوں کی بے خوابی کے بعد میری آنکھ لگی تو احساس ہوا کہ کوئی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ تو وہ آسیہ تھی۔ میری اجنبی بیوی۔۔۔ جو میرے چہرے کو عجیب نظروں سے تک رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔؟" میں نے بہت روکھے لہجے میں پوچھا۔

"مجھ سے ناراض ہیں نا آپ" اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔

"میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔۔۔۔ میرے لئے تو تم اب بھی اجنبی ہی ہو۔۔۔ اور اجنبی ہی رہو گی اس لئے کہ میں نے تمہیں دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ ہماری شادی ایک مجبوری تھی۔۔۔ اسے بھول جاؤ۔ تم میری طرف سے آزاد ہو۔۔۔۔"

اس نے میرے ہونٹوں پر مہندی لگا ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو نہریں بہہ نکلیں۔

"بس اب اور کچھ مت کہیئے۔۔۔ میں آپ کے قابل نہیں اس کا مجھے علم ہے۔۔۔ مگر آپ کو شاید یہ علم نہیں کہ میں اس وقت سے آپ کی پوجا کر رہی ہوں جب سے اماں ہمارے گھر رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اور ابا نے رضامندی دے دی تھی بس اسی دن سے میں نے آپ کی محبت

کو اپنا ایمان بنا لیا تھا۔"

"یہ محبت نہیں... حماقت ہے... ہم تو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف بھی نہیں پھر محبت کا کیا سوال۔"
میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"ہم مشرقی لڑکیوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم جس سے محبت کریں... اس سے اچھی طرح واقف بھی ہوں۔ آپ ہمارے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے کہ آپ جس ملک میں رہتے ہیں۔ وہاں محبت کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کا ملنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر ہماری معاشرے کی عورت ابھی اتنی آزاد نہیں ہوئی ہے۔ یہاں تو اکثر لڑکیاں اپنی پوری عمر گذار دیتی ہیں... مگر اپنے محبوب سے اظہارِ محبت نہیں کر پاتیں...."

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ خوبصورت سی دبلی پتلی لڑکی میرے لئے قابلِ رحم تھی۔ میں اپنے بے رحم معاشرے سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ طلاق یافتہ لڑکی کی اس معاشرے میں کیا حیثیت ہے۔ وہ بے چاری فضول رسم و رواج کا شکار ہو کر زندہ درگور ہو جاتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ قصوروار یہ لڑکی ہے۔ اور نہ میری ماں بلکہ یہ معاشرہ ہے جس نے ہر انسان کی پشت پر فرسودہ رسومات کی ریلیں باندھ رکھی ہے۔ جسے وہ خواہی و ناخواہی کھینچے چلا جا رہا ہے۔

"لنچ پر جانے کا ارادہ ہے... کہ نہیں۔" ولیم نے میرے خیالات کا جال میرے ذہن سے اتار دیا۔

"کیوں نہیں!" میں نے مسکرانے کی کوشش میں اپنا چہرہ بگاڑ لیا ہم دونوں کینٹین کی سیڑھیاں میں اتر آئے۔

"تم آج بہت افسردہ لگ رہے ہو۔ میں تم سے کوئی ذاتی سوال کرنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مسئلہ چاہے کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو... اس کو افسردگی سے نہیں عقلمندی سے حل کیا جانا چاہیئے۔"
ولیم نے دوستانہ مشورہ دیا۔

"شکریہ ولیم... تم میرے عزیز دوست ہو.... تمہارا مشورہ بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ مگر بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں۔ جن کا الجھاؤ... عقل کو بھی الجھا کر رکھ دیتا ہے۔ اس وقت میں اسی کیفیت کا شکار ہوں۔"

ولیم نے کوئی اور سوال نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے کھانے اور اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ اور میں سوچنے میں....

"ثریا مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا... کہ مجھے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میری ماں بسترِ مرگ پر تھیں یہ ان کی آخری خواہش تھی کہ جو میرے لئے اُسے رد کرنا دشوار تھا۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اور وہ فون کے دوسری طرف سسکتی رہی۔

"یقین کرو میری جان کہ میں نے ہر طرح سے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی... مگر وہ نہ مانیں... اگر میں... اگر میں ان کی بات نہ مانتا تو...."

"تو کیا ہوتا... وہ مر جاتیں ناں... اور تمہاری اس سعادت مندی کے بعد وہ جی اٹھیں... ہے ناں.."
اس نے تڑپ کر میری بات کاٹ دی "نہیں... مگر۔"

"مگر وگر کچھ نہیں... سیدھی سی بات ہے... وہاں جا کر وہ لڑکی تمہیں پسند آ گئی۔ اور تم نے اس سے شادی کر لی اور بس۔"
اس نے پھر میری بات کاٹ دی۔

"ایسی بات نہیں ہے.... تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ سراسر زبردستی کا رشتہ ہے۔ جس روز میں وہاں پہنچا... اسی روز میری شادی اس سے کر دی گئی۔ میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ میں کسی کو پسند کرتا۔" میں نے صفائی پیش کرنی چاہی۔

"چلو میں مانتی ہوں کہ تم مجبور ہو گئے تھے... مگر اب کیا مجبوری ہے.... اسے طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔ تاکہ ہم پھر سے ایک ہو جائیں تم تو صرف مجھ سے محبت کرتے ہو نا.... ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے زندگی گذار سکتے ہو۔ جو زبردستی تمہاری بیوی بنا دی گئی ہو... بتاؤ۔"
اس کی آواز میں اب قدرے ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

"نہیں ثریا میں ایسا نہیں کر سکتا... اگر میں نے ایسا کیا تو ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ وہ بے موت مر جائے گی۔" میں نے اپنی مجبوری بیان کر دی۔

"اور میری زندگی کا تمہیں ذرا بھی خیال نہیں۔" ایک مرتبہ پھر اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

"جو ہو چکا ہے اس کے لئے میں تم سے شرمندہ ہوں مجھے بھول جاؤ ثریا... اب میں تمہارا کبھی نہیں ہو سکتا۔"
میرے اس جملے کے ساتھ ہی اس نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"ثریا کی یاد ایک عرصہ تک مجھے تڑپاتی رہی۔ میں نے فرائض کی ادائیگی اور شرافت کا بھاری پتھر اپنے دل پر رکھ لیا تھا اس لئے پھر کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ویم نے میرے نہ چاہنے کے باوجود اس کے بارے میں اطلاعات دیتا رہتا۔ ویم ہی کی زبانی مجھے علم ہوا کہ اب اسے اسی شہر میں ملازمت مل گئی ہے اب تک تنہا ہے۔ میری خیریت معلوم کرتی رہتی ہے۔ اور خود سے بے حد لاپرواہ ہو گئی ہے ان خبروں کو سن کر مجھے افسوس ہوتا۔ پھر یوں ہوا کہ آسیہ کی معصوم محبت نے آہستہ آہستہ ثریا کی محبت پر پردے ڈالنا شروع کر دیئے۔ اور جن واقعات کو کبھی میں زندگی کا اثاثہ سمجھتا تھا۔ وہ میرے ذہن سے غیر محسوس طریقے سے محو ہونے لگے۔ اب اگر میری باہوں میں آسیہ ہوتی تو آنکھ بند کر لینے کے باوجود آسیہ ہی کا لمس محسوس ہوتا۔ کوئی اور درمیان میں حائل نہ ہوتا جب وہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر میرے کان میں کہتی کہ" میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ مجھے خود سے الگ نہ کرنا زندگی میں میں نے صرف اور صرف تم سے پیار کیا ہے۔ تم ہی وہ پہلے شخص ہو جس نے میرے دل میں پیار کی جوت جگائی ہے۔ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی"۔ تو بے اختیار مجھے اس پر پیار آجاتا اور میں سوچتا کہ یہ کتنی عظیم لڑکی ہے کہ ثریا کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس والہانہ انداز سے مجھے چاہتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے پر کسی اجنبی کا نام اور پتہ تحریر تھا۔ یہ لفافہ اور کئی لفافوں کے ہمراہ آسیہ نے مجھے دیا تھا تاکہ میں اسے حوالۂ ڈاک کر دوں یہ اس کا معمول تھا کہ ہر ہفتے وہ بڑی پابندی سے اپنے رشتہ داروں اور سہیلیوں کو خطوط لکھتی۔ اور پیر کو تمام خطوط مجھے تھما دیتی۔ اور میں آفس جاتے ہوئے راستے میں انہیں لیٹر بکس میں ڈال دیتا۔ یہ لفافہ کار کی سیٹ سے نیچے جا گرا اور دوسرے لفافوں کے ساتھ میں اسے لیٹر بکس میں نہ ڈال سکا۔ آفس کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد میری نظر اس لفافے پر پڑی میں نے اسے اٹھایا تو اس پہ نام اور پتے میں بڑی اجنبیت محسوس ہوئی میں آسیہ کے تقریباً سبھی رشتہ داروں دوستوں سے واقف تھا۔ مگر یہ نام میرے لئے نیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی نیا دوست ہو یا پھر اس نام سے ناآشنائی کی وجہ یہ ہو کہ میں بغیر دیکھے آسیہ کی تمام ڈاک لیٹر بکس میں ڈالتا رہا ہوں۔۔۔ میں نے لفافہ کار کی سیٹ پر ڈال دیا۔ اور کار سے باہر آگیا۔ مگر لفافہ ایک تشویش بنکر میرے ذہن پر سوار ہو چکا تھا۔ ابھی کار سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ قدم خود بخود واپس مڑ گئے۔ کار میں بیٹھ کر میں نے لفافے کا ایک مرتبہ اور جائزہ لیا۔ اور اس کے باوجود کہ میں کسی کا خط پڑھنا اخلاقی جرم تصور کرتا ہوں بہت ہی غیر ارادی طور پر میں نے وہ لفافہ کھول لیا۔ لکھا تھا۔

جان! ڈھیروں پیار۔ تمہارا خط ملا۔ تمہاری بے چینی سے میں واقف ہوں تمہیں یہ کب یقین آئے گا کہ میں بھی یہاں پل پل تمہاری یاد میں تڑپتی رہتی ہوں تم جانتے ہو کہ زندگی میں میں نے صرف اور صرف تم سے محبت کی ہے تم ہی وہ پہلے شخص ہو جس نے میرے بدن کو چھوا ہے۔ تمہیں نے میرے دل میں پیار کی جوت جگائی ہے۔ یہ تو ایک مجبوری کی زندگی ہے جس کے لئے تم ہی نے مجھے مجبور کیا ہے اب اتنے بیتاب کیوں ہو رہے ہو۔ ابھی تو میں تم سے مل کر آئی ہوں اتنی جلدی دوبارہ کیسے آسکتی ہوں۔ بس دو سال اور صبر کر لو میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہاں کی شہریت ملتے ہی میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں گی۔ پھر ہمیں کوئی جدا نہ کر سکے گا۔

اس کے بعد مجھ سے خط نہیں پڑھا گیا۔ خاندان کے بزرگ بیچے کے بازگشت نے میری ہر سوچ کا احاطہ کر لیا۔ جس لڑکی سے تمہاری شادی ہو رہی ہے وہ ایثار، وفا اور شرافت و پاکیزگی کا نمونہ ہے زندگی بھر تم سے محبت کرے گی۔۔۔۔ انگریز عورت بھی کسی سے وفا کر سکتی ہے اس کے تو خون ہی میں بے وفائی ہوتی ہے۔

"ارے بھئی چار بج چکے ہیں گھر نہیں جاؤ گے؟" ویم نے پھر مجھے خیالات سے پلٹا دیا۔ گھر!۔۔۔۔ ہاں گھر تو جانا ہی پڑے گا۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی مگر مجھے ابھی کچھ دیر اور یہاں بیٹھنا ہوگا۔ میرا ایک کام کرو گے ویم۔"

"کیوں نہیں کیا کام ہے؟" ویم نے میری میز کے قریب آتے ہوئے کہا

"ٹھہرو" میں نے وہ خط لفافے میں رکھا اور ٹیپ سے لفافے کو بند کر دیا "ذرا اسے کسی قریبی لیٹر بکس میں ڈال دینا۔ بہت ضروری خط ہے اور ہاں ذرا ثریا کا فون نمبر تو دینا۔ بہت دنوں سے اسکی آواز نہیں سنی کان ترس گئے"

"کیوں نہیں" ویم خط لیکر اپنی میز کی طرف گیا۔ پھر اچانک کسی خیال سے اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔ ❀

نعیمہ ضیاء الدین

AM - KALBSKOPF - 1
61263 - NEU ISENBURG
GERMANY

صرف ایک مارک

شومئی قسمت موسم اس روز بہت زیادہ خراب ہوگیا۔ ویسے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ اور تند و بلا خیز بارشوں کے ریلے موسمِ خزاں کا ایک لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن پچھلے چند روز سے مطلع تقریباً صاف چلا آرہا تھا۔ دن بھر وقفے وقفے سے دھوپ نکلا کرتی اور دھوپ کے اس زرد آبشار میں ہر درخت کے ارگرد پھیلا پتیوں کا ڈھیر کچھ اور رسیلا کچھ اور نمایاں ہوجاتا۔

دریائے مائن کے کنارے ہفتے کے روز آدھے دن کے لئے فلو مارکیٹ FLOH MARKET لگا کرتی۔ یہ ان متروک یا اپنے مالکین کے لئے بے ضرورت اشیاء کی دوکانیں ہوتی تھیں جنہیں وہ گھروں سے نکال باہر پھینکتے ہیں۔ ویسے درحقیقت یہ اشیاء بالکل ہی بے کار قسم کی بھی نہیں ہوتیں بڑی اچھی حالت میں ہوتی ہیں بلکہ کبھی کبھی تو خاصی قیمتی چیزیں بھی یہاں کوڑیوں کے مول بک جاتی ہیں۔ بس وقت وقت کی بات ہے۔ زمانے کے دربار میں وقت کی شہنشاہیت، جس کی جو چاہے قیمت لگوا دے۔

اینائے مجھے ایک روز یہاں ایسے ہی مٹرگشتی کرتی نظر آئی تھی ہم دونوں کو اتفاق سے ایک ہی شمع دان پسند آگیا۔ گہرا نیلا کانچ جو اپنے اندر ایک عجیب جلال و دبدبہ رکھتا تھا۔ ٹھوس شیشہ پتلا ہو کر پرندے کی چونچ اور گردن کی مانند اضمحلال کے ساتھ اوپر سے بل کھا کر نیچے کی جانب مڑتا چلا گیا وہ اس دکان کے سارے ساز و سامان میں بے حد اجنبی اور حسرت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا جیسے غلطی سے کسی شاہی گھرانے کی نازک مزاج خاتون کی خواب گاہ سے نکل کر ادھر چلا آیا ہو۔

"کتنے کا ہے .....؟ ہم دونوں نے ایک ساتھ سوال کیا اور اس حرکت پر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے خفت سے مسکرادیں

دکاندار نے بیزاری سے قیمت بتادی۔

"چلو تم لے لو ......" اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا

نہیں .... تمہارا حق اس پر زیادہ ہے .... تم نے لمحہ بھر پہلے پوچھا تھا۔ میں نے حاتم طائی کی سی شان امتیازی دکھانے بلکہ جتانے کی کوشش کی۔

"ارے نہیں ...." وہ بے ساختہ ہنس دی۔ میری دلی خواہش ہے کہ اسے تم حاصل کرلو۔ دوسرے کی خوشی میں جو لطف ہے، وہ اپنی مسرت سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

"تعجب ہے ....." میں نے حیرت سے اسے دیکھا "آج کل تو ایسا نہیں ہوتا... پھر تم کون ہو... کہاں رہتی ہو .. ضرور فن کار ہوگی۔ چلو اس بہانے تعارف ہی ہوجائے۔"

"اینائے" اس نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا نام دہراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اب یہ بھی بتادو۔ کہ کیا کرتی ہو۔" اس نے اپنے پرس سے کارڈ نکال کر میری جانب بڑھایا۔

"اینائے ہینز رٹ۔ فری لانسر۔ جرنلسٹ اور کہانی کار

"واہ میں نے چہکار کر کہا۔" دیکھا تم نے! میرا مشاہدہ سو فیصد درست ثابت ہوتا ہے۔ ایک نگاہ میں پہچان لیا تھا کہ تم فنکار ہو۔

جذبہ خیرسگالی کے طور پر وہ گہرا، نیلا مضمحل اور زمانے کی کج ادائی کا شکار، اداس سا شمع دان۔ میں نے زبردستی اسے دلادیا۔ البتہ کبھی کبھار اس کے دیدار کی خاطر ریناکے ہاں جانے آنے کا دعوت نامہ قبول کرڈالا۔

یوں رینا اور میں ایک دوسرے کی شمع دان دوست بن گئیں

وہ کہانی کار تھی۔ عجیب عجیب مواقع اور صورتِ حال ڈھونڈا کرتی۔ اکثر فرصت کے اوقات میں، میں بھی اس کی ہمراہی کی سعادت حاصل کر لیا کرتی تھی۔

ہفتہ کے روز مفت موصول ہونے والے اڑھائی کلو وزنی اخبار میں سے ہم دونوں ، بیشتر اپنے مطلب کے اشتہار چھانٹا کریں۔ یکسانیت بھرے معمولات میں یہ ایک ولولہ انگیز تفریح تھی جو خالصتاً ریناکی دریافت تھی۔ ہم دونوں بے تابی سے جس کا ہفتہ بھر انتظار کرتیں۔ اس اخبار میں ہر طرح کے اشتہار ہوتے تبدیلیٔ رہائش سے لے کر ضرورت ساتھی تک اور اخلاق سنوارنے کے تبلیغی وعظ سے مخرب اخلاق بلکہ بے حیائی اور فحاشی کے زمرے میں آجانے والی فرمائشوں یا بیانات تک، سب کچھ کھلا کھلا درج ہوتا۔

پچاس سے پچپن تک کے سن کی جواں دل خواتین جو اپنے لئے ہم جو ہمراہی، رقص و موسیقی کے دلدادہ، و زندگی کی جملہ رنگینیوں سے گہری محبت رکھنے والے کسی ساتھی کی تلاش میں ہوتی تھیں۔ خاص طور پر ہمارا انشار تھیں ایسی متمول بوڑھیاں جلد احمق بن جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں ان کے رشتہ خطی ہو جانے کا ہم بطور خاص فائدہ اٹھاتیں ریناکے دکھائے ہوئے سبز باغ کے عوض دو چار۔ اے۔ ون قسم کے ڈنر تو خیر ایک اضافی شے تھے۔

اس کے علاوہ تبدیلیٔ رہائش کے اشتہارات میں نادر و نایاب اشیاء کی زیارت کے علاوہ ریناکو کبھی کبھی ایک آدھ کہانی بھی دستیاب ہو جایا کرتی۔ اس روز ہم نے جس جگہ فون کیا وہاں سکونت کی منتقلی کی بنا پر تمام اسباب و اشیاء برائے فروخت تھیں۔ میں نے نمبر ملایا تو دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

" آپ کے ہاں سب کچھ برائے فروخت ہے ..." میرا مطلب ہے گھر کا کل سامان ... "؟

" اخبار میں کیا لکھا ہے ... ؟ پڑھا نہیں ..." وہ بڑی بیزاری سے گویا ہوئی۔

" جی ہاں ۔ جی ہاں ... " میں نے گھبرا کر اثبات میں جواب دیا

" تو پھر بس اس کا مطلب بھی وہی ہے ۔ " دوبارہ اس نے ترش لہجے میں کہا۔ یا تو وہ ابھی ابھی شوہر سے لڑ کر بیٹھی تھی یا پھر کسی اور وجہ سے بھرے طیش میں تھی میں نے ریناکو آنکھ ماری۔

" پوچھو کب دیکھنے آئیں ۔ " وہ سرگوشی میں مجھ سے کہنے لگیں

" ہم آپ کے ہاں کب آسکتے ہیں خاتون ۔ ؟ رینا کا جملہ میں نے آگے بڑھا دیا۔

" شام چار سے آٹھ کے درمیان ... جب چاہو چلی آنا۔ ساتھ ہی اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

" یہ تو کوئی تڑاکا عورت ہے رینا .. " ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

" تو کیا ہوا ... " وہ بے نیازی سے چیونگم چباتے ہوئے بولی " ہم نے کون سی اس سے دوستیاں گانٹھنی ہیں۔ بس گئے اور آگئے ... " وہ اطمینان سے کشن گود میں رکھ کر صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

پورا ایک گھنٹہ ہم نے بے صبری سے ادھر ادھر ٹہلتے بارش رکنے کا انتظار کیا۔ اور بالآخر چھاتا تان کر باہر نکلے۔ بھیگتے بھاگتے گیراج تک پہنچے۔ مذکورہ مکان تلاش کرنے میں مزید نصف گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اب بارش کے علاوہ اندھیرا بھی در و دیوار پر برسنے لگا تھا۔

یہ امراء کا علاقہ تھا۔ مکان کی ظاہری حالت مرعوب کن تھی۔ طرزِ تعمیر کشادہ دریچے اور شفاف شیشوں کے عقب پھیلے مہین جالی کے پردے نہایت باترتیب باغیچے میں نفاست سے ترشی ہوئی گھاس سب کچھ خوش سلیقگی کا مظہر تھا۔ بیرونی حفاظتی جنگلے کے وسط میں لگے چھوٹے سے آہنی دروازے کو کھول کر عمارت کے صدر دروازے تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں تقریباً مکمل بھیگ گئیں۔ واپس گاڑی تک جا کر چھتری لانا اسے فراموش کر کے نکل آنے سے بھی بڑی حماقت ہوتی۔ کیونکہ اطراف میں پارک کی گئی گاڑیوں کے باعث ہمیں اپنی کار قدرے فاصلے پر روکنی پڑی تھی۔

اندر ہلکی روشنی کے قمقمے تلے بہت سے افراد جن میں اکثریت خواتین کی تھی کمروں سے گیلری اور گیلری سے پھر اگلے کاریڈور یا اوپر کی منزل کے زینے میں آ جا رہے تھے۔ گویا اشیاء کی نمائش میں گھوم رہے ہوں۔ کراکری، کٹلری۔ الیکٹرانک۔ فرنیچر، پردے۔ پینٹنگز اور سامانِ آرائش سب کچھ برائے فروخت۔ نہ جانے وہ خاتون کہاں تھی یا کون سی تھی۔ جس نے ہمارے ساتھ فون پر بات کی تھی۔ یہاں اتنے بہت سے لوگوں میں اس کی شناخت دشوار تھی۔

وسیع کمرۂ نشست کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گولائی میں پھیلے چمڑے کے صوفے پر میں اور رینا چپ چاپ بیٹھ رہے اس پر جلی حروف میں SOLD کی پرچی چپکی تھی۔

ماحول میں سجاوٹ کے انداز میں اور اشیاء میں تمول کے ساتھ نفاست اور خوش سلیقگی کے علاوہ انتخاب کا اعلیٰ ذوق بھی نمایاں تھا۔

پیچھے کچن کے کھلے دروازے میں سے کسی نے قیمت کے بارے

میں نے کہ یقین دہانی کی خاطر شاید رقم دہرائی تھی کہ جواب میں نہایت تلخ لہجے میں دوسری آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے یہ وہی آواز تھی، وہی لہجہ جو میں نے فون پر سنا تھا۔ ہم دونوں نے بھی آنکھوں میں ایک دوسرے کو بتایا اور سر نکال کر ادھر دیکھنے لگے۔

کمرۂ طعام کی وسیع میز پر خوش نما ظروف کا انبار لگا تھا۔ یوں جیسے بہت سے موتی ایک ساتھ جگمگا رہے ہوں۔ پھر وہی بڑبڑاہٹ ادھر سے نکل کر قریب آتی چلی گئی۔

"ہر چیز پر قیمت کی چٹ لگی ہے... اس کا لہجہ بے حد سخت گمبھیر بھی تھا اور آزردہ بھی۔ نزدیک سے گزری تو بو کا ایک بھبکا سا ہمیں چھو گیا۔ مجھے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ شراب کی تیز بو بھی اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ اس شرابی کیفیت میں پور پور سراپا ماتم نظر آ رہی تھی۔ اخروٹ کی رنگت کے بال جو کسی محلول میں بھیگ کر یوں چپے ہوئے تھے کہ نصف پیشانی ان سے ڈھکی تھی ہاتھوں کی دسوں انگلیوں میں دس یا شاید بارہ پندرہ انگوٹھیاں گلے میں لاتعداد طلائی زنجیریں، طلائی سگریٹ ہولڈر میں دبا خوشبودار سگریٹ، سرخ آتشیں لبوں میں دبا۔ رہ رہ کے دھواں اگل دیتا سبز مسکارے تلے دو بڑی بڑی سبزی مائل آنکھیں جو نشے کی زیادتی کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ سارا چہرہ گہرے میک اپ کی تہوں میں مستور ہونے کے باوجود بے حد تھکا تھکا، رنجور اور سال خوردہ نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کا دلنشیں زخم۔ آنکھوں کی گہری کشادگی، لمبے قد کی اٹھان اور چلنے پھرنے کے انداز میں رعب دار دھمک صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ عورت نہ تو خود کوئی عام سی عورت تھی اور نہ ہی اس کا تعلق کسی عام سے گھرانے سے تھا۔ وہ مخصوص طبقہ امرا کے افراد کا کھویا ہوا نگینہ تھی۔

آج بھی سیاہ ریشم کا لبادہ اس کے کہن سالہ جسم پر گرکھا کر نیچے گرتے ہوئے آبشار سا بنا رہا تھا جیسے کسی ترشے ہوئے مجسمے نے ریشم اوڑھ رکھا ہو۔ غلافی آنکھوں میں گو بجھتا نشہ عہد پارینہ کے اس شاندار ماضی کے کئی خاموش افسانے اپنے اندر چھپائے پھر رہا تھا کہ جب ان آنکھوں کی ایک جنبش سلطنتیں زیر و زبر ڈھانے کی قوت رکھتی تھی۔"

پھر وہ ہمارے اور نزدیک آگئی، کونے میں رکھی مہاگنی کی مضبوط الماری کا ایک پٹ کھولا تو اس کے اندر کا انتظام دا ہو کر ایک

خوبصورت سے بار کاؤنٹر کا روپ دھار گیا۔ چمکتے ہوئے نازک پیالے۔ بلور کی لمبی۔ موٹی اور چھوٹی بڑی بوتلیں۔ اس نے دو ایک مشروب یکجا کئے اور پیمانہ لبوں سے لگا کر غٹاغٹ چڑھا گئی۔ گویا مدتوں کی پیاس ہو۔

"تم نے غور کیا۔ اس کی انگلیاں کتنی حسین ہیں۔" ایناں نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ہاں بالکل موی شمعوں کی مانند..." دھیمی آواز میں۔ میں نے اس کی تائید کی۔

اشیاء فروخت ہو رہی تھیں، لوگ انتخاب کرتے اور رقم ادا کر کے رسید وصول کر لیتے۔ خاتون اس بھرپور نشے میں بھی بڑی باخبر تھی۔ کسی ننھے ہی کی مانند ایک ایک مارک دانتوں سے پکڑ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر قابلِ ذکر چیز فروخت ہو گئی۔ اب ہر طرف   کی تختی نمایاں تھی "آج مجھے یہ گھر   بند کر دینا ہے ...." وہ عہد رفتہ کا پرشکوہ کھنڈر کسی سے مخاطب تھا۔

ایڑیوں کے بل گھوم کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ در و دیوار پر حسرت سے گھومتی ہوئی اس کی نگاہیں اخروٹ کی رنگت کے بالوں کی چھت کے نیچے واپس ادھر مڑ آئیں۔ پھر اس نے ایک عجیب و غریب شرط پیش کی۔

میں آٹھ بجے تک ادھر ہی ہوں تم میں سے جو چاہے اپنا سامان لے جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بارش سے محفوظ رکھنے کو مناسب پیکنگ کر سکتا ہو۔ ورنہ کوئی چیز نہیں جائے گی۔ تمہاری رقم تمہیں واپس ہو سکتی ہے۔ روانگی کے لئے پیکنگ شرط ہے۔ انڈرسٹینڈ..! اگلے ہفتے اور اتوار کے روز بھی چار سے آٹھ بجے تک گھر کھلے گا اور میں یہیں ملوں گی جو اس روز آنا چاہے چلا آئے مگر پیکنگ کی شرط وہی ہے کیوں کہ اگلے ہفتے بھی بارش اسی طرح متوقع ہے۔"

"وہ... وہ دراصل سامان کے لئے کرائے کی ویگن کا بھی بندوبست کرنا ہو گا۔ پتہ نہیں کب ملتی ہے نہیں ملتی...."

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بولنے والے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اگلے ہفتے اور اتوار کے روز چار سے آٹھ بجے رات تک۔ اسی شرط کے ساتھ۔"

"یہ غالباً کہنا ہو گا... دراصل اس پر قیمت کی چٹ نہیں لگی"

کسی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہاں موجود لوگ اب اس کی تنک مزاجی سے خوف کھانے لگے تھے۔

" اوہ ... " اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے وہ سرخ خون رنگ خانچہ دیکھا اور قیمت بتا دی۔

" مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے بھی کوئی پسند کرے گا۔ "

" مگر یہ قیمت تو بہت زیادہ ہے۔ " پسند کرنے والی نے کہا

" تو مت لو۔ قیمت چیز کی بھی ہوتی ہے اور پسند کی بھی۔ دے سکو تو دے کر لے جاؤ۔ "

" اس سبز آنکھوں والی عورت نے بے نیازی سے شانے اچکائے

" اب چھوٹی چھوٹی اشیاء کی باری آگئی تھی، ظروف۔ معمولی سے ایک۔ چوکی یا فریم۔ خاتون نے ان کے بھی خاصے دام وصول کئے یہ الگ بات کہ اشیاء بھی اچھی بلکہ بیش قیمت ہی تھیں۔ بازار میں ان کا نرخ یقیناً بہت زیادہ رہا ہوگا۔ ایک پینٹنگ کا رنگ قدرے ماند پڑ گیا تھا اور بظاہر ایسی بیش بہا کبھی نہیں لگ رہی تھی۔ مگر یہ تبصرہ اس خاتون کو چراغ پا کر گیا۔

" مجھے اب آئیڈے ہائم (اولڈ ہاؤس) جانا ہوگا ایک ایک مارک میرے لئے بہت اہم ہے وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی

" ان پر، ان ہی چیزوں پر میں نے اپنا سب کچھ لگا دیا، محنت توانائی، شباب۔ محبتوں کے سارے دن ایک ایک لمحے کی توجہ کا نچوڑ جوانی کے وہ ایام جو لوٹ کر نہیں آتے۔ سب کے سب ان میں دفن ہیں۔ ان سے حاصل شدہ قیمت میں مجھے اب اپنا بڑھاپا کاٹنا ہے نشہ اس کے ذہن پر یقیناً گہرا ہو چکا تھا۔ لیکن آخری جملے تک آتے آتے وہ دوبارہ ہوش میں آگئی اور قدرے آنکھیں پھیلا کر اردگرد کے منظر کو دیکھنے لگی۔ اب تک شاید ماضی میں تھی اور موجودہ صورتحال سے بے خبر ہو گئی تھی۔

" آپ تو غالباً نقل مکانی کر رہی ہیں ... رینا نے لقمہ دیا۔

" کسی دوسرے شہر میں ... "

رینا کی آواز پر اس نے رخ پھیرا اور ہماری جانب دیکھنے لگی اس کی آنکھیں انگاروں جیسی تھیں جیسے دو سبز کانچ دہک رہے ہوں

" نقل مکانی ... . رینا کا کہا اس نے زیر لب دہرایا اور استہزائیہ لہجے میں بولی۔

" ہاں۔ ہاں ... نقل مکانی ہی کر رہی ہوں۔ ائیڈے ہائم (اولڈ ہاؤس) میں۔ میری بیٹی بھی چلی گئی ہے تا اپنے بوائے فرینڈ کے پاس۔ تو میں تنہا اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال اور اخراجات کیسے کر سکتی ہوں وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو کر دریچے سے باہر لگاتار برستی بارش کے لمبے لمبے دھاگے دیکھا کی ... پھر سنہرے سگریٹ ہولڈر میں دبے سگریٹ کا طویل کش کھینچا۔

" پہلے اس کے باپ نے چھوڑا جس کی خاطر میں نے شبانہ روز محنت کر کے یہ سب سجایا تھا۔ اسے ایسی ہی جنت کی تمنا تھی۔ سو میں نے تعمیر کر دی۔ لیکن وہ چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بنا اور کسی کا راز دل جانے بنا۔ اور اب بیٹی بھی چھوڑ گئی۔ ہم چپ چاپ کھڑے سنتی رہیں۔ کیا کہتیں۔ فضا میں بوجھل خاموشی تیرنے لگی تھی۔ سب کچھ جیسے گنگ ہو گیا ہو ویسے ہی جیسے مقبروں میں ہوتا ہے یا برف خانوں میں باہر اسی طرح پانی برسے جا رہا تھا اور اس کی کچھ نمی اس کی آنکھ کے سبز کانچ پر بھی بار بار نمودار ہوتی اور مٹ جاتی۔

برقی روشنی میں وہ سبز موتی ہولے ہولے سلگ رہے تھے ہم دونوں اس گرم لو میں خود کو بے بسی سے جلتا دیکھتی رہیں۔

" یہ ... یہ .. مکرامے۔ " یوں ہی فضا کو ناقابل برداشت بوجھل بنانے والے سکوت کو توڑنے کی خاطر رینا نے ایک جانب اشارہ کیا تو پہلی بار وہ عجیب یاسیت بھری ہنسی ہنس دی۔ اور جھومتے جھومتے بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر چند قدم آگے بڑھ کر بڑی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد نہایت نرم لمس کے ہمراہ اس کی سنہری زنجیریں چھونے لگی۔ بے حد آہستگی کے ساتھ جیسے اس کی شکستگی کا اندیشہ ہو۔ وہ اس کی بلوریں طشتریوں پر ہولے ہولے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جس کی شاندار تمکنت اور آب و تاب روشنی کی چمک میں نگاہیں خیرہ کئے ہوئے تھی۔

" تمہیں پسند آیا ... . " اسی خود کلامی کے سے انداز میں وہ گویا ہوئی۔ سارا وقت تم دونوں ادھر بیٹھ کر بس چیزیں دیکھتی رہی ہو مگر یہ تمہیں پسند آگیا ... پہلی مرتبہ جب میری نظر اس پر پڑی تھی تو مجھے بھی یہ ایسے ہی پسند آگیا تھا ... میں نے اسے فوراً بتا دیا کہ یہ مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ... سبز شعلے ڈھک گئے۔

ہم میں ہمت نہیں تھی کہ اسے ٹوکتے یا قیمت دریافت کرتیں ظاہر ہے وہ مکرامے ایک نایاب شے تھی ... سنہری زنجیروں اور

کرکے گلاس کی طشتریوں سے مرصع ایک اچھوتے انداز کا زمرّدیں آب
تلب لئے ہوئے وہ اس کونے میں لٹکتا ہوا طرح دار دِل نوازی کی
عجب دکھلا رہا تھا۔

لمحوں کی خاموش پُراسراریت کے بعد دوبارہ اس نے خود کو نشے
کی آغوش سے بیدار کیا اور واپس اس دنیا میں لوٹ آئی۔ اب کے
وہ بولنے لگی تو اس کا لہجہ یکسر غیر انسانی سا تھا۔

"لے لو ... لے جاؤ ... لے جاؤ ..."

"م ... م .. میں .. میرا مطلب ہے کیا قیمت ہوگی اس کی .. ؟
یوں ہی اخلاقاً ہکلاتے ہوئے رینا کے لبوں نے بمشکل یہ جملہ ادا کیا
ورنہ ایسی نوادرات قسم کی اشیاء کی نہ تو اس کی جیب متحمل ہو سکتی
نہ میری۔

"یہ .." اس کے سبز شعلوں نے یکایک آگ پکڑ لی۔ اور تھالو
کا رخ مکرامے کی سمت ہو گیا۔

اس کے دام .. جاننا چاہو گی .. یہ ساری جنّت ایک طرف ہے
جو میں نے اس کے لئے تعمیر کی۔ یہ خواب جو اس نے دیکھا اور محبت
کے خراج میں میں نے اسے تعبیر عطا کی۔ اسے پُرآسائش زندگی
پسند تھی نا۔ میں نے اپنی ہر سانس اس میں لگا دی اور وہ آسودہ
ہو گیا۔ میری محبت، محنت اور شباب کے عوض ایک بار صرف اس
نے بھی میری خواہش کا احترام کیا تھا۔ یہ اس کا تحفہ ہے۔ واحد
یادگار۔ بس ایک اکلوتی سوغات۔ تم اسے حاصل کرنا چاہتی ہو
لے جاؤ .. میں اسے مفت دے دیتی۔ مگر پھر تو یہ اہم ہو جاتا
تحفہ کہلاتا۔ عظیم اور بیش بہا۔ پُرخلوص اور محبّت آمیز۔ جب کہ یہ
نہیں ہے ..." وہ منمنائی۔

"یہ ایک حقیر چیز ہے .. بے قیمت .. لے لو۔ لے جاؤ
ایک مارک میں۔ صرف ایک مارک۔"

"وہ ہذیانی انداز میں ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔"

"یہ ہے میری قیمت ... سب دنوں کی۔ سارے خوابوں
کی، تمام جذبوں کی۔ یہی ادا کی ہے اس نے .. یہ صلہ ہے۔ ہر
شئے کا معاوضہ ... اور پھر جدائی .... وہ بغیر بتائے مونہہ پھیر
کر چل دیا .... تو یہ کیوں یہاں رہے ... یہ تم لے لو۔ مجھے اب
لنڈے بائم جانا ہے ..."

یکایک وہ شدید غضب ناک دکھائی دینے لگی۔

"لاؤ نکالو ... ایک مارک۔" رینا نے خوفزدہ ہو کر پرس
کھولا اور ایک مارک نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

"ایک مارک ... ہاہاہا .... ایک مارک .... ہی ہی ہی۔
ایک مارک ... "

وہ بے تحاشا ہنستی چلی گئی اور مکرامے کھونٹی سے اتار کر ہمیں
تھما دیا۔

باہر مسلسل تیز برستی بارش کی پرواہ کئے بغیر اور معقول پیکنگ
کی شرط سے بے نیاز ہو کر۔ ❁

بقیہ صفحہ ۲۳ کتاب

سخت بحث و مباحثے، گواہوں کے بیانات اور حالات کے
بغور جائزہ کی روشنی میں عدالت نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ کوئی کتاب
کسی کے کتب خانہ میں شامل تو ہو سکتی ہے۔ کسی کے مطالعہ گاہ
میں جگہ تو پا سکتی ہے۔ کسی کے وقت میں شریک تو ہو سکتی
ہے لیکن کسی کی شریک حیات کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

کتاب کا ایک ایک ورق خزاں رسیدہ پتوں کی طرح فضا
میں بکھر گیا۔ اس کی وقعت ان کتابوں سے بھی کم تر ہو گئی، جو گلی کوچوں
سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر ایک چوتھائی قیمت میں فروخت
ہوتی ہیں۔ ❁

آپکی مدّتِ خریداری اس شمارے کیساتھ ختم ہو رہی ہے

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ آپکی مدّت خریداری اپریل ۹۶ء کے
اس شمارے کیساتھ ختم ہو رہی ہے۔ نئے سال مئی ۹۶ء تا
اپریل ۹۷ء کیلئے اپنا زرِ تعاون ارسال کر کے ممنون کیجئے۔

آپکی طرف شاعر کے بقایاجات

○ اگر اس دائرے میں سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ آپکا زرِ سالانہ
کے شمارے کیساتھ ختم ہو گیا تھا۔ ازراہِ شاعر نوازی اپنے
بقایاجات اور خاص نمبر (جلد اوّل) کی رعایتی قیمت
جلد از جلد ارسال کیجئے۔

محمود شاہد
P.O. BOX NO. 10982
AL - MUBARRAZ
AL AHSSA 31982
K.S.A.

کتاب

ویسے تو کالج کے کتب خانہ میں نئی نئی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کتب خانہ میں سائنسی، ادبی، تاریخی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور فلسفہ، منطق اور فنون سے متعلق کتابیں کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن اس سال جن کتابوں کا اضافہ ہوا ہے ان میں سے ایک کتاب نے سارے کالج کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی ہے۔ کالج سے باہر بھی اہل ذوق میں اس کا شہرہ تھا۔ خصوصاً علمی و ادبی حلقوں میں کتاب موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی۔ رنگین و جاذب نظر سرورق، نفیس و روغنی قرطاس، خوبصورت و دیدہ زیب طباعت۔ اس کی ترتیب و تہذیب میں بے مثال حسن کار فرما تھا صوری و معنوی دونوں اعتبار سے اس کی منفرد حیثیت اور علیحدہ پہچان تھی۔

چوں کہ کتاب ادب سے تعلق رکھتی تھی اس لئے ادبیات کے طلباء و اساتذہ کو اس کی قربت میسر آگئی تھی۔ خصوصاً اساتذہ بے حد مسرور تھے کہ بے جان کتابوں کے درمیان ایک زندہ کتاب ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

کتاب اپنے مزاج کے اعتبار سے سیکولر اور سوشل واقع ہوئی تھی اور ظاہر پرستی کے جذبے نے اس پر سے سارے حجابات اٹھا دیئے تھے۔ اس کی تحریر میں جگہ جگہ روایت کی دھجیاں اڑائی گئی تھیں۔ اس کے خیال میں ہماری روایتی قدریں، اصول اور ضوابط ترقی یافتہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ جدیدیت کی حامی اور حریت پسند تھی۔ اس کے اسلوب اور طرز ادا کی وسعت اور کشادگی پڑھنے والے کو ایک جہانِ دیگر میں پہنچا دیتی تھی زبان کی شیرینی و گدازیت دلوں کو موہ لیتی تھی۔ لہجہ اتنا مانوس اور اپنائیت سے لبریز کہ قاری ورق در ورق پڑھنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا

کتاب کی انہیں خوبیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اساتذہ اس کے قریب آنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ہر استاد چاہتا تھا کہ وہ کتاب سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو۔ کچھ اساتذہ نے یہاں تک سوچ لیا تھا کہ کتاب کو اپنے ذاتی مطالعہ گاہ میں پہنچا دیں۔ ایک انار سو بیمار کی سی صورتِ حال تھی۔

کتاب کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور بہت کم عرصہ میں کتاب مقبولیت کی چوٹیوں پر جلوہ افروز تھی لیکن اس شہرت اور مقبولیت کے بطن سے ہزاروں افواہیں بھی جنم لے چکی تھیں اور ان افواہوں کی دھند میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ پروفیسر ایاز کی مقناطیسی شخصیت کتاب کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور دونوں میں ربط و تعلق قائم ہو چکا ہے۔ کتاب اور پروفیسر ایاز دونوں کے مزاج، انداز فکر اور طرز حیات میں غیر معمولی آہنگ اور مناسبت تھی۔ دونوں کا ایک دوسرے میں دلچسپی لینا کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔

کئی دنوں تک افواہوں کی صحت و عدم صحت کے متعلق کئی باتیں منظر عام پر آتی رہیں۔

کتاب اور پروفیسر ایاز نے سخت لہجہ میں ان افواہوں کی تردید کی اور کہا کہ چوں کہ دونوں ایک ہی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے ان کا ایک دوسرے کے قریب آنا فطری امر ہے ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی تھی کہ یہ تعلقات پیشہ ورانہ تھے یا جذباتی یا محض وقتی۔ افواہوں کو اس وقت تقویت ملی جب یہ خبر عام ہوئی کہ پروفیسر ایاز نے کتاب کو اپنے ذاتی مطالعہ گاہ میں پہونچا دیا ہے اور اس اقدام میں خود کتاب کی مرضی بھی شامل تھی اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کتاب خود اپنی مرضی اور

خواہش سے پروفیسر ایاز کے مطالعہ گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ پروفیسر ایاز نے دانستہ مطالعہ گاہ کا دروازہ کھلا رکھ چھوڑا تھا۔ یہ سچ ہے کہ قاری کے بغیر کتاب کا وجود بے معنی ہوتا ہے۔ اور قاری اور کتاب ایک دوسرے کے ذوق و شوق اور جذبے کی تسکین کے لئے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ ایک کتاب جو برسوں ایک ہم خیال و ہم مزاج قاری کی تلاش میں سرگرداں رہی تھی۔ اسے اپنے ہی رنگ اور روپ کا ایک قاری مل گیا تھا۔

کچھ کتابیں بس کی قطاروں، ریلوے پلیٹ فارموں اور ہوائی اڈوں کے انتظار گاہوں میں بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے اور چلتے چلتے بھی پڑھ لی جاتی ہیں۔ لیکن اس کتاب کا شمار ان کتابوں میں تھا جنہیں پڑھنے کے لئے مکمل تنہائی، مکمل خاموشی اور مکمل یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک کتاب کے ظاہری حسن و جمال سے محظوظ ہوتا رہا تھا۔ ابھی کتاب کھول کر پڑھنے کا مرحلہ نہیں آیا تھا اس کے دل میں شدید خواہش موجزن تھی کہ سر ورق الٹ کر کتاب کی پہلی سطر پر اپنی انگلی رکھ دے۔

غیر محسوس طور پر کتاب اپنا کام کر رہی تھی۔ پروفیسر ایاز کی شخصیت اور اس کے حواس پر کتاب کے گہرے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ آخر وہ نازک وقت آ ہی گیا جب پروفیسر ایاز نے تمام اندیشوں اور خدشات کو بالائے طاق رکھ کر کتاب کی پہلی سطر پر اپنی انگلی رکھ ہی دی۔ کتاب کو بھی اسی وقت کا انتظار تھا وہ رشتہ کی خارجی حیثیت سے مطمئن نہیں تھی وہ چاہتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے وجود میں گھل مل جائیں۔ اور پروفیسر ایاز کے اس عمل نے دونوں کو ایک گرہ میں باندھ دیا تھا۔ کتاب کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا تھا وہ غیر یقینیت اور عدم تحفظ کے عالم سے نکل کر یقین و استحکام کی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔

پروفیسر ایاز نے باقاعدہ کتاب کے مطالعے کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ روز و شب کتاب کی گہرائیوں اور وسعتوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ کبھی کوئی شیریں لفظ اس کے ہونٹوں سے چمٹ جاتا کبھی کوئی خوبصورت جملہ اس کی باہوں میں اپنی باہیں ڈال دیتا کبھی کوئی حسین علامت اسے اپنی پہلو کی وسعتوں میں بھر لیتی کبھی کوئی نازک تشبیہ اس کے ہوش اڑا دیتی کبھی کوئی خفیف سا کنایہ اسے ایک عالم نو میں پہنچا دیتا۔ کبھی کوئی دلکش واقعہ اسے مسحور کر دیتا کبھی کوئی پر فریب منظر اسے اپنے آپ سے بے خبر کر دیتا۔ اس پر بوطیقیت کے ہزاروں سربستہ راز افشا ہوتے چلے گئے جن سے وہ ابھی تک ناواقف تھا۔

کتاب پروفیسر ایاز کی ناگزیر داخلی ضرورت بن گئی تھی کتاب کے مطالعے کے بغیر وہ قلبی اضطراب اور اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ جب تک ایک آدھ صفحہ نہ پڑھ لے اسے سکون و قرار نہیں ملتا تھا۔ اس نے کتاب کو اوّل تا آخر کئی بار پڑھ ڈالا تھا کتاب کا کوئی گوشہ اور کوئی صفحہ اس سے نہیں بچا تھا۔

کئی سال تک کتاب پروفیسر ایاز کے زیر مطالعہ رہی لیکن کچھ دنوں سے کتاب کے تئیں اس کے رویّہ میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ اب وہ کبھی کبھار ہی بے دلی سے کتاب کا ایک آدھ صفحہ الٹ لیا کرتا تھا اور آہستہ آہستہ اس کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اب تک فریب کا شکار رہا ہے۔ مطالعہ کے جوش میں وہ عیب و ہنر میں تمیز نہیں کر سکا تھا۔ بے معنی اور گنجلک تحریر، غیر موزوں اور بے ترتیب الفاظ، متضاد خیالات، ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوئے افکار، پر لغو مضامین، بے بنیاد واقعات، غیر فطری اور پر تصنع انداز بیاں۔ ظاہری طور پر کتاب جتنی مکمل جامع اور با معنی نظر آتی تھی باطنی طور پر اتنی ہی نامکمل، بے ترتیب اور مہمل ثابت ہوئی تھی اس نے کتاب سے کنارہ کشی کا ارادہ کر لیا تھا۔

پروفیسر ایاز خاموشی سے کتاب کو واپس کالج کے کتب خانہ میں پہونچا دینا چاہتا تھا جہاں سے وہ اسے اٹھا لایا تھا اور جب کتاب کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پاگل شیرنی کی طرح بپھر اٹھی اس کی ساری وحشت، ساری سفاکی اور ساری دیوانگی امڈ آئی۔ اور اس نے پروفیسر ایاز کے مطالعہ گاہ سے نکلنے انکار کر دیا اور جب اس نے دیکھا کہ پروفیسر ایاز اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کے درپے ہے تو اس نے پروفیسر ایاز کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور بھری عدالت میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ پروفیسر ایاز کی شریک حیات کہلانے کی حق دار ہے۔ لیکن پروفیسر ایاز نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا

مقدمہ کی کارروائی پیچیدہ مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔

تخریب

شورشِ تخریب میں ہے عقلِ انساں کی خراب
آب تا دوں میں تجھے تخریب کا لبِّ لباب
رازِ بربادی نئی تہذیب نے سمجھا نہیں
علم اور ادراک ابھی اس کا ہے محدودِ کتاب
جتنی فانی لذتیں ہیں اس جہانِ خواب کی
انحطاط ان کا نتیجہ ہے، مآلِ ان کا عذاب
محترز انسان اگر لذاتِ ناقص سے ہے
ہو رہا تیدِ فنا سے مثلِ ماہ و آفتاب
کامیابی فی الحقیقت آرزو کی موت ہے
ہے وہی ناکام جس کی آرزو ہے کامیاب
کامگاری ہی بہ الفاظِ دگر تخریب ہے
حاصلِ ہر لذتِ نفس و نظر تخریب ہے

[کارامروز]

مئی سنہ ۱۹۹۶ء

عین رشید

بیمار گڑیا-۲

خاموش دوپہر کی کوئی چلچلاتی دھوپ
پگڈنڈیوں میں دوڑنا اس کو بھلا لگے
اس کو لگے کہ سب کا بھلا ہوگا ایک دن
وہ کیوں نہ اس خوشی میں ستارے ہی توڑ لے

● لـ-۱-۲۸، گریہ ہاٹ روڈ ہاؤسنگ اسٹیٹ، کلکتہ-۳۹

گلناز

ایک نظم

کہکشاں لانگ کے، اس پار اگر
اپنے "شنتوری" ستارے سے کوئی بات کروں؟
تہ بہ تہ پھیل کے آفاق کی پرتیں
کیسے پہنچے گی وہ افلاک کے اس پار بھلا؟
صدیاں لگ جائیں گی، خاموش خلاؤں سے گذرنے میں اسے!
اور "بلیک ہول" سے بھی اس کو اگر جانا پڑا،
نون کے نقطے سی رہ جائیگی 'بلیک ہول' گذر کے!
کیا وہ سمجھے گا؟ میں سمجھاؤں گا کیا؟

● بوسکیانا، پالی ہل - باندرہ، بمبئی-۴۰۰۰۵

تارا چرن رستوگی

بیرو باری گوہاٹی ۔ ۷۸۱۰۱۶ (آسام)

بنام مدیر مکتوبات ایک موضوع

اردو صحافت کی تاریخ نگاری پر تو دو چار کتابیں شائع ہوئی ہیں اور کبھی کبھی مضامین بھی رسائل و جرائد میں نکلتے ہیں مگر ایک نقطۂ نظر جس کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے ، وہ چھپنے والے " مکتوبات بنام مدیر " کے موضوع سے اجتناب ہے ۔ اردو صحافت میں ادبیاتی صحافت کے مشتملات کا غائر مطالعہ دیکھنے میں نہیں آتا ۔ یہاں میں شاعر کے مکتوبات کے حوالے سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں ۔

اردو کے ادبیاتی جریدوں کی نوعیت کا بغور مطالعہ ان کو کئی اقسام کے تحت پیش کرتا ہے جو حسب ذیل ہیں ۔

(۱) سرکاری جریدے : آج کل (دہلی) نیا دور (لکھنؤ) تعمیر ہریانہ (چنڈی گڑھ) پاسبان (چنڈی گڑھ) ہندستانی تناظر (دہلی) وغیرہ

(۲) اکاڈمیوں کے رسائل : زبان و ادب (پٹنہ) ایوانِ اردو (دہلی) جمنا تٹ (چنڈی گڑھ) صبا برنامہ (احمد آباد) روحِ ادب (کلکتہ) اکادمی (لکھنؤ) نخلستان (جے پور) امکان (بمبئی)

(۳) دبستانی جریدے : جامعہ (دہلی) فکر و نظر (علی گڑھ) اسلام اور عصر جدید (دہلی) کتاب نما (دہلی) اور مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں سے شائع ہونے والے مجلّے ۔

(۴) شخصی رسائل : شاعر ، شگوفہ ، شب خون ، سوغات ، ذہن جدید ، گلبن ، اسباق ، انشاء ، سہیل (گیا) وغیرہ

مطالعہ اور تجزیے سے ماخوذ حقیقت جو نتائج پیش کرتی ہیں ان کی تلخیص یوں بیان کی جا سکتی ہے ۔ سرکاری رسالے بالعموم خالص ادبیاتی نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ ان کو اپنی برسرِ اقتدار سرکار کا ترجمان کہنا غالباً زیادہ صحیح ہوگا ۔ مثلاً : تعمیر ہریانہ ، اور پاسبان کے نام ہی مشمولات کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔ نیا دور (لکھنؤ) اور آج کل (دہلی) سرکاری جریدے ہیں اس کی پاسداری بھی کرتے ہیں اور ادب بھی پیش کرتے ہیں ان دو رسائل کے خصوصی شمارے اور خاص نمبر اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان رسائل کے مکتوبات کو نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ترتیب دیا جانا ضروری ہوتا ہے ۔

نیا دور (لکھنؤ) نے کئی ضخیم خصوصی نمبر شائع کئے ۔ فراق نمبر (دو جلدیں) دیا نرائن نگم نمبر ، منشی نول کشور نمبر ، یادرفتگاں نمبر یہ ہر اعتبار سے اہم و معیاری نمبر ہیں ۔ ان خصوصی نمبروں کے بعد کے شماروں میں قارئین کے تاثرات پر مبنی خطوط بھی نکلے ۔ معلوم یہ ہوتا ہے چونکہ تمام تر مراسلے توصیفی نوعیت کے تھے ، یا انتقادیاتی نکات پر ، مرکوز مکتوبات کو عمداً در خورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا ہوگا کسی مکتوب میں یہ نہیں تھا کہ اس نمبر میں یہ کمی کھٹکتی ہے ۔ مثال کے طور پر فراق کی شاعری کا ارتقاء فراق اور نیاز فتح پوری فراق اور جعفر علی خاں اثر لکھنوی وغیرہ پر مضامین بھی ہوتے تو فراق نمبر کی آب و تاب میں مزید اضافہ ہو جاتا ۔

دیا نرائن نگم (مدیر زمانہ) کو اگر معاصر مدیران کے تعلق سے بھی موضوع بنایا گیا ہوتا تو نمبر اور بھی افتخاری ہو جاتا ۔ منشی نول کشور نمبر میں بھی یہ کمی ہے ۔ آخر کسی مکتوب نگار نے تو لکھا ہی ہوگا کہ منشی نول کشور اور لاہور کے معروف پبلشر گلاب سنگھ کا موازنہ بھی مشمولات کو وقیع تر بنا دیتا ہے ۔

وہ رسالے جن کو تجارت پیشہ صحافی نکالتے ہیں ۔ ان میں شمولہ مکتوبات ، مدیر کی تعریف و توصیف پر مبنی ہوتے ہیں مزید

بنام مراسلہ نگار اردو کا معاملہ یوں نظر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک رسالے کا یہ منفرد مراسلہ نگار جو بعد میں شمع کا بہت معروف کالم
نگار بنا۔ کیوں کہ ان کے ملفوظات غیر متوقع طور سے بہت کم ہیں نے کسی مضمون میں کچھ کہا تھا۔ ویسے رسالوں میں مدیران کی تعریف و توصیف ہی وہ
معیار ہے جس پر مکتوبات پرکھے جاتے ہیں اور شایانِ اشاعت کئے جاتے ہیں۔ بہت کم شاعر بھی کسی ادارے کا ترجمان نہیں ہے مگر میرا
یہ ابتک ایک نصب العین کا ترجمان رہا ہے جس کو اس مخصوص دانش پذیر کلمے عبارت سمجھنا ضروری ہے جس کو دبستانِ آگرہ
سے موسوم کیا جاتا ہے۔ [illegible] تاریخ اردو میں دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ ہی اردو کے دو محور تصور کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر یہ
یہ تصور صحیح نہیں۔ میرا مطالعہ و تجزیہ دلی، لکھنؤ، اکبرآباد، عظیم آباد، روہیل کھنڈ اور انتزاعِ مغلیہ سلطنت کے بعد لاہور کے دبستانوں
پر مشتمل مختصات و خدمات پر استوار ہوتا ہے جو علیحدہ موضوع ہے مگر اس کا ذکر اس لئے ناگزیر ہو گیا ہے کیوں کہ شاعر، اکبرآباد (آگرہ)
کے نصب العین کو چشم نشیں سمجھتا ہے۔ آگرہ سے بمبئی تک اس کا نام قصرالادب ہے۔ قصرالادب کا پرچہ شاعر اب تیسری پشت میں ہے
تیسری پشت ہے اردو کی حنابندی میں۔

اردو کی حنابندی قصرالادب کا نصب العین رہا ہے اور نصب العین کی کامیابی کے لئے رابطے کا استوار کرنا بہت ضروری ہے شاعر
میں شائع ہونے والے مکتوبات ہی کے ذریعے اس رابطے کو فعال و کارآمد رکھا جا سکتا ہے اس ضمن میں ایک یاد کے نقوش جو دل و دماغ میں ابھرے
ہیں ان کا ذکر برمحل ہی ہوگا بالخصوص اس لئے کہ اس سے موضوع پر مزید روشنی پڑے گی میرے ہیوٹ پارک (آگرہ) کے دوست اعجاز صدیقی
مرحوم شاعر کے مدیر تھے۔ ۱۹۷۷ء سے کچھ پہلے یا بعد کو کرشن موہن کا ایک مکتوب شاعر کے ایک شمارے میں شامل تھا۔ مکتوب ہذا میں کرشن
موہن نے لکھا تھا کہ اعجاز صدیقی فارسی نہیں جانتے۔ اسی لئے انہوں نے "قابلِ گردن زدنی" لکھا ہے جب کہ یہاں "قابل" کا اضافہ بے کار
محض ہے۔ واقعی روا روی میں اعجاز کے نوکِ قلم سے لفظِ قابل در آیا تھا، مگر میں درآں حالیکہ اداریہ پڑھ چکا تھا۔ مجھے غلطی نظر نہیں آئی
اور اگر آتی بھی تو میں سمجھ لیتا کہ "قابل" نادانستہ ہی تحریر ہو گیا ہوگا۔ اعجاز صدیقی اردو کے اہم شاعر ہیں اور ان کی فارسی دانی بلا شک
و شبہ معیاری تھی۔ مرحوم نے کرشن موہن کا خط مکتوبات میں شامل کیا اور کوئی وضاحت نہیں کی۔ اس پر میں نے اعجاز کو لکھا تھا ——
کہ مکتوب ہذا کو شامل نہ کرتے تو کیا حرج تھا۔ جواب معیاری ملا کہ رستوگی بھائی سوال اردو کا ہے کم از کم فارسی سے ناواقف اردو قلم کاروں
کو غلطی سے واقفیت تو ہو جائے گی میری نااہلیت کا سوال نہیں ہے اعجاز کا مشہور شعر ہے۔

دیکھنا ہے کون اب کس کا اڑاتا ہے مذاق + وقت سنجیدہ ہے لیکن لوگ سنجیدہ نہیں

اعجاز وقت کی سنجیدگی، مسائل اردو کی سنجیدگی، اور قارئین کی سنجیدگی کو بجا ہی سمجھتے تھے۔ اس خط کی شمولیت سے شاعر میں
مشمولہ مکتوبات کی غرض و غایت وغیرہ پر وافر روشنی پڑتی ہے۔

—— ایک اور گفتگو کی یاد کے نقوش اپنی ذہن پر ابھر آئے۔ ایک دفعہ مرحوم نے
مدیر شاعر کے بنام آئے ایک مکتوب کو پڑھ کر سنایا۔ ملحوظ رہے اس زمانے میں سیماب مرحوم شاعر کے مدیر تھے۔ مکتوب مذکورہ میں نیاز
فتح پوری پر تنقید کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ عادی، ردیہ، تنقید جیسے اردو میں مروجہ الفاظ کا استعمال غلط کہنے والے نیاز فتح پوری کا خبطِ
دماغ پوری وضاحت سے ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ "نگار" میں ایسی بے تکی باتیں لکھنے سے یہ الفاظ اردو بدر نہیں کئے جا سکتے۔ رہائش،
پیدائش، عادی، ردیہ، تنقید وغیرہ الفاظ اردو کے اپنے الفاظ ہیں، خلفشار اردو لغت ہے۔ درآں حالیکہ فارسی میں اس کا وجود
نہیں ہے سیاق و سباق یہی ثابت کرتے ہیں کہ نیاز صاحب اردو کے مزاج و آہنگ سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ مکتوب میری رائے میں بہت
اچھا تھا۔ اعجاز مرحوم نے بتایا کہ اس مکتوب کو اس لئے شایانِ اشاعت نہیں سمجھا گیا کیونکہ مکتوب نگار مشہور و معروف نہ تھے اس کی
شمولیت سے نیاز صاحب یہ کہہ سکتے تھے کہ مکتوب کو مدیر شاعر ہی نے تحریر کیا ہوگا۔ کچھ بھی ہو، اس واقعے سے صحافتی اخلاق کی
مثالی پاسداری کا ثبوت مستنبط ہوتا ہے۔

بنام مدیر مکتوبات ایک [illegible] دلچسپ موضوع ہے۔

کرشن کمار طور

اس دنیا میں خود کو ایسے شامل کیا
چاند اُدھر ڈوبا، اِدھر ہم نے نمود کیا

سادہ بدن میں اک بجلی سی کوند گئی
اس نے آنکھیں کھولیں دل نے سوال کیا

لب پر لفظ کی خوشبو کب تک رکھو گے
ہم نے اس سے اکثر یہی سوال کیا

اک کندن سا سارا جسم دمکتا ہے
اس کے ہجر نے میرا یہ کیا حال کیا

اپنے آپ کو زندہ رکھا ہر صورت
ہم نے اس سے بچھڑ کر یہ بھی کمال کیا

میں قطرے سے بحر ہوا، ذرّے سے سورج
جب بھی دنیا نے مرا جینا محال کیا

اک گلزار کھلایا اپنے ہی اندر
میری انا نے طور یہ کیسا کمال کیا

● ای/۱۳۲، کھنیارا، دھرم شالا - ۱۷۶۲۱۵ - ہماچل پردیش)

کرشن ادیب

چیخ رہی ہے سر پہ میرے آج سفر کی رات میاں
خود کو تنہا کیوں میں سمجھوں، ساتھ خدا کی ذات میاں

دل ہے بے آباد جزیرہ، اب تو اپنا برسوں سے
یاد نہیں کب اُتری اِس جا خوشیوں کی بارات میاں

تیرے ساتھ جو گذرے پل تھے یاد مجھے یوں آتے ہیں
سپنے جیسے سُندربن میں جوں برسے برسات میاں

بے دردی سے خرچ چکا میں جیون کی انمول متاع
سانسوں کی یہ پونجی اب کنجوس کی ہے خیرات میاں

اکثر اکثر سچ بھی اس کے مجھ کو جھوٹے لگتے ہیں
اور کبھی تو جھوٹ بھی اس کے لگتے ہیں سوغات میاں

روزِ ازل سے ایک اداسی دل میں ہر دم رہتی ہے
وارث، غالب، میر، ادیب غم کی ایک ہے ذات میاں

● ای-۸۹ کچلو نگر، لدھیانہ ۱۴۱۰۰۱ (پنجاب)

عنبر بہرائچی

کھلے بادباں دل سمندر ہوا
وہ خوش پیرہن آسماں بھر ہوا
وہی ایک لمحہ تھا اظہار کا
تضاد در تضاد وہ معطّر ہوا
منجیرے ہر اک سمت بجنے لگے
مری دسترس میں وہ پیکر ہوا
بچھڑتے ہوئے مسکرایا تھا وہ
سنہرا ہیولیٰ مقدر ہوا
چنبیلی کے گجرے برسنے لگے
وہ کیا مرا خواب ششدر ہوا
وہ پہلے فقط جنگلی پیڑ تھا
مری قربتوں میں صنوبر ہوا
وہ اب کے مری سمت بھی چل پڑا
مرا دشت بھی شوخ منظر ہوا
مری آنکھ میں ریت آ کر گری
سکوں ایک پل جو میسر ہوا
گئی رات آنکھوں میں بادل آ گئی
غزل پاش پھر آج عنبر ہوا

● ۱۰ شیام کرپا، وندر دھوپور، علیگڑھ

انیل ٹھکر

[illegible] ۵۸۰۰۳۲

کریلا اور نیم چڑھا

سواری نے نیچے اتر کر کرایہ ادا کیا۔ کرایہ کی رقم جیب میں رکھ کر اس نے ٹیکسی کا میٹر اوپر کی طرف گھمایا۔ تبھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے رسیور اٹھایا۔ دفتر سے ہدایت سن کر اس نے بے دلی سے آگے کے سرکل پر ٹیکسی کو موڑا اور دیوان آوینیو DEWAN AVENUE جانے والی سڑک پر ہو لیا۔

فون پر DEWAN AVENUE کا نام سنتے ہی اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ موڈ خراب اس لئے نہیں ہوا کہ وہاں کی سڑک خراب تھی۔ گلیاں تنگ تھیں یا وہاں جانے میں کوئی خطرہ تھا۔ اس کا جی اس لئے اداس ہو گیا کہ جہاں جانے سے وہ ہمیشہ کتراتا رہا ہے۔ آج ایک بار پھر اسے اسی راہ سے گزرنا ہوگا۔

ہر ملک، ہر شہر، ہر سڑک اور گلی محلّے کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے اپنا ایک مزاج ہوتا ہے امریکہ کے شکاگو شہر کے DEWAN AVENUE کا اپنا ماحول ہے۔ اپنا ایک مزاج ہے جو اپنی انفرادیت کی بدولت پورے امریکہ اور شکاگو شہر کے ماحول اور مزاج سے بالکل مختلف ہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی، سال میں دو چار بار کسی سواری کو چھوڑنے یا کسی کو آتا کی طرح لینے کے لئے وہاں جا کر اسے اس ماحول کو جھیلنا پڑتا تھا۔

احاطہ من سے ٹیکسی چلاتے ہوئے DEWAN AVENUE کے علاقے میں داخل ہوا تو۔ اس کی نظر سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے پر لٹکے ہوئے بورڈ پر پڑی۔ بورڈ پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا محمد علی جناح روڈ ۔۔

بورڈ پڑھتے ہی ... [illegible] ... آنکھوں میں کہیں بکھرے ہوئے منظر جیسے جھلک گئے ... جیسے چھت سے ٹپکتے ہوئے کیچڑ سے برسات [illegible] پھر لوٹ آیا ہو۔

سڑک پر لوگوں کی چہل پہل نہیں کے برابر تھی۔ اطراف کے مکان خاموش اونگھتے سے نظر آ رہے تھے۔ اکثر مکانوں میں چھوٹے موٹے دفتر تھے۔ اندر کام کرنے والوں کے دماغ کی ہلچل باہر سنّاٹا بن کر چھا رہی تھی۔

جب انسان کے ذہن میں ہلچل مچتی ہے تو اس کے اطراف سنّاٹا چھا جاتا ہے۔

اس کے اطراف سنّاٹا چھا گیا اس کے ذہن پر نعروں کی گونج ابھرنے لگی۔

ہزاروں کا ہجوم۔ ہاتھوں میں جھنڈے اور لاٹھیاں لئے ہوئے لوگ۔ لبوں پر ایک ہی سر۔ ایک ہی آواز۔ جس آواز میں اس کی آواز بھی شامل تھی۔ سمندر کی دہاڑ میں بوند بھی گرج رہی تھی۔ اٹھی ہوئی آندھی میں، ذرّے کی طرح زمین سے اٹھ کر وہ بھی حاکموں کے سر چڑھ کر بلند آواز میں بول رہا تھا۔

نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔

ہجوم کا ہر شخص، اپنے آپ کو ہجوم سمجھ رہا تھا۔

یک بیک سُر ٹوٹ گیا۔ آواز بکھر گئی۔ ہجوم تتر بتر ہونے لگا۔ بھیڑ میں بھگدڑ مچ گئی۔

گھوڑ سوار پولیس نے جلوس کو چاروں طرف سے گھیر کر لاٹھیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ بھاگنے کے لئے اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ لاٹھی کے وار نے زلزلے کے مانند اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔

ذہنی زلزلے سے گھبرا کر وہ نہاں خانۂ دل سے باہر نکل آیا۔۔۔

آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ ٹیکسی کے اسٹیرنگ پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور جلد از جلد اس ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا، اس ماحول

[illegible] تھا
[illegible] بند ہو جاتا۔
اسے [illegible]
پھانسی [illegible]
سے [illegible] یادیں فوراً
جاگ گئیں۔

بٹوارے کا اعلان ہو چکا تھا۔ بھڑکانے اور اکسانے والے بیانوں کی سرخیوں سے اخبار لبریز ہو رہے تھے۔ لوٹ کھسوٹ اور قتلِ عام کا بازار گرم تھا۔

اس کے لئے یہ فیصلہ کن گھڑی تھی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا۔ وہ ہندوستان میں رہے گا یا پاکستان جائے گا! پاکستان کے لئے اس نے جدوجہد کی تھی۔ لاٹھیاں جھیلی تھیں۔ پاکستان یعنی دینِ الٰہی۔

مگر پاکستان میں رہنا ہے تو اسے اپنا وطن چھوڑنا ہوگا۔ یار برادروں سے بچھڑنا ہوگا۔ کتنے رشتے توڑنے ہوں گے۔ ہجرت کرنی ہوگی۔

وہ پاکستان کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ وہ ہجرت کرے گا۔

اس نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اقلیت بن کر دوسروں کی غلامی نہیں کرے گا وہ اکثریت کا جزو بن کر اسلامی ماحول میں سانس لے گا۔ جہاں کلمے کا نظام قائم ہوگا۔

فیصلے کا اعلان سن کر اس کے والد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ والدہ پر غشی کے دورے پڑنے لگے اور بیوی کا حال تو اس کبوتر جیسا تھا جس کو بلی نے دبوچ لیا ہو۔

والد کی زبان جب کھلی تو انہوں نے بہت ڈانٹا پھٹکارا لعنت ملامت کی۔ ہاتھ جوڑ کر اس حرکت سے باز آنے کے لئے کہا۔ والدہ نے بلک بلک کر اپنا برا حال کر لیا۔ اس نے پچکارا دلارا [illegible] اپنے بزرگوں کی قبروں کا واسطہ دیا۔ اور بیوی نے [illegible] تھرتھراتے ہوئے چپ سادھ لی مگر وہ [illegible]
[illegible] ہجرت کا وقت آ گیا۔ گھر میں اتنا کچھ ہو چکا

[illegible]
[illegible] دیوار میں [illegible]
اور [illegible]

وہ بیوی بچے کے ساتھ [illegible] وکٹوریہ میں سوار ہوا۔ کوچوان نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا۔ گھوڑا [illegible] وکٹوریہ کے چلتے ہی، جسم [illegible] کا تناؤ ڈھیلا پڑنا اور اس [illegible] مکانوں کو پیچھے چھوٹتے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے [illegible] کو ہمیشہ [illegible] چھوڑے جا رہا ہے

اس نے سر کو جھٹکا دیا اور [illegible] گیا۔

وکٹوریہ کوچے کا موڑ مڑی اور بھنڈی بازار کی بڑی سڑک پر آ گئی۔ بھنڈی بازار بھی جاگا نہیں تھا ویسے وہ اونگھ بھی نہیں رہا تھا۔ نیم خوابی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اکا دکا لوگ فٹ پاتھ پر نظر آ رہے تھے۔ دکانیں بند تھیں مگر ہوٹلوں کا کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ پکی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپ سریلا ماحول پیدا کر رہی تھی۔

اس نے دیکھا، بادشاہی ہوٹل کے بغل کی پان بیڑی کی دکان تکارام کھول چکا تھا اور بھگوان کی تصویر کو اگربتی کا دھواں دے رہا تھا۔ وہ تکارام کی دکان سے ہی تمباکو خرید کر کھاتا تھا۔ اس کے جی میں آیا، آج آخری بار اپنا پسندیدہ تمباکو کھا کر، تکارام سے دعا سلام کرتے جائے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا فٹ پاتھ کو دیکھتا رہا۔

اس نے پیچھے سرکتے فٹ پاتھ کو دیکھا تو یاد آیا لڑکپن میں وہ بستہ اٹھا کر روزانہ اسی فٹ پاتھ پر سے گزرتا ہوا اسکول جایا کرتا تھا۔ اتوار کو کاندھے پر ہنومان کی گدا کی طرح بیٹ اٹھا کر اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے آزاد میدان بھی وہ اسی فٹ پاتھ پر سے چل کر جایا آیا کرتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں تو شام ہوتے ہی اس فٹ پاتھ کا [illegible] نکلتا تھا رات دیر گئے تک ان فٹ پاتھوں پر روشنی سے جگمگاتے کھوے سے کھوا چھلتے ہوئے بازاروں میں وہ اور اس کے

[illegible] ہاتھ شکر ادا کرتے ہیں . . . .
وہ ہنستے آؤ پھر کر، وکٹوریا کی پشت پر بیٹھ کر تھکن اتار کر بیٹھیں چند گھڑیں۔ وکٹوریا کے ہلکے ہلکے ہچکولے اور یاں سستانے لگے۔
اور وہ اپنے خوابوں کو سہلانے لگا۔

کیا لوگ رہے ہوں گے وہ! کیسے کیسے ظلم جھیلے ہوں گے انہوں نے۔ کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کیا ہوگا انہوں نے چودہ سو سال پہلے، سرور دو عالم کے حکم پر جنہوں نے مکے سے ہجرت کی تھی۔ صحرا کی تپتی ریت۔ انگارے برساتا آفتاب اور پیچھے پیچھے جان کے دشمن کافروں کے قافلے۔ . . .

اور کیا رہے ہوں گے وہ لوگ، کتنا اعلیٰ ایمان رہا ہوگا ان کا! کیسا بلند پایہ کردار رہا ہوگا ان کا! جنہیں انصار نے کس طرح گلے لگایا، جنہوں نے مہاجرین کو گلے لگایا، ان کی خدمت کی، انہیں اپنی ملکیت اور کاروبار میں حصہ دیا، انہیں اپنے قبیلوں میں جذب کر لیا۔

کیا حکم ربی ہے وہ دور پھر ایک بار دہرایا جا رہا ہے؟ تو کیا مجھے یہ توفیق...!
ٹن، ٹن، ٹن .... گھنٹی کے شور کے ساتھ دندناتی ہوئی ٹرام اس کی خلوت میں خلل ڈالتے ہوئے گزر گئی۔

پھر وہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز۔ اس کی بیوی اپنا پستان بچے کے منہ میں دے کر جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

اس نے ویسٹ تھرڈ ڈاؤن سٹریٹ کے مکان نمبر ۳۱۲ کے سامنے ٹیکسی کو روکا۔ ہاتھ کی گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے تھے وہ ٹھیک وقت پر پہنچا تھا مگر اسے یقین تھا، جس نے ٹیکسی بلوائی ہے، وہ وقت پر نہیں آسکے گا۔ ان پاکستانی اور ہندوستانیوں کا یہی تو رونا ہے۔ یہ کبھی وقت پر نہیں ہوتے۔ اگر کسی امریکن نے ٹیکسی بلوائی ہوتی تو وہ ابھی تک ٹیکسی میں بیٹھ چکا ہوتا۔ مگر اس علاقے سے کوئی امریکن ٹیکسی کیوں کر بلوائے گا! یہ شکاگو شہر کی وہ آبادی ہے جہاں پاکستانیوں اور ہندوستانیوں نے اپنا ماحول خلق کر رکھا ہے۔ وقت بے وقت بچوں کی چیخ پکار، ٹیپ ریکارڈر پر بجتے فلمی گانوں کا شور۔ فٹ پاتھ پر بکھرا کوڑا کرکٹ۔ راستے پر پیک کے نشان۔ کھڑکی اور بالکنیوں میں جھنڈوں کی طرح لٹکے کپڑے۔ جو امریکن ماحول میں پیوند کی طرح ابھر کر نظر آ رہے تھے۔

اس نے مکان نمبر ۳۱۲ کے پھاٹک کی جانب دیکھا وہاں اسے

[illegible] نظر نہیں آیا۔ اس [illegible]
[illegible] اور ماضی کا [illegible]۔

کراچی پہنچنے کے کچھ ہی عرصے میں اسے پاکستان اور [illegible] پاکستان میں زمین آسمان کا فرق نظر آنے لگا۔

انہیں شہر کے باہر کے کیمپوں میں سے ایک کیمپ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ حالات بہت ہی خراب تھے۔ سمندر کے راستے کراچی پہنچتے انہیں چھوڑ کر باقی سب مالی، جسمانی، یا ذہنی طور پر لٹے ہوئے تھے۔ کیمپ میں نہ پانی کا ٹھکانہ تھا نہ بیت الخلا، نہ باتھ روم کا۔ کسی کو کوئی کام دھندا نہیں تھا۔ سبھی سب بیکار تھے۔ کوئی اپنی بربادی کی داستان سنا رہا ہے۔ تو کہیں بے فکرے لونڈے گپ شپ کرتے بیٹھے ہیں۔ کوئی جوئے میں دل بہلا رہا ہے، تو کسی کی آنکھوں میں جنسی سانپ رینگ رہے ہیں۔

وہ کچھ دن تک تو کسی انصار کے انتظار میں بیٹھا رہا جو اسے گلے لگائے۔ اسے گلے کے نظام کے دیدار کرا دے جو اس کی یادوں کے رستے زخموں پر پھاہا رکھ دے۔ انتظار کرتے کرتے جب وہ تھک ہار کر ٹوٹ گیا۔ تو اس نے تپتی سڑک پر چلتے ہوئے شہر کا رخ کیا اور انگارے برساتے آفتاب کو سر پر جھیلتے ہوئے، کام کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔

کام کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے۔ جب وہ کسی مقامی شخص کی آنکھوں میں دیکھتا تو اسے اپنی پیشانی پر مہر نظر آتی۔ جیسے جانوروں کی پہچان کے لئے ان کے جسم پر گرم سلاخ سے مہر لگائی جاتی ہے ویسے ہی اس کی پیشانی پر مہاجر کی مہر لگا دی گئی تھی۔ مہاجر کا ٹھپا دیکھتے ہی مقامی لوگ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگتے جیسے وہ کوئی چور، اچکا یا بھک منگا ہو، یا اس کے جسم سے جذام ٹپک رہا ہو۔

معاش کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے، ایک دن اس کے پاؤں رکھنے کو زمین مل ہی گئی۔ ایک شخص مل ہی گیا جس نے اسے چھوٹا موٹا کام دے دیا۔ وہ بھی مہاجر تھا، [illegible] سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ یہاں اس کا تیل کا [illegible] سمیٹ کر وہ براہ نیپال سے کراچی پہنچا تھا [illegible] یہاں [illegible] ہوئے ایک کیمپ میں [illegible]

[illegible]

[illegible] کو، یہ سب بھائی [illegible]
گیا مہاجر ہیں۔ ان سب کو بھائی چارے اور محبت کا ایک ہی سبق
گھٹی میں پلایا گیا تھا۔ مگر آج یہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی
نفرت، حقارت اور بے اعتباری سے منہ پھیر لیتے تھے۔

انصار پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھنے لگے۔ اور مہاجرین
اپنا حق۔ وہ حق حاصل کرنے کے لیے ہی تو ہجرت کر کے یہاں
آئے تھے۔ اس طرح ان کے درمیان سوتیلے پن کے انکھوے پھوٹ
نکلے اور جب سوتیلے پن کی فصل تیار ہو گئی تو انسانی فطرت نے
اکثریت اور اقلیت کے اطراف بربریت کا ننگا ناچ شروع
کر دیا۔ پھر ایسے شعلے بھڑکے ایسی لپٹیں اٹھیں کہ مذہبی محبت
اور بھائی چارے کے بنیادی اصول ہی ان شعلوں کی لپیٹ میں
آ گئے۔ سوکھے ساتھ گیلا بھی جلنے لگا۔ صرف دو وقت کی روکھی
سوکھی کی امید کرنے والے بھی آگ کی نذر کیے جانے لگے۔

ایک شام اس کی بیوی اور دو بچے اورنگی کے فٹ پاتھ
پر سے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ ایک موٹر بائیک قریب سے
گولیاں برساتے ہوئے تیزی سے گزر گئی۔ سات لوگ ہلاک ہوئے
ان میں اس کی بیوی دو بچے بھی شامل تھے۔

ٹیکسی کی کھڑکی پر ٹکی اس کی بانہہ کو کسی نے ہلکے سے چھوا
چونک کر اس نے ٹوپی چہرے سے ہٹائی۔ سواری کو دیکھ کر اٹھنے
دبا کر دروازوں کا لاک کھول دیا۔ سامنے آئینے میں ٹوپی ٹھیک
کرتے ہوئے اس نے دیکھا، ایک نوجوان جوڑا پیچھے کی سیٹ
پر آ کر بیٹھا ہے۔ آگے کا دروازہ کھلا اور اس کا ہم عمر بزرگ
اس کے بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میٹر گھمایا۔

"پیسنجرس ٹاور۔" پیچھے کی سیٹ سے عورت نے کہا۔

ٹیکسی چلنے لگی۔ سواریاں گھریلو باتوں میں لگ گئیں
وہ ماضی کی دردناک یادوں میں کھویا ہوا ٹیکسی چلانے لگا
اس کے بیوی بچوں کے قتل کو تقریباً چالیس سال ہونے
کو ہیں مگر وہ اس ہیبت ناک حادثے کو آج تک بھولا نہیں
وہ اپنی بیوی کو بہت چاہنے لگا تھا۔ اس کی بیوی اکثر اپنے
ساس سسر اور بمبئی کو یاد کر کے چھپ چھپ کر آنسو بہایا
کرتی تھی مگر کبھی ہندوستان واپس لوٹنے کا ضد کر کے

[illegible] اس کے اور اس کے [illegible]
[illegible] زندگی ایک [illegible]
[illegible] خوابوں [illegible]
کیسا [illegible] پیش آیا۔

ٹیکسی مہاتما گاندھی روڈ سے گزر رہی تھی۔ یادوں کی چلمن
کچھ سرد پڑ رہی تھی۔ اس کے بغل میں بیٹھا ہوا بزرگ بازار
کی رونق دیکھنے میں مشغول تھا۔

"پاپا، وہ جو بڑی دکان آ رہی ہے نہ، اس کا نام بمبئی
بازار ہے۔"

عورت نے پیچھے کی سیٹ سے چہکتے ہوئے کہا۔

بزرگ نے بڑی دلچسپی سے گزرتی ہوئی دکان کے
بورڈ کو پڑھ کر دکان میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"واہ، واہ۔ اپنی مٹی سے محبت کی اس سے اچھی مثال
اور کیا ہو سکتی ہے۔" بزرگ نے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا
"اس نام کو پڑھ کر ہمیں اپنی بمبئی کی یاد آ جاتی ہے"
عورت نے جذباتیت سے کہا۔

بمبئی کا نام سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس
نے ان تینوں کی محبت میں اپنے پن کی حرارت محسوس کی۔
محسوس کیا جیسے ٹیکسی میں بمبئی کی مٹی کی مہک پھیل گئی ہو جیسے
برسوں کے بعد کوئی اپنا گلے ملا ہو۔ جیسے جذبۂ محبت کی پھوار
برس رہی ہو۔

"مگر بمبئی اب رہنے کے قابل جگہ نہیں رہی۔"

اس کے دل کو دھکا سا لگا۔

"روز آئے دن وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پتھر بازیاں
ہوتی ہیں۔ گولیاں چلتی ہیں۔ بم پھٹتے ہیں۔ کئی سو سال پہلے
کسی کے پرکھوں نے مندر گرائے تھے۔ اب کسی کے پوتے پڑ
پوتے مسجدیں گرانے سینائیں تیار کر کے اپنا الو سیدھا
کر رہے ہیں۔ گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ دوسری
طرف اسمگلرس اس آگ کو ٹھنڈا ہونے نہیں دیتے۔ تشدد
اور دہشت کا ماحول ہو تو ان کا سونا۔ ڈرگس، بم، ہتھیاروں
کا ہیرا پھیری آسان ہو جاتی ہے۔"

اس نے محسوس کیا۔ جیسے یہ بزرگ اس کے گھر کے لٹنے

[illegible] جھیل [illegible]۔
بزرگ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ لوگوں نے حرم
اللہ مذہب کے نام پر [illegible] لوٹنا مارنا سیکھ لیا ہے۔ وہ حرم تو
مذہب کے نام پر جینا بھول گئے ہیں۔

اس کے حلق سے چیخ اٹھتے اٹھتے دب گئی۔

ٹیکسی میں خاموشی چھا گئی۔

سب چپ تھے۔

سب کے ذہنوں میں سوچوں کے بم پھٹ رہے تھے۔

سب ان دھماکوں کو دوسرے سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے باہر تاک جھانک کر رہے تھے۔

باہر ایک طرف آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں تھیں تو دوسری جانب MICHIGAN جھیل کا خوبصورت کنارا۔ تینوں مسافر باہر دیکھ رہے تھے۔ مگر باہر کے نظاروں کا عکس کسی کے ذہن میں اتر نہیں رہا تھا۔ تینوں ذہنی اتھل پتھل میں مبتلا تھے اور وہ محسوس کر رہا تھا، جیسے اب کی بار اس کے بیوی بچے بمبئی میں ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔

اس نے بغل میں بیٹھے بزرگ کی جانب دیکھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ جناب، آپ بمبئی سے آئے ہیں؟

ان تینوں کے چہرے حیرت اور خوشی سے کھل اٹھے جیسے صحرا میں جوہڑ نظر آگیا ہو۔

میں پاکستانی ہوں۔

جلدی سے جواب دے کر اس نے سامنے لگے آئینے میں دیکھا آگے کی سیٹ کی طرف جھکی ہوئی وہ عورت یکلخت پیچھے سرک گئی جیسے اس کے ہاتھ پر بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس کا شگفتہ چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ آنکھوں میں دہشت در آئی۔

عورت کے چہرے کے بدلتے رنگوں نے جیسے اس کے وجود کو حلال سے حرام کر دیا۔

اس نے ٹیکسی کو ایک گلی میں موڑا اور سیئرس ٹاور کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ عورت نے جھٹ سے دروازہ کھولا بڑبڑا کر ٹیکسی سے اتری اور کانپتے ہوئے فٹ پاتھ پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس کے شوہر نے جلدی سے کرایہ ادا کیا اور اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا۔

بزرگ نے کھڑکی سے [illegible] ٹاور کی [illegible] عمارت کی اونچائی کو ناپتے ہوئے اطمینان سے [illegible]۔

آپ بمبئی سے آئے ہیں نہ؟ اس نے بزرگ کو [illegible] دیکھ کر سوال کیا۔

بزرگ نے مڑ کر اپنے ہم عمر ٹیکسی ڈرائیور کی جانب دیکھا۔ تجسس نے اس کے چہرے کی جھریوں کو گہرا کر دیا تھا۔

ہاں! بزرگ نے سر ہلا کر دھیمے سے جواب دیا دھیمے سُر کی مٹھاس سے شرابور ہو کر اس نے دوسرا سوال داغا۔

بمبئی کیسی ہے

بزرگ نے محسوس کیا، جیسے وہ اپنے والدین کی خیریت دریافت کر رہا ہے۔

بزرگ کے چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جواب دیا۔ بمبئی اچھی ہے۔

اس چھوٹے سے جواب سے اس کا تجسس اور کھل اٹھا اس نے تڑپ کر پوچھا۔

بھینڈی بازار کیسا ہے؟

اس کی دل گداز تڑپ سے متاثر ہو کر بزرگ کے ہونٹوں میں جنبش ہونے کو تھی کہ ان دونوں کے کانوں سے عورت کی آواز ٹکرائی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

پاپا، وہاں ٹھہرے، اس کے ساتھ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ انہوں نے سنا نہیں کہ وہ کون ہے۔ ایک تو مسلمان۔ اس پر پاکستانی!!

اس کے چہرے کی جھریوں میں برق سی لہرا گئی۔ بیٹی کی بچکانہ باتوں کو ان سنی کرتے ہوئے بزرگ نے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا۔ دروازے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبا کر کہا۔

بھینڈی بازار، جس حال میں ہے، خوش ہے بہت خوش ہے۔

لمس نے کرشمہ دکھایا

دونوں نے محسوس کیا۔ جیسے [illegible]

[illegible]

بلراج کمار

منتظر ہوں میں کہ اب کوئی پکارے گا مجھے
یہ جنوں کیسے مراحل سے گزارے گا مجھے

کٹ نہ جائے میرا رشتہ ہی زمیں سے ایک دن
کس بلندی پر وہ لے جا کر اتارے گا مجھے

جانے مجھ میں ڈھونڈنا چاہے گا وہ کس چیز کو
پہروں میرے پاس بیٹھے گا نہارے گا مجھے

تیرتا پھرتا ہے خوں میں ایک ان دیکھا سا ڈر
ایسا لگتا ہے کوئی شب خون مارے گا مجھے

کیا کہوں وہ لمحہ کیا امتحاں لے گا مرا
کوئی میرا نام لے کر جب پکارے گا مجھے

ایک طوفاں نے مجھے بلراج یوں بکھرا دیا
دوسرا طوفان ہی آ کر سنوارے گا مجھے

● آدرش نگر ... نمبر ۲، نزد ... ادھم پور - ۱۸۲۱۰۱

صابر زاہد

یہ ہو بھی سکتا ہے یہ امکان نہیں ہونے کا
دشمن جاں مرا مہمان نہیں ہونے کا

آ لگا کون گلے کون بچھڑ کر رویا
بھیڑ میں ہو کے اسے دھیان نہیں ہونے کا

شعر گوئی کہاں سب کا مقدر ہے میاں
شعر ہو جائیں گے دیوان نہیں ہونے کا

بے ضرر بے ریا بے داغ فرشتوں جیسا
آدمی ہے مگر عرفان نہیں ہونے کا

پھول زخموں کے ہیں تحفے میں اسے بھیج تو دو
خوشبوؤں سا وہ پریشان نہیں ہونے کا

بیل ہمسائے کی منڈیر پہ چڑھی آنکھیں ہوتے
جان کر یوں کوئی انجان نہیں ہونے کا

اس سے ملنے تو دستار سنبھالو زاہد
سرو قد جھک کے بھی دالان نہیں ہونے کا

● ۱۸۰ - ہڈکو کالونی - مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳

ریاض لطیف

کھنڈر ہے زماں کی ہوا جسم میں
نفس بھی بنا مرحلہ جسم میں

خلا کے شجر تک نظر کیا اٹھی!
خدا ٹوٹ کر آ گرا جسم میں

بہت خشک ہیں سب کنارے مرے
کوئی تو سمندر بہا جسم میں

یہ کس نے اچھالا ہے سنگِ سکوت
بہت شور ہونے لگا جسم میں

لہو اپنے محور پہ قائم نہیں
ہے رنگوں کی گردش، نہ جا جسم میں!

لیے ساتھ اثبات کا آسماں
نفی کا پرندہ اڑا جسم میں

ریاض اپنے پیکر میں بکھرا ہوا،
میں کیسے جنم لے چکا جسم میں!

● ۳/۴ - ... گرہ پول احمد آباد - ۳۸۰۰۰۱

رشید امجد

سی ۱۱۵ سٹلائٹ، گلستان کالونی، راولپنڈی، پاکستان

مزاحمتی ادب

دیکھا جائے تو مزاحمتی رویہ اردو ادب کے خمیر میں رچا بسا ہے کہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی و تہذیبی زوال کا زمانہ ہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز ہی سے اس زوال کی ابتدا ہو گئی تھی بنیادی طور پر تو یہ زوال سیاسی انتشار کا نتیجہ تھا جس کا مرکزی نقطہ ۱۸۵۷ء تک پھیلتے پھیلتے ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے بہادر شاہ ظفر کی معزولی (۱۸۵۷ء) تک کا عرصہ ایک ایسا تحلیلی عہد ہے جس میں لوگ آہستہ آہستہ اس ذہنی شکست کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا کلائمیکس ۱۸۵۷ء میں ہوا چنانچہ اس دور میں لکھا جانے والا ادب خصوصاً شاعری میر کی مثنویاں ہوں یا سودا کی ہجویات، مختلف شاعروں کے شہر آشوب ہوں یا نظیر کی نظمیں کسی نہ کسی سطح پر اپنے ہی عہد کے سیاسی و سماجی زوال کی تصویر کشی ہیں۔ نظم کی سطح پر تو یہ زوال نہ صرف نمایاں ہے بلکہ اپنے عہد کی بعض بھیانک تصویریں بھی بناتا ہے لیکن غزل کی رمزیت، اشاریت اور مختلف تلازموں اور استعاروں کی گرہ کشائی کی جائے۔ تو قفس، صیاد، گلچیں، محتسب، رقیب وغیرہ کے استعارے اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ مزاحمتی رویوں کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد بظاہر مسلمان لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ مفاہمت کی باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس مفاہمت میں بھی کسی نہ کسی مزاحمت کی دبی چنگاری اپنا احساس کرا دیتی ہے۔ حالی جیسے مجز بیان میں بھی بدیسی آقا کے خلاف نفرت کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن مفاہمت کے اسی دور میں اکبر الہ آبادی بھی ہیں جن کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری نے ایک اور ہی انداز میں مزاحمتی رویے کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے ایک نیا لہجہ دیا۔

نظم اور غزل کے برعکس اردو افسانہ دیر سے شروع ہوا اس بحث میں پڑے بغیر کہ اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے۔ اردو کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" سماجی رویوں کے خلاف ایک بھرپور مزاحمت ہے۔ بیسویں صدی کے لکھنے والوں کو یہ رویہ ورثے میں ملا۔ پھر خلافت تحریک، ترقی پسند تحریک اور تحریکِ پاکستان سے قیام پاکستان تک یہ رویہ کسی نہ کسی شکل میں ہمارے ادب کی مرکزی روایت رہا ہے کیونکہ انیسویں صدی کا پس منظر بیسویں صدی میں اگرچہ نئے زاویوں اور رویوں کی صورت اختیار کر گیا لیکن اس کے باطن میں جبر و تشدد کی سامراجی روایت کسی نہ کسی صورت بہرحال موجود رہی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جبر و تشدد اور سیاسی خوف کی جو فضا ہمارے ادب خصوصاً شاعری کے پس منظر میں مسلسل موجود رہی ہے اس کا تسلسل بیسویں صدی میں بھی رہا بس اس کی صورتیں بدلتی رہیں۔ اسی لیے ردِ عمل، احتجاج اور مزاحمت ہمارے ادب کی ایک رواں روایت رہی جو قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہی۔ وجہ یہ کہ آزادی کے بعد بھی خوابوں کی تعبیر نہ ملی۔ سماجی بے انصافی اور طبقاتی جبر کا دور نہ صرف جاری رہا بلکہ قیام پاکستان کے بعد اس میں شدت آ گئی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک غیر مستحکم سیاسی نظام اور طبقاتی تقسیم کی خرابیوں نے پاکستانی معاشرے کو کئی سیاسی، سماجی اور فکری بحرانوں سے دوچار کیا۔ ۱۹۵۸ء میں پہلا مارشل لا لگا لیکن اس نے ابتر معاشرے کو [illegible] مزید کھوکھلا کر دیا اور ایک بڑا سیاسی و فکری خلا پیدا ہو گیا۔ ہر میدان میں بے سمتی کا احساس [illegible]

[illegible] سے کمزور کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک اور دوسرے مارشل لا (۱۹۶۹ء) کے بعد پہلی بار ایک منتخب حکومت وجود میں آئی لیکن ۱۹۷۷ء کے تیسرے مارشل لا نے اس کی بساط لپیٹ دی۔ اس مارشل لا کے دوران ۱۹۷۹ء میں بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے لیے شاید کوئی کمزور استدلال تلاش ہی کیا جا سکے کہ اس وقت کوئی آئین موجود نہ تھا اور ۱۹۵۶ء کا آئین ابھی منظور نہیں ہوا تھا لیکن ۱۹۷۷ء کا مارشل لا غیر اخلاقی، غیر آئینی اور بالکل [illegible] کہ یہ ۱۹۷۳ء کے متفقہ طور پر منظور آئین سے بغاوت تھی چنانچہ اس کا ردِ عمل بھی اتنا ہی شدید ہوا جس کا اظہار شعر و ادب میں اتنا ہوا کہ اسے سمیٹنے کے لئے کئی جلدیں بھی ناکافی ہیں یہ مزاحمتی ادب کے لئے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ مارشل لا کے صرف آٹھ ماہ بعد مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ "گواہی" شائع ہوا جس کے مرتب ڈاکٹر اعجاز راہی تھے۔ اس مجموعے میں چودہ کہانیاں شامل تھیں۔ "گواہی" کا آغاز حضرت علیؓ کے اس قول سے ہوا تھا:

"میں نے اس وقت اپنے فرائض انجام دیے، جب دوسرے اس راہ میں قدم اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور اس وقت سر اٹھا کر سامنے آیا جب دوسرے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اس وقت زبان کھولی جب سب گنگ نظر آتے گو میری آواز سب سے دھیمی تھی مگر سبقت و پیش قدمی میں سب سے آگے۔"

یہ دھیمی آواز آہستہ آہستہ شعر و ادب کی سب سے توانا آواز بن گئی۔ ۱۹۷۹ء میں جب بھٹو کو پھانسی دی گئی تو اس کا بھی شدید ردِ عمل ہوا۔ احتساب (عبداللہ ملک) کے دونوں شمارے، خوشبو کی شہادت (سلیم، راشد، یونس، ادیب) کی دونوں جلدیں اور نئی تحریک چاپ (ولی الرحمٰن ناصر) ایسی ہی تحریروں کا مجموعہ ہیں۔

۱۹۷۹ء اور بعد کے دو تین سالوں کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ غزل کے محبوب نے ایک نئی معنویت اختیار کر لی ہے۔ رقیب اور مقتل کے معنی ہی بدل گئے ہیں۔

اب اس کے ہجر میں روتے ہیں اس کے گھائل بھی — گماں نہ تھا کہ وہ ظالم حبیبِ شہر بھی ہے
جہاں پہ دفن ہے اس کے بدن کا تاج محل — ادھر دریچے رکھیں گی عمارتیں ساری

یہی صورت افسانے کی بھی ہے۔ اگر اسی دوران لکھے گئے مزاحمتی افسانوں کا انتخاب کیا جائے تو کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ قیامِ پاکستان سے ۱۹۵۸ء کے مارشل لا تک، ۵۸ء سے ۶۸ء کی عوامی تحریک پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لا ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء میں اسمبلیوں کی برطرفی تک آمریت اور جبر و تشدد کا پرانا ڈراما مختلف شکلوں اور کرداروں کے توسط سے کھیلا جاتا رہا ہے۔ بظاہر سامراج ۱۹۴۷ء میں یہاں سے چلا گیا تھا لیکن اس کا نظام اب بھی یہاں موجود ہے جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مسلسل زوال میں ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جمہوریت اور مارشل لا کے عرصے کا تعین اور جمہوری اداروں کا زوال تو خیر ایک مطالعے کا متقاضی ہے۔ ادب میں اس کا اظہار بھی ایک دلچسپ مطالعہ ہے کیونکہ تشدد کی فضا، عدمِ معاشی مساوات اور سیاسی جبر ہمارے ادیب کو نسل در نسل ورثے میں ملے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابھرنے والی نسل کے یہاں بے اطمینانی اور خوابوں کی شکست و ریخت اسی زوال سے وابستہ ہے اس کا اظہار کہیں علامتوں، کہیں استعاروں کہیں کلاسیکی تلازموں اور کہیں سیدھے سادے بیانیہ میں ہوا۔

منیرؔ اس ملک پہ آسیب کا سایا ہے یا کیا ہے — کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

یہ ایک سوال یا صرف صورتِ حال کی عکاسی نہیں، ایک تجزیہ ہے جس میں پچھلے خدشات دکھ اور خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ ہمارے جدید ادب کی فکری روایت ہے۔ ہمارے زوال کا جو عرصہ ۱۹۷۱ء سے شروع ہوا تھا شاید ابھی مکمل نہیں ہوا، ہم مسلسل ڈھلوان سے لڑھک رہے ہیں بلکہ اب تو ہم نے اس لڑھکنے میں بھی ایک سہولت اور لذت ڈھونڈ لی ہے۔ زوال میں لذت آنے لگے تو اس کے اندر ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس سے ہماری وہ روایت جو مسلم زوال سے شروع ہوئی تھی ابھی تک جاری ہے کہ اس کا پس منظر [illegible] معاشرتی شکست و ریخت اور اس کے نتیجے میں فرد کا زوال، اداروں کی تباہی، اخلاقی انحطاط، اقدار کی تباہی اور سیاسی [illegible] اعتبار سے اب بھی اسی طرح موجود ہے سو ادیب کی مزاحمت بھی جاری ہے۔

نور محمد یاس

ممکن نہیں یہ سلوک مناسب نہ مجھ سے ہو
میں چپ رہوں تو کوئی مخاطب نہ مجھ سے ہو

اس شکل سے مجھے نہ گزارے شکست رنگ
جب آئینے کا رُخ مری جانب نہ مجھ سے ہو

تم وہ نہیں کہ بس اپنے محاسن دکھائی دیں
میں وہ کہ انکشاف معائب نہ مجھ سے ہو

الفاظ کا تو مجھکو تسلط نہیں قبول
یہ اور بات ردِ مطالب نہ مجھ سے ہو

خاک اپنی مٹھیوں کو رکھوں بند خوف سے
مشکوک موتیوں کا محاسب نہ مجھ سے ہو

اوراق سے نچوڑ تو لوں رنگ رس مہک
برہم کتاب گل کا مرتب نہ مجھ سے ہو

● شیامحل لین، نندا لال ڈھی باڑا ۔ بھوپال

عصمت مظفری

اُدھر آنکھ کرکے اِدھر کان کر کے
وہ انجان بیٹھے ہیں پہچان کر کے

بٹھاتے ہیں ڈر میرے دل میں خدا کا
یہ ناداں ڈرپوک انسان کر کے

خدا کو زمیں پر اتارو اے لوگو
ذرا گیان کر کے ذرا دھیان کر کے

ہے اس کی ہی جیبوں میں حل مشکلوں کا
جو سمجھے گا مشکل کو آسان کر کے

مگر دل مجھے آج بھی کوستا ہے
نہ سنبھلا میں گنگا میں اشنان کر کے

ترے شعر میں صرف کانٹے ہیں عصمت
سجاتا ہے کیوں انکو گلدان کر کے

● مکان نمبر ۲-۷-۱۳-۴، [illegible] باندرا [illegible] ۲۰۰۰۰

پرکاش تیواری

جدھر دیکھئے بے لباسی ہے کتنی
نئی نسل تجھ پر اداسی ہے کتنی

صدا العطش کی ہے اور دل کی دھرتی
زمیں آرزوؤں کی پیاسی ہے کتنی

ہر انسان گھبرایا گھبرایا سا ہے
مرے شہر میں بدحواسی ہے کتنی

محبت کے پردے میں ملتا ہے دھوکا
فضا زندگی کی سیاسی ہے کتنی

غریبوں کی قسمت میں دولت نہیں ہے
مگر زندگی التماسی ہے کتنی

ضمیر اپنا بازار میں بیچ آئی
تو اے زندگی زندگی داسی ہے کتنی

سنایا تو پرکاش [illegible] مانی
فضا زیست کی [illegible] سی ہے کتنی

● ۱۹۹ [illegible] ۱۲ [illegible] کے پورم، نئی دہلی

ولی محمد چودھری

ٹانڈگیٹ آنڈسر خیر، محلہ کٹکوئیاں، امروہہ - ۲۴۴۲۲۱ (یوپی)

ماسٹر پورن سنگھ

موسم بہار کی وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑے چلے جا رہے تھے۔ پیڑوں میں نئی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ سوکھے ہوئے پتوں سے وہ نجات حاصل کر چکے تھے۔ سہانی ہوا کے جھونکوں کی سرسراہٹ دل میں امنگیں پیدا کر رہی تھی۔

میں تھکا ہارا اپنے دفتر سے گھر پہنچا تو بیوی نے بڑی بے دلی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ اور مجھ سے کہنے لگی کہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیں، میں آپ کیلئے چائے لے کر آتی ہوں۔ مجھے آپ سے ایک اہم موضوع پر بات کرنی ہے۔ "اہم موضوع" سن کر میں چونک گیا کہ بیوی کس اہم موضوع پہ بات کرے گی۔ پھر خیال آیا کہ آج کل وہ ٹی وی کی خبریں سن رہی ہے اور اخبار بھی پابندی سے پڑھ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نئی سیاسی اور مذہبی صورتِ حال پہ ہی بات کرے۔ یوں بھی ان دنوں ملک کے بگڑتے ہوئے حالات ہی اہم موضوع ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی موضوع تو اہم ہو ہی نہیں سکتا۔

چائے کا کپ اس نے میز پر رکھا تو میں اسے سوالیہ نگاہوں سے تکنے لگا۔

وہ کہنے لگی "آپ دنیا زمانے کی فکر میں تو گھلے جا رہے ہیں لیکن آپ کو اپنے بچے کا کوئی غم نہیں۔ اس کے مستقبل کے لئے آپ ذرا بھی فکر مند نہیں ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اس بار پھر تھرڈ کلاس نمبروں سے پاس ہوا ہے۔"

"لیکن ابھی تو وہ تیسری کلاس میں ہے بیگم، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ابھی اس کے نمبر کم آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنے چھوٹے بچے پر پڑھائی کا زیادہ لوڈ اچھا نہ ہوگا۔"

"غلط کہتے ہیں آپ۔" بیوی نے کچھ غصیلے لہجے میں جواب دیا "یہی وقت ہے کہ اس کی بنیاد مضبوط کی جائے تاکہ اس کا مستقبل درخشاں و تابناک ہو، وہ ایک شاندار انسان بنے۔ آپ کی طرح معمولی کلرک نہیں۔ لہٰذا اس کو پڑھانے کے لئے میں نے نقوی صاحب سے بات کر لی ہے وہ بڑی خوشامد کے بعد ایک گھنٹہ دینے کے لئے رضامند ہوئے ہیں بس تھوڑی دیر کے بعد وہ آنے ہی والے ہوں گے آپ ان سے بات کر لیں۔

"نقوی صاحب جیسے مہنگے ٹیچر کی کیا ضرورت تھی۔ کسی اور سے بات کر لیتی تھی، چھوٹی کلاس کے بچوں کو پڑھانا کوئی مشکل کام تو ہے نہیں۔"

"کمال ہے۔" "آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ چھوٹی کلاس کے بچوں کو صحیح ڈھنگ سے پڑھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہمارا بچہ اب نقوی صاحب ہی سے پڑھے گا۔"

میری بیوی نے اعتماد اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اور باہر چلی گئی۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور باہر آسمان کو دیکھنے لگا۔ جہاں اپنے پنکھ پھیلائے اڑتے ہوئے بے نیاز پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی دوڑتی ہوئی گئی جیسے وہ اس دستک کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہو۔

میں بھی دروازے کی طرف بڑھا۔

"آداب، آداب" کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا نقوی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

رسمی تعارف اور چند رسمی جملوں کے بعد۔ بیوی کچن میں چلی گئی۔ اور ہم دونوں کچھ لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے۔

چند ساعتوں کے بعد، نقوی صاحب گویا ہوئے۔

"[illegible] جناب جیسا کہ میرے پاس [illegible]
بھی آپ کی بیگم صاحبہ میرے گھر گئی تھیں، وہ میری مسز [illegible] انہوں
نے یہ ضرور بتایا کہ میں آپ کے بچے کو ایک گھنٹہ ضرور دوں گا۔ فیس
تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرے ٹیوشن پڑھانے کے کچھ اصول ہیں۔ میں ہر
امیر و غریب کے بچے کو نہیں پڑھاتا ہوں، صرف ان لوگوں کے بچوں کو پڑھاتا
ہوں جو خاندانی ہوں اور تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔ میں ایک گھنٹے کے
پانچ سو روپے لیتا ہوں۔ وقت کا پابند ہوں اور اصول پسند ہوں میرے
آنے سے پہلے بچہ پڑھنے کے کمرے میں موجود ہو، اس کے پاس ربر، پنسل
کاپیاں، کتابیں، ساری چیزیں سلیقے سے موجود ہوں۔ بچے کے کپڑے
صاف ستھرے ہوں اور گھر میں کسی قسم کا شور شرابہ نہ ہونا چاہیئے پیسے
میں مہینے کی پہلی تاریخ ہی کو لے لیتا ہوں اور گرمیوں کی چھٹیوں کے بھی
پیسے لیتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ جون کی چھٹیوں کے پیسے والدین کاٹ
لیں۔ بچہ پڑھے یا نہ پڑھے میں سال کے بارہ مہینوں کے پیسے لیتا ہوں اور
اپنے اصولوں کے لئے نہ تو کوئی سمجھوتہ کرتا ہوں اور نہ ہی کسی قسم کی رعایت
برتتا ہوں۔ آپ کسی بات کا برا مت مانیے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میری کچھ
باتیں سخت ہوں۔ شاید آپ کو ناگوار بھی گذریں۔ لیکن TERMS و
CONDITIONS پہلے ہی طے ہو جائیں تو پھر کسی قسم کا تناؤ نہیں
رہتا ہے۔ تعلیم دراصل اتنی آسان شئے نہیں ہے جتنا کہ لوگوں نے
سمجھ رکھا ہے۔ جناب پھل دار پودے کو تن آور درخت میں تبدیل
کرنے کے لئے بڑی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔ تب کہیں جا کر
میٹھے پھل کھانے کو ملتے ہیں۔"

"جی ہاں، یقیناً۔" میں نے صرف اتنی ہی کہا۔

اس کے بعد میری بیوی نے چائے کی ٹرے میز پر لا کر رکھ دی۔

اور میں نقوی صاحب کے سراپے کو غور سے دیکھنے لگا۔

ستواں لمبی ناک، باریک ہونٹ، شاندار سوٹ، ٹائی، براؤن
چمکتے ہوئے جوتے۔ نقوی صاحب کی نفاست پسند طبیعت کی بھرپور
عکاسی کر رہے تھے۔ پتلی پتلی، نازک انگلیوں میں دمکتے ہوئے نگوں
کی انگوٹھیاں، بے حد خوبصورت اور نازک،

نقوی صاحب نے پلیٹ میں سے بسکٹ اس قدر احتیاط سے اٹھا
کر منہ تک لے گئے جیسے [illegible] بجلی کے ننگے تاروں کو بھی اس احتیاط
سے [illegible]۔

میں نقوی صاحب کے [illegible] کا قائل ہو چکا تھا۔

[illegible] چائے ختم کرنے کے بعد [illegible]
[illegible] پانچ سو روپے [illegible] پیشگی
ان کو پیسے چاہئیں۔

میرے ذہن میں سو سو کے پانچ نوٹ اور مہینے کی پہلی تاریخ گردش
کرنے لگی۔

پھر وہ جانے کے لئے کھڑے ہوگئے اور بولے۔

"آپ لوگ آپس میں مشورہ کر لیں، اگر آپ کی رائے بدلے تو مجھے
اطلاع کر دیں۔"

"نہیں، نہیں، اس میں رائے بدلنے کی کون سی بات ہے، ہم
تو آپ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ ہمارے بچے کو پڑھانے کے لئے
تیار ہو گئے، ہمیں یقین ہے کہ آپ کی نگرانی میں ہمارے بچے کا مستقبل
روشن ہوگا۔"

میری بیوی نے جلدی جلدی کہا۔

"ٹھیک ہے اب، ہمیں اجازت دیں اور کل شام سے آپ
بچے کو تیار رکھیں۔"

"جی" "بہت بہت شکریہ، آداب، آداب" کی آوازوں کے
ساتھ نقوی صاحب چلے گئے۔ ان کے جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آواز میرے
کانوں میں گونجنے لگی۔

اور پھر اسی کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ، دور بہت دور ایک
اور آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ کچی پکی سڑک سے دور گاؤں
سے تھوڑے سے قصبے کے اسکول کو جاتے ہوئے ماسٹر پورن سنگھ کے
جوتوں کی آواز۔

کڑاکے کی ٹھنڈی اور کہرے سے ڈھکی ہوئی سڑک پر کرتا، پائجامہ
اور ایک اونی باسکٹ پہنے دبلے پتلے سوکھے ہوئے جسم کے ماسٹر پورن سنگھ
اتوار کی چھٹی گذار کر چھ میل کا پیدل سفر طے کرتے ہوئے اپنے اسکول کی
طرف جا رہے ہیں۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں پورن سنگھ نے ہماری کلاس میں [illegible]
[illegible] ہوئے سخت لہجے میں اعلان کیا [illegible]
کے بعد اپنے اپنے بستر ساتھ لے کر اسکول آئیں گے اور اپنے کھانے
پینے کا سامان بھی ساتھ لائیں گے۔ [illegible] رات
کے دس بجے تک تمہاری کلاس [illegible] سمجھانے
کے لئے دو گھنٹے [illegible]

[illegible] آیا تھا
[illegible] امتحان [illegible]
کے لئے اور میں چاہتا ہوں کہ تم سب [illegible] نمبروں سے پاس ہو جاؤ۔"

پھر ویسا ہی ہوا کل ہم سب بچے اپنے کھانے، اوڑھنے اور بچھانے کا سامان لے کر اپنے اسکول پہنچ گئے۔ دن بھر پڑھائی ہوتی شام کو دو گھنٹے کی چھٹی تھی۔ پھر اس کے بعد رات دس بجے تک ماسٹر پورن سنگھ اپنی قیمتی ہدایتیں دہراتے ہوئے ہمیں پڑھاتے رہتے۔

آہستہ آہستہ دن گزرنے لگے۔

اور پھر ایک دن پورن سنگھ ہمیں امتحان دلانے کے لئے شہر لے کر آ گئے۔ جہاں ہم لوگ ایک ٹوٹی ہوئی دھرم شالہ میں آ کر ٹھہر گئے۔ پورن سنگھ کا حکم تھا کہ صبح کو سب لڑکے سویرے ہی تیار ہو جائیں۔

سورج ابھی نکلا بھی نہ تھا کہ ہم سب تیار ہو کر ایک لائن میں کھڑے ہو گئے اسکول کی طرح پہلے پرارتھنا ہوئی۔

پھر خاموشی چھا گئی!

ہم لوگوں کے سامنے بے حد اداس اور خاموش کھڑے پورن سنگھ کچھ دیر کے بعد آگے بڑھے اور بولے۔

"میرے پیارے بچو! آج امتحان تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی ہے۔ ہم نے جو محنت تمہارے ساتھ کی ہے اور جس لگن سے تم نے پڑھا ہے۔ اور تمہارے والدین نے تمہارے لئے جو اپنی اچھاؤں کا تیاگ کیا ہے ان سب کا پھل تمہیں اوشیہ ملے گا۔ مجھے پورا بھروسہ ہے، وشواس ہے کہ تم ضرور پاس ہو جاؤ گے اور اچھے انسان بن کر اپنے دیش کا مان بڑھاؤ گے اور اپنے اسکول کا نام بھی روشن کرو گے اور ہمارے نام کو بھی بٹہ نہیں لگاؤ گے میری دعائیں، میرا آشیرواد تمہارے ساتھ ہے۔"

یہ کہتے کہتے پورن سنگھ کی آواز بھرا گئی تھی۔
ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جن کو وہ پوری کوشش کے ساتھ چھپا رہے تھے۔

ان کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔

"اب ایک ایک کر کے تم میرے پاس آؤ، میں تم سب کے ماتھے پر تلک کروں گا۔ اور تمہیں [illegible] کروں گا۔"

تھالی میں آرتی کا سامان [illegible] پورن سنگھ ہر لڑکے کی آرتی اتارتے اس کے ماتھے پر [illegible] آگے بڑھا دیتے۔

[illegible] جذبات سے [illegible] ہو جاتے تھے
لیکن وہ کچھ نہیں پاتے تھے۔

جب ہم اپنے ایگزام روم EXAM ROOM میں پہنچے ٹیچر نے عبدالعزیز کو اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس پر شیکھر کا ایک لڑکا حیران ہو کر عبدالعزیز سے پوچھنے لگا۔

"کیا تم مسلمان ہو؟"

عبدالعزیز نے جواب دیا۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں۔"

یہ جان کر وہ لڑکا حیران رہ گیا اور بولا۔
مسلمان ہو تو ماتھے پر تلک کیوں لگائے ہوئے ہو

عبدالعزیز نے کہا۔

"میاں یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا، یہ تلک نہیں ہے یہ تو استاد کا آشیرواد ہے اپنے شاگرد کے لئے۔"

یہ سن کر وہ لڑکا بھونچکا سا رہ گیا۔

"فقری صاحب کی بات آپ نے سن لی۔"

بیوی نے کچن سے باہر آتے ہوئے کہا۔ تو میری سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"ہاں، سن لی۔"

"اب آپ کو ہر مہینے پانچ سو روپوں کا بندوبست کرنا ہے اپنے لئے نہیں اپنے بچوں کے لئے۔ اولاد کے لئے آدمی کیا نہیں کرتا آخر سب کچھ تو بچوں ہی کے لئے ہے۔ آپ کو بس اتنا یاد رکھنا ہے کہ تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپے EXTRA مہینے کی پہلی تاریخ"

ہوائیں اچانک تیز ہو گئی ہیں۔ آوارہ جھونکوں میں اڑتا ہوا ایک سوکھا پتہ میری گود میں آ گرا ہے میرے کان شائیں شائیں کی آوازوں سے گونج رہے ہیں اور ان میں سو سو کے پانچ نوٹ مہینے کی پہلی تاریخ اور بچے کا درخشاں مستقبل اٹکا ہوا ہے۔ ❁

شبنم عشائی

ایک نظم

وہ لڑکی
جس کا سبز ابدان
تنہائی کا زہر پیتے پیتے
نیلا پڑ گیا تھا
جو ساحل پر بکھری
اٹی جاتی لہریں گنتی
اور پھر
لہروں کے تماشے میں جو کنارے کٹتے
وہ قدم بہ قدم
پیچھے ہٹتی......
تمہیں
کھلے سمندر بیچ
ہنستا دیکھ کر
تیرنے لگی
جانے کوئی کیسی بات ہوئی
جس کا بدن
پھر سے سنہری ہو گیا

● شبنم عشائی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۲

قمر قدیر ارم

لیڈی فاسٹس

وہ ایک لڑکی
اناکی حویلی میں رہنے والی
اپنی عمر کی تازگی کو
لپنے بدن کی کنواری مہک کو
اپنی جبیں کی چاندنی کو
روح کی روشنی کو
سمیٹ کر پھر
دزدیدہ پا
میرے خوابوں میں آ گئی ہے
یہ خستہ شکن لباس مرا
یہ میرے گھر کی میلی سی بو
میرے پیٹ میں بھڑکتی ہوئی آگ
اور روٹی کی سوندھی خوشبو!

مجبور کرتی ہے کہ اس کو لوٹا دوں
اور روح کی روشنی کا سودا کر لوں۔

● قمر قدیر، بارہ دری، مراد آباد (یوپی)

آشا پربھات

تمہارے جانے کے بعد

اکثر
تمہارے جانے کے بعد
دریچے کھلتے ہیں
بند ہوتے ہیں
شوخ لہریں
سرکشی کرتی ہیں کناروں سے
سانپ کے کینچل کی طرح
سمندر کی لہریں
سمٹتی ہیں سکڑتی ہیں

اور
اپنی ہی گہرائی میں ڈوب جاتی ہیں
کچھ لمحے
ناؤ کی مانند
سطح پر ابھرتے ہیں
اور اوجھل ہو جاتے ہیں......!

● کوٹ بازار، وارڈ نمبر ۱۹، سیتامڑھی ۸۴۳۳۰۲

اردو ادب میں
بے ادبی کی تاریخ

جو لوگ تحقیق و تجسس کے اوصاف سے متصف ہیں وہ ہمیشہ ان مسائل کو جاننے کی فکر میں رہتے ہیں جو ان کے لئے نہ صرف تعجب خیز ہوں بلکہ ایسے اسرار کا انکشاف کرتے ہوں جو پیش منظر میں تو موجود ہوتے ہیں لیکن ان کے پس منظر کو دریافت کرنے بلکہ کشف کرنے کی ضرورت ہو۔ انہیں مسائل کا حل معلوم کرنے کی فکر بھی ہوتی ہے۔ یہی لوگ ایسے اسرار سے پردہ اٹھنے کے منتظر رہتے ہیں جو ان کی توجہ تو طلب کرتے ہیں لیکن ان کو معلوم کرنے کی دشواریاں حوصلہ شکن بھی ہوتی ہیں۔ ان مسائل کا حل اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔

ان سارے اسرار کی قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی حقیقت یا اصل پس پردہ کا واضح انکشاف، یا فوری جواب ممکن نہیں ہوتا۔ ان کی ایک اور صفت یہ بھی ہے کہ اگر ان کی حقیقت کے بارے میں کوئی انکشاف ہو جائے اور کشاف اس کے نتیجے میں کوئی نظریہ قائم کر بھی لے تو دانشوروں کے مابین اس نظریے کے بارے میں شدید اختلاف کا وجود ہوتا ہے۔ ہر دانشور اسی مسئلے کے متعلق اپنے اختلافات ظاہر کرتا اور بالآخر اس حقیقت کو شبہات کے لئے ایسے شکنجے میں جکڑ دیتا ہے کہ اس حقیقت پر بھی باطل کا گمان ہونے لگتا ہے۔

ہر دانشور اپنی تحقیق کے نتائج شائع کرتا ہے اور بے شمار ایسے طالبانِ علم ہوتے ہیں جو اس کے نظریات سے استفادہ کرتے ہیں لیکن کچھ یوں بھی ہوتا ہے کہ اسی مسئلے کے بارے میں کوئی دوسرا دانشور قطعاً مختلف نتائج اور جداگانہ نظریات قائم کرتا ہے اور جب اس کے نظریات شائع ہوتے ہیں تو اس سے پہلے کے نظریات کے بارے میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں گویا ہر دانشور اپنی تحقیق کے نتائج کو درست ثابت کرتے ہوئے دیگر دانشوروں کی تحقیقات کے نتائج کو ناقابلِ قبول قرار دیتا ہے اور قاری کی حیرت و تجسس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جہاں تک سائنس کا تعلق ہے وہاں اس قسم کے اختلافات اور شکوک کا امکان بہت کم ہوتا ہے اس لئے کہ سائنس کی معلومات، انکشافات اور نتائج ایسی مضبوط اور قاطع اختلافات بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں کہ ان سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جب کہ فلسفہ، ادب، تاریخ وغیرہ وہ موضوعات ہیں جن کی تحقیق اور نتائج کا کام بعض اوقات مفروضات۔ اور بعض اوقات منطقی اتخاذات پر مبنی ہوتا ہے۔ جن سے اختلاف کرنا یا جن کے مطالعے کے بعد مختلف نظریہ قائم کر لینا ممکن ہوتا ہے۔

تحقیق و تفتیش میں ایک عجیب علمی لذت ہے یہی وہ لذت اور کشش مستقل ہے جو دانشوروں کو انکشاف اسرار اور دریافت حقیقت کی کوششوں میں مصروف رکھتی ہے اور جب کوئی شخص کسی مسئلے کے حل کو دریافت کر لیتا ہے یا کسی نتیجے پر پہونچ جاتا ہے تو اس کو وہ عجیب مسرت حاصل ہوتی ہے جو کسی اور کامیابی میں نہیں ہوتی۔ مسئلہ جس قدر مشکل ہوتا ہے انکشاف سے اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

حقائق، نتائج اور انکشافات، افادیت کا فیصلہ نہ صرف قارئین کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو ان نتائج کو اپنی کسی تحقیقات میں استعمال کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔

کسی بھی تحقیق کے نتائج [illegible] حرفِ آخر نہیں ہوا کرتا ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک راز کا انکشاف [illegible] دروازے کھول دیتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ واقعات کو اس کلیے سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے [illegible] پہونچ چکا اور درجہ صداقت کو پہونچا اس کے بارے میں شبہہ کی گنجائش نہیں اس لئے کہ حادث

دستر ہوگیا۔ لیکن اس حادثے کے اسباب ہنوز علم و فنون کی کاوش باقی ہے۔

مسائل جو واقعات سے علیحدہ انسانی ہیں ان کا اس طریق سے تعلق نہیں وہ حادثے نہیں ہو سکتے۔ حالات اور واقعات اور امکانات کی صورت میں ہوتے ہیں جو ایک متعدد مختلف کیفیت وجوہ اور اسباب جو مل کے مرکب ہوسکتے ہیں۔ ان سے بحث اور تاریخ کی ترکیب و نشو کا اپنی ذہنی ثقافت وسعت کی متقاضی اور مرہون ہوا کرتا ہے۔

زبان کے آغاز کا مسئلہ بھی اسی طرح ہے یہ کوئی کچھ نہیں بتا سکتا کہ انسان کی گفتگو کا آغاز کس طرح ہوا۔ اشاروں سے ہوا یا الفاظ اور اصوات کی حالت سے ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اشاروں اور آگے چل کر تصاویر یا اشکال کے ذریعے اظہار خیال پر لفظ و بیان کی اہمیت کو ترجیح حاصل ہے اس لئے کہ زبانی گفتگو مقدم ہے اور تحریر موخر۔ زبان سے گفتگو کو تحریر پر ہزار ہا سال کی فوقیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے ابتدائی دور میں انگلیوں اور ہاتھوں کی حرکات کی ساتھ ساتھ چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے اظہار خیال یا گفتگو کا طریقہ رائج تھا جسے ماہرین لسانیات نے GESTURAL طریقے کا نام دیا ہے۔ اس کے بعد تصویری طریقہ گفتگو PICTORIAL اور پھر فنی یعنی ARTISTIC ہی وہ ذرائع تھے جن سے لوگ ایک دوسرے کو اطلاعات بہم پہونچاتے تھے۔ اور ان طریقوں کو مختلف ادوار سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

اب تو یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ بعض جانور اپنے ہم جنسوں سے مختلف آوازوں کے ذریعے گفتگو کرتے ہیں مثلاً شہد کی مکھیاں۔ یا وہیل WHALE مچھلی اور ڈالفن DOLPHIN شہد کی مکھیاں آپس میں مختلف خوشبوؤں، رقص، اور بازوؤں کی حرکت سے اپنی بات دوسری مکھیوں تک پہونچاتی ہیں۔ ڈالفن کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ آپس میں نہایت پراسرار صوتی ذرائع سے گفتگو کرتی ہیں۔ ایسے پرندے تو اکثر دیکھنے میں آتے ہیں جو کسی قدر کوشش سے انسانی آوازوں کی نقل کرنا سیکھ جاتے ہیں۔

مطالب کو دوسرے تک پہونچانے کا طریقہ قدیم زمانے سے رائج ہے۔ اب تو ریڈیو ٹیلیفون اور کمپیوٹر یہ کام سرانجام دیتے ہیں پہلے نقارے کی آواز سے بھی یہ کام لیا گیا ہے اور اب بھی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بعض جنگلوں کے قبائل ان ہی وسائل کو خبریں پہونچانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس امر پر سب ہی متفق ہیں کہ زبان کے آغاز کا مسئلہ اب تک لاینحل ہے یا یوں کہا جائے کہ تاحال حل نہیں ہوسکا ہے۔

۱۹۳۴ء میں ترکی میں زبان کے متعلق مسائل پر غور و خوض کے لئے ایک عظیم جلسہ منعقد ہوا جس میں مختلف ممالک کے معروف ماہرین لسانیات اور دانشور شریک ہوئے۔ اس جلسے میں دانشوروں نے جو تقریریں کیں ان میں بالاتفاق رائے یہ فیصلہ ہوا کہ ترکی زبان تمام دنیا کی مختلف زبانوں کی بنیاد ہے یعنی والدہ مکرمہ ہے۔

زبان کے بارے میں معلومات کا جو خزانہ مصدقہ طور پر پایا جاتا ہے وہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کا ہے اور متعدد زبانوں کا وجود ثابت کرتا ہے اگرچہ ان میں سے اکثر زبانیں اس طرح تلف ہوچکی ہیں کہ ان کے نشانات بھی شاذ و نادر ہیں زبانیں انقلابات کا شکار ہوجاتی ہیں، ہوتی رہی ہیں اور شاید آئندہ بھی ہوں۔ بدل بھی جاتی ہیں۔ زبانیں مر بھی گئی ہیں۔ کچھ زبانیں مر کے پھر زندہ ہوگئی ہیں بعض زبانیں ملک کے قوم کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت تغیر پذیر ہوجاتی ہیں لیکن اس قسم کے انقلابات زبان، ایک دو سال میں واقع نہیں ہوتے بسا اوقات سالہا سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ صدیوں میں کہیں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

زبان کے آغاز کا مسئلہ یہاں تک آنے کے بعد اس مرحلے پر پہونچتا ہے جہاں دنیا کے عظیم ترین اور محکم و معتبر ترین ذریعہ اطلاع سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور وہ ذریعہ معلومات ہے۔ قرآن پاک۔

زبان کے مسائل آغاز سے متعلق تحقیق و بحث کرنے والے محققین اور دانشوروں نے دنیا کے سارے منابع کھنگال ڈالے لیکن محض تعصب مذہبی کی وجہ سے اس عظیم کلام اللہ میں موجود تفصیلات کو نظر انداز کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ بیشتر محققین جو اس ضمن میں تحقیق کا کام کرتے رہے ہیں وہ سب مغرب کی پیداوار ہوا کرتے تھے جہاں کا مذہب عیسائیت ہے [illegible] مذہب اسلام کے بارے میں خاموش یا یکسر انکار کا رویہ اختیار کر لیا ہے لیکن قدیم زمانے میں علی الاعلان [illegible]

سہیل اختر

سخت ناقابلِ برداشت اذیت میری
اور پھر اس پہ یہ خاموش طبیعت میری

ڈال دی خواہش تکمیل پسِ پشت، مگر
پیش آجائے نہ مجھکو ہی ضرورت میری

جسم معمول کی دل دل میں دھنسا جاتا ہے
پھر بھی اُترتی نہیں آنکھوں سے یہ حیرت میری

تری گویائی نظر بند ہے، معلوم نہ تھا
گشت کرتی رہی گلیوں میں سماعت میری

آئے صحرا سے بگولے بھی عیادت کے لئے
ایسی بیمار پڑی شہر میں وحشت میری

کیا [illegible] ضرورت تو تصویریں لے لے
چھوڑ [illegible] یہ ساعت میری

جس کا عالم [illegible]
اب یہ عالم ہے [illegible] میری

● ۵۱ [illegible] ۷۵۱ (اڑیسہ)

اشہر ہاشمی

روز بلا دا مٹی کا ہے
آنا جانا مٹی کا ہے
روح کی تابانی سے روشن
جسم کا سونا مٹی کا ہے
سانسوں میں ہے مٹی کی لے
خوں میں نغمہ مٹی کا ہے
عشق، خلش، پہچان، نزاکت
سارا قصہ مٹی کا ہے
چاک کی حرکت، ہاتھ کی برکت
تیکھا تیکھا چہرہ مٹی کا ہے
ہاتھ میں ہاتھ دبانے والے
دھیرے! پنجہ مٹی کا ہے
تجھ سے بھی رشتہ نکلے گا
بیج حوالہ مٹی کا ہے
سوچ حقیر بدن کے بندے
سارا ڈھانچہ مٹی کا ہے
دل جیسا گل، اشہر صاحب
خوں کو تحفہ مٹی کا ہے

● ہاؤس نمبر ای - ۲۰۱، بلاک ڈی گلی نمبر ۱۲ لکشمی نگر - دہلی - ۹۲

سرفراز شاکر

جاگی آنکھوں کے خواب لگنے لگے
سارے منظر حباب لگنے لگے

ایسے میلے کہاں تھے بستی میں
رستہ رستہ عذاب لگنے لگے

کیا سروں سے گزر گیا پانی
کیوں جگنوں کے حساب لگنے لگے

رہ گئے سب الٹ پلٹ ہوکر
لوگ سارے کتاب لگنے لگے

دیکھتے دیکھتے بکھر جائیں
گھر کے بچے گلاب لگنے لگے

ہونٹ تر ہوں تو کس طرح شاکر
ابر پارے سراب لگنے لگے

● سوامی گیٹ، منگلیوں کی گلی - جودھپور

وزیر آغا

۵۸ - سول لائنز، سرگودھا - (پاکستان)

کچھ اپنوں کے بارے میں

پچھلے دنوں میں چند روز کے لئے اپنے ایک دوست کے گھر جا کر رہا۔ میرے اس دوست کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا مرغا اپنے حرم میں دندناتا پھرتا تھا۔ یہ مرغا خود نمائی، نخوت اور چالاکی کا ایک زندہ مجسمہ تھا اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے جبر اور دھینگا مشتی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے سوچا یہی مرغا جب جنگل کا باسی تھا تو دوسرے پرندوں اور جنگلی جانوروں کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا تھا اور اس کے ہاں "خواہش" بھی موسم کے آتار چڑھاؤ یا گرمی سردی ہی کے تابع تھی۔ مگر اب خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے! ویسے فطرت کے رنگ بھی نرالے ہیں یعنی جب اس کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے تو مادہ طبلہ عطار بن جاتی ہے اور اس کی خوشبو نر کو بے دست و پا کر کے رکھ دیتی ہے اور لیکن جب فطرت کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ خوشبو کو دوبارہ پنڈورا کے صندوق میں بند کر دیتی ہے اور نر مادہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان میں کوئی فرق بھی ہے۔ معاً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مرغے نے تہذیب کی یہ کروٹ غالباً انسان ہی سے مستعار لی ہے۔ کسی کا قول ہے کہ انسان ہی واحد جان دار ہے جو بغیر پیاس کے پانی پیتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مرغ جس نے نسل در نسل انسان کی صحبت میں زندگی بسر کی ہے اور جس کا لعاب انسان کی رگوں میں بھی موجزن ہے، اس کا تتبع کیوں نہ کرے؟ یعنی بغیر پیاس کے پانی کیوں نہ پئے، اور جب پانی پلانے والا لیت و لعل کرے تو اس سے بالجبر پانی کیوں نہ چھین لے؟

اگر مرغ نے انسان سے بغیر پیاس پانی پینا سیکھا ہے تو کتے نے اس سے کاروباری ذہنیت بطور تحفہ وصول کی ہے۔ میں جنگلی کتوں کا ذکر نہیں کر رہا کہ وہ تو اصلاً جنگل کی مخلوق ہیں اور فرار یا پیکار کے علاوہ انہیں کوئی تیسرا راستہ معلوم ہی نہیں، لیکن دیہات میں رہنے والے کتوں کو بھی دیکھئے کہ وہ کم از کم ہر غیر مانوس شے پر بھونکتے تو ہیں اور اپنی برہمی یا خوف کا برملا اظہار تو کرتے ہیں۔ دوسری طرف شہر والوں کے کتے۔ خدا بچائے! چاہے انھیں اپنے مالک یا مالکہ کی ساری عادات ناپسند ہوں مجال ہے کہ وہ اپنے رویے سے ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ بس یہی تاثر دیں گے کہ مالک یا مالکہ سے زیادہ انھیں کوئی چیز عزیز نہیں۔ حالانکہ اگر اتفاق سے انھیں ایک نیا مالک یا مالکہ میسر آجائے تو وہ اس سے بھی ویسی ہی وفاداری اور محبت کا اظہار کرنے لگیں گے۔ گویا ہر چڑھتے سورج کی پوجا ان کی گھٹی میں ہے۔ آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے کہ جب میں لاہور میں رہتا تھا تو ایک روز ایک پست قد سفید براق انتہائی خوبصورت کتا خراماں خراماں ہمارے گھر میں داخل ہوا اور سیدھا ڈرائنگ روم میں جا کر صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے افراد خانہ سے اس طور ملاقات کی جیسے وہ انھیں جنم جنم سے جانتا تھا۔ کھانے کے معاملے میں بھی اس نے کسی قسم کا تکلف نہ برتا۔ جب اس کے سامنے روٹی رکھی گئی تو اس نے اپنا منہ دوسرے طرف پھیر لیا۔ البتہ جب اسے بسکٹ پیش کئے گئے تو اس نے کچھ دلچسپی کا اظہار کیا مگر کھانے سے پھر بھی انکار کیا۔ پھر جب اسے بسکٹ دودھ میں ڈبو کر چینی کے پیالے میں پیش کئے گئے تو وہ انھیں بڑی رغبت سے کھانے لگا۔ دوسرے روز انگریزی اخبار میں "تلاش گمشدہ" کا ایک اشتہار چھپا

[illegible] مزاج اور شخصیت کا [illegible] حصہ بنا لیتے ہیں مگر دیہات کے اجتماعی مزاج کے وہ عکاس نہیں ہیں جب کہ شہر والوں کے کھیتوں میں کاروباری حافظ بھی ایک قدرِ مشترک کے طور پر سدا موجود رہتی ہے۔

لیکن انسانی معاشرے کو اگر کسی جانور نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ قبول کیا ہے تو وہ بھینس ہے۔ افریقہ کے جنگلوں میں پھرنے والی بھینس ایک مختلف قسم کی بریڈ BREED ہے۔ مجھے افریقہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ورنہ میں افریقی بھینس کو اس کی جنم بھومی میں آزادانہ پھرتے ہوئے ضرور دیکھتا، مگر میں نے اس کے بارے میں فلمیں دیکھی ہیں۔ فلمیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بھینس نے انسان کی معیت میں رہ کر تہذیب کے کتنے مراحل طے کر لئے ہیں۔ جنگلی بھینس تو دوسرے جنگلی جانوروں مثلاً زیبروں اور زرافوں وغیرہ سے مختلف نہیں ذرا سا کھٹکا ہوا اور وہ ہوا ہو گئیں۔ جب فرار کا کوئی راستہ نہ ملا تو سینہ سپر ہو گئیں۔ مگر انسان کے ساتھ رہنے والی بھینسوں نے انسانی تہذیب کے ان سارے بنیادی اصولوں کو اپنا لیا ہے جن کے بغیر انسانی معاشرہ کا رنگ محل آنِ واحد میں زمین بوس ہو جائے۔ پچھلے دنوں میں نے سرکلر روڈ پر بھینسوں کی ایک پوری قطار دیکھی جو چوراہے کے کسی سرخ سگنل کو دیکھ کر رکی کھڑی تھی۔ پھر جب سگنل کا رنگ سبز ہوا تو وہ چل پڑی اور ناک کی سیدھ میں بڑھتی چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ اصولوں پر بھینس سمجھوتہ کرنے کی قائل نہیں۔ چنانچہ سکوٹروں اور ٹرکوں اور موٹروں اور تانگوں کی ہزار التجاؤں کے باوجود بھینسوں کی اس قطار نے راستہ دینے سے انکار کیا اور خراماں خراماں راوی کی طرف چلتی رہی۔ میں سوچنے لگا کہ بھینس نے کیسی ہٹ دھرمی سے انسانی اخلاقیات کے تینوں سنگلاخ اصولوں کو اپنا لیا ہے یعنی سرخ سگنل پر رکنا، سبز سگنل پر چلنا اور ہمیشہ ناک کی سیدھ میں چلنا! انسانی معاشرے میں جس کسی نے اخلاقیات کے ٹریفک کے ان ضابطوں کی خلاف ورزی کی اسے [illegible] کیا ہے، مگر کیا آج تک کسی بھینس کو کسی بھی دفعہ کے تحت سزا کا حکم ملا ہے؟ — اس لئے نہیں کہ انسانی قوانین کا اطلاق بھینس پر نہیں ہو سکتا بلکہ اس لئے کہ بھینس نے آج تک انسانی اخلاقیات کا منہ چڑانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

پرندوں میں کوا واحد پرندہ ہے جس نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارا ہے۔ سنا ہے کہ کوا نوح کی کشتی میں بھی سوار تھا اور [illegible] کا پتہ لگانے کے لئے سب سے پہلے اسی نے [illegible] خدمات انجام دی تھیں۔ مگر بعد ازاں جب اس نے مارکوپولو اور کولمبس اور واسکوڈی گاما کی احمقانہ مہم جوئی کا منظر دیکھا تو اس کام سے توبہ کر لی اور پیغام رسانی کا دھندا اختیار کر لیا۔ ہماری کہانیوں میں تو کوا بچھڑے ہوئے پریمیوں کو ایک دوسرے کے پیغام ہی نہیں پہنچاتا بلکہ انہیں "ملاقات" کی ترغیب بھی دیتا ہے تاکہ نسلِ انسانی کے تسلسل میں ظالم سماج رخنہ انداز نہ ہو سکے۔ لیکن لگتا ہے کہ کوا بہت جلد اس دھندے سے بھی اکتا گیا۔ کیونکہ یہ ایک بدنامِ زمانہ پیشہ تھا۔ اور پھر اس میں مادی فائدہ تو مطلق نہ تھا۔ انسان کے آنگن میں رہتے ہوئے کوے کو بھی مادی فائدہ کی اہمیت کا احساس پوری طرح ہو گیا تھا۔ چاہے یہ فائدہ راست اقدام سے حاصل ہو یا غلط اقدام سے، بلکہ اس نے دیکھا کہ غلط اقدامات نسبتاً زیادہ سود مند تھے۔ سو اب اس نے چوری کا پیشہ اختیار کیا اور انسانی تہذیب کا ایک اٹوٹ انگ بن گیا۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ کوا محض اتفاقاً یا غیر ارادی طور پر چوری کا مرتکب نہیں ہوتا اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ایک بار میں نے ایک کوے کو چوری کرتے دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہ کیسے ایک مشاق اور خاندانی چور کی طرح چوری کے مختلف مراحل سے گزرا تھا۔ میں نئی دہلی کے رنجیت ہوٹل کی دوسری منزل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک صبح میں کھڑکی میں سے نچلی منزل کے برآمدے کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک کوے پر پڑی جو نپے تلے قدموں کے ساتھ چاروں اطراف کا جائزہ لیتا جھوٹے برتنوں کی اس ٹرے کی طرف آ رہا تھا جسے ہوٹل کا ویٹر ایک کمرے کے باہر رکھ کر چلا گیا تھا۔ وہاں چاروں طرف مکمل سناٹا تھا اگر کوے کی جگہ کوئی اور پرندہ ہوتا تو بغیر کسی جھجک یا شرم کے سیدھا ٹرے پر آ بیٹھتا اور خوانِ یغما کے مزے لوٹ کر اڑ جاتا۔ لیکن کوا احساسِ جرم میں پوری طرح بھیگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جو کام کرنے چلا ہے انسانی اخلاقیات میں قابلِ تعزیر ہے اور چوری کہلاتا ہے چنانچہ وہ دبے پاؤں چاروں طرف نظر دوڑاتا ٹرے کے پاس پہنچا۔ ایک بار پھر اس نے دزدیدہ نگاہوں سے پورے ماحول کا جائزہ لیا۔ جھجکا ٹھٹکا، آگے بڑھا۔ تب اس نے ایک جست میں ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اپنی چونچ میں دبایا اور اس تیزی سے اڑا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک پوری بٹالین نے اس پر حملہ کر دیا ہے حالانکہ وہاں اب بھی مکمل سناٹا تھا اور ویٹر کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ

[illegible] نے نہ صرف چوری کرنا انسان سے سیکھا ہے بلکہ اسے اس کا [illegible] بھی انسان ہی سے ملا ہے۔ انسان کا تشفی وفا ہی کرتا ہے مگر اسے کبھی احساس جرم نہیں ہوتا گویا تہذیب کے ارتقا میں [illegible] پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

گھوڑے سے انسان کے تعلق خاطر کی داستان نسبتاً مختلف نوعیت کی ہے۔ کسی زمانے میں گھوڑا بھی جنگل کا باسی تھا اور انسان کی بو سونگھتے ہی ہوا ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ سرتاپا ایک "سُم" تھا۔ اس کی ساری شخصیت "سُم" میں مرتکز ہو گئی تھی۔ دوسری طرف انسان کے پاس کوئی سُم نہیں تھا جو اسے رفتار سے لیس کرتا لہٰذا انسان نے گھوڑے پر ڈورے ڈالے اور رفتہ رفتہ اس سے دوستی کر لی پھر اس نے پیار ہی پیار میں اسے پہلے تو لگام کا غلام کیا پھر اس پر زین کس دی۔ اس کے بعد انسان اور گھوڑا ایک جان دو قالب ہو گئے۔ اس زمانے میں گھوڑے اور اس کے سوار کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دو ہستیاں ہیں۔ بالخصوص میدان جنگ میں تو یہ دونوں یکجان ہو کر لڑتے تھے۔ گھوڑے نے ان میدانوں ہی میں انسان کی خونخواری کا تتبع کیا۔ چنانچہ وہی گھوڑا جو کبھی مجسم "سُم" تھا اور ذرا سے کھٹکے پر ہوا ہو جاتا تھا، انسان کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد اب ثابت قدم اور جان ہار کہلایا۔ شدہ گھوڑا انسان کی فتح مندی کا سمبل بن گیا۔ بالخصوص اشومیدھ یگیہ کی رسم میں گھوڑے کا یہ علامتی انداز ابھر کر سامنے آیا۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی راجہ، مہاراجہ کہلانے پر بضد ہوتا تو اپنے خاص الخاص گھوڑے کو کھلا چھوڑ دیتا اور ایک فوج اس گھوڑے کے ساتھ روانہ کر دی جاتی۔ اگر کسی رجواڑے کا کوئی بدنصیب راجہ اس گھوڑے کو روکنے کی کوشش کرتا تو گھوڑے کے رکھوالے اسے تہ تیغ کر دیتے جب گھوڑا وسیع خطوں کو زیر پا لانے کے بعد واپس راجدھانی میں آتا تو راجہ کو مہاراجہ کا لقب مل جاتا اور اس خوشی میں گھوڑے کی قربانی کی رسم ادا کر دی جاتی۔ یہ گھوڑے کا عروج تھا مگر آج [illegible] اپنے اس منصب سے محروم ہو چکا ہے۔ اب وہ کھیتوں میں [illegible] ہے اور شہروں میں تانگہ کھینچتا ہے۔ مگر لطف کی بات یہ [illegible] گھوڑے اور انسان کا رشتہ اب بھی برقرار ہے۔ پہلے یہ رشتہ [illegible] راکب اور مرکب کا رشتہ تھا جس کی بنیادی صفت خوں خواری [illegible] اب یہ دو مزدور بھائیوں کا رشتہ ہے اور اس رشتے کی بنیادی صفت مشقت ہے۔ بہرحال یہ رشتہ بہرحال قائم ہے۔

.. مگر میں پوچھتا ہوں کیا یہ کیفیت ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا کیا وہ زمانہ نہیں آئے گا جب انسان واپس فطرت کی گود میں جائے گا جہاں معصومیت سے زیادہ معصومیت، بھیڑیا سے پیار، بکری سے خرام، شیر کی سے مامتا اور خرگوش سے امن پسندی سیکھے گا؟ کیا لوگوں نے جانوروں کے ساتھ خونخواری، جنسی بربریت، قوت آزمائی اور جانے کیا کیا کچھ منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ ان جملہ اوصاف حمیدہ کے سلسلے میں "حسن کارکردگی" کا اعزاز تو انسان ہی کو ملنا چاہیئے۔ جانوروں میں تو سماجی شیرازہ بندی اور اپنے ماحول کو جیت اور معصومیت سے دیکھنے کا رجحان عام ہے حد یہ کہ شیر بھی اتنا ہی شکار کرتا ہے جتنا اسے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے درکار ہوتا ہے دوسری طرف جب انسان خون بہاتا ہے تو اس میں لذت بھی محسوس کرتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ تہذیب کی دیواروں میں مقید ہو کر انسان کے سارے اعمال ہی غیر فطری بلکہ ابنارمل ہو چکے ہوں یا وہ ایک طرح کے نسلی پاگل پن میں مبتلا ہو چکا ہو۔ یقیناً ایسی ہی کوئی بات ہو گی۔ کیونکہ ایسا نہ ہوتا تو فاختائیں، چڑیاں، خرگوش اور جنگل کے دوسرے چرند اور پرند اس کی وحشی آنکھوں، ننگے بدن، دو ٹانگوں پر بالکل سیدھا کھڑے ہونے کے انداز اور ان سب سے زیادہ اس کی جنونی سرشت کو دیکھ کر مارے خوف کے بے حال نہ ہو جاتے۔ رہا ان جانوروں کا مقابلہ جو انسان کے تہذیبی دائرے میں سمٹ آئے ہیں تو میں انھیں جانور ماننا ہی کب ہوں۔ میرے نزدیک تو یہ سب انسان کی توسیع ہیں۔ اس کے بدن سے پھوٹے ہوئے اعضاء ہیں۔ اس کی منہ زور خواہشات کی برہنہ تجسیم ہیں۔ انھیں جنگل کی مخلوق قرار دینا کسی صورت بھی جائز نہیں!

✤

شہرام سرمدی

کچھ خوشی کچھ ملال ہے صحرا
پیکرِ ماہ و سال ہے صحرا

پیاس کے بیکراں سمندر میں
ایک دلکش خیال ہے صحرا

فکر کی برف پوش چوٹی پہ
ایک مبہم سوال ہے صحرا

ہیں تصرف میں میرے بحر و بر
دل سمندر ہے، حال ہے صحرا

آج کیوں آسماں نہیں رہتا
آج بھی تو نڈھال ہے صحرا

اک فطرت کی چال ...
آدمی کی مثال ہے صحرا

سجّاد حسین

نصیب میرے بھی کوئی کہیں ڈگر لکھ دے
اگر عذاب ہی لکھنا ہے عمر بھر لکھ دے

سفر سراب کا سائے اداس راتوں کے
تمام کرب میرے نام ہمسفر لکھ دے

ہزار راستے بدلے گا وہ کہ پانی ہے
کہاں نصیب ہے ہجرت مجھے شجر لکھ دے

مجھے یقین ہے میرا وجود سالم ہے
یہ اعتماد ہے میرا اسے ہنر لکھ دے

تمام حصول بھی تیرے جنوں میں شامل ہے
مشقتوں کی برف راتوں میں اک شرر لکھ دے

جہاں ولا، چھاتہ پورہ۔ سری نگر۔ ۱۵ (کشمیر)

نسرینہ زرّین

برکھا رُت میں بادل لے کر کس کا سندیسا آیا ہے
آنکھیں ایسے شرمائیں کیوں، آنچل کیوں لہرایا ہے

گزرے لمحے تتلی بن کر لوٹ آئے ہیں آنگن میں
آنکھوں میں پھر جگنو چمکے، چہرہ مگر سکایا ہے

گل ہی نہیں ہے، خوشبو بھی ہے، بلبل بھی ہے نغمے بھی
تم آئے ہو گھر جو ہمارے، کیا موسم آیا ہے

چاہ کی شدت شبنم بن کر قطرہ قطرہ پھیل گئی
کیوں تم نے آئینہ دیکھا؟ بیچارہ شرمایا ہے

قریہ قریہ کیسی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، دیکھو تو
کس نے زرّیں سرگوشی کی، کس نے ہمیں تڑپایا ہے

۳۰/ اے آغا مہدی اسٹریٹ، چوتھا منزلہ۔ کلکتہ ۔ ۹

سعید انجم

NEBBEJORDET 15, 0656 OSLO 6
NORWAY

قدروقامت

"پاکستان میں قیام کے دوران مجھے ایک بات اچھی لگی اور ایک بری" ہفتے کی شام مونیکا نے بتایا

"بری بات کیا تھی؟" دھڑکتے دل سے میں نے پوچھا۔

"سواری!" اس نے جواب دیا "صدر، وزیراعظم اور گورنر قسم کے وی آئی پی لوگوں کی سواری۔ جس کے باعث ٹریفک روک دی جاتی کئی کئی گھنٹوں کے لئے ہمارے طے شدہ پروگرام چوپٹ ہو جاتے۔"

"اور اچھی بات۔ وہ کیا تھی؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"میری ایک دریافت!" اس نے بتایا

"کیا؟ ہمارا تجسس بڑھ گیا

"اردو ایک آسان زبان ہے۔" مونیکا بولی

"واقعی؟؟"

"ہاں!" اس نے بتایا "جو لفظ بھول جاؤ۔ اس کا انگریزی متبادل استعمال کرو۔"

"اس بات کو تم دریافت کیوں کہہ رہی ہو" بیگم نے پوچھا

"اس لئے کہ اوسلو میں کورس کے دوران یہ کسی نے بتایا ہی نہیں۔" مونیکا نے جواب دیا۔ "اپنے تجربے اور مشاہدے سے میں نے خود اسے دریافت کیا۔"

"یہ تو تھیں مذاق کی باتیں۔ ہمارے ٹکٹ ہوتے مزید یہ کہ دہ بھلا۔ پاکستان میں سب سے اچھے تھے میرے میزبان۔ تم لوگوں کے عزیز واقارب اور دوست واحباب جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ تھے وہاں کے کھانے۔ ہر روز ناشتے میں مجھے پراٹھا ملتا اب بریڈ بدذائقہ لگتا ہے۔ پھر پھل اور پھل وہاں پر بہت تھے۔ خوشبو، رنگ اور ذائقوں نے بہت مزہ دیا۔"

جب اس نے تحفے تحائف نکالے تو ہفتے کی شام سب کچھ بازار

میں گرم جوشی بڑھتی چلی گئی۔ جوں ہی مونیکا نے تصویریں نکالیں بچوں نے ٹی وی بند کر دیا۔

"میں تو پراٹھے کا ناشتہ کروں گا۔" اتوار کی صبح میرے بیٹے نے فرمائش کی۔

"ابھی بنا دیتی ہوں۔" میری بیوی بولی "لیکن ایک شرط ہے"

"کیا؟" یاسر نے پوچھا۔

"ناشتے کے بعد اپنے ابو کو تم اردو پڑھ کر سناؤ گے"

"ٹھیک ہے!" ہمارے بیٹے نے حامی بھر لی

"تم پراٹھا کھاؤ گے؟" بیگم کی شرطیہ نظریں اب میری طرف اٹھیں۔

"سبق میں سن لوں گا۔" مجھے اپنی بیوی کے عزائم کا اندازہ ہو گیا پراٹھے کے ذکر سے میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ میں نے ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا۔

"اردو کی تیسری کتاب" میں "اسلامی مساوات" پہلا سبق تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے پڑھنا شروع کیا: حضرت عمر اپنی خلافت کے زمانے میں شام کے ملک کو جانے والے تھے۔ ایک غلام بھی ان کے ساتھ تھا۔ اونٹ ایک ہی تھا۔ اس پر سامان بھی لدا ہوا تھا اس لئے صرف ایک ہی آدمی سوار ہو سکتا تھا۔ سفر شروع ہوا تو حضرت عمر اور غلام باری باری اونٹ پر [illegible]

اسی طرح [illegible]

مجھے پتا ہے پروجیکٹ فوراً یاد آگیا۔ سٹی یونیورسٹی کے مرکز میں [illegible]
کے [illegible] ورکشاپ ہو رہی تھی۔ "اقدار اور اعمال" کے موضوع
پر گفتگو کرنا تھی۔

"اس سلسلے میں کچھ مواد میرے ہاتھ لگا ہے۔" گرو بابا نے بتایا
"وہ لینے کے لئے میں کب آؤں؟" میں نے بے صبری سے
پوچھا۔

"بے شک ابھی آجاؤ۔" وہ بولے "ویسے جب جی چاہے جب
وقت ہو۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔

"اب تم گرو بابا کے ہاں جاؤ گے؟" میری بیوی بولی

"تم نے کیسے جانا؟" میں نے پوچھا۔

"چھٹی کے دن اگر وہ فون کریں تو تم ان کے پاس ضرور جاتے
ہو۔" اس نے اپنا تجربہ بتایا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔"

بچہ اردو کا سبق ختم کرے تو چلے جانا۔ محترمہ اچھے موڈ میں تھیں
چھٹی کے دن میرا گھر سے اکیلے کہیں جانا میری بیوی کے تن
بدن میں آگ لگا دیتا۔ پردیس کے تلخ تجربوں کی ساری کڑواہٹ
اس کے لہجے میں فوراً گھل جاتی۔ جو کچھ بھی وہ کہتی اس کا لب لباب
یہ ہوتا کہ میں تو کہیں کوئی جشن منانے جا رہا ہوں اور وہ بیچاری
ماتم کرنے کے لئے اکیلی رہ جائے گی۔ گویا میرے بعد محض سینہ کوبی اس
کا مقدر ہوگا۔ بغیر کسی دلاسہ دینے والے کے جو اس کے ہاتھ
روک سکے یا آنسو پونچھ سکے۔ لیکن ایک بات حیرت انگیز تھی جب
کبھی میں گرو بابا کے ہاں جانے کی بات کرتا تو وہ چپ رہتی۔ نہ
اس کی آنکھیں چھینتیں اور نہ اس کی زبان چلتی۔

اچھا! کبھی اس بھید کی کھوج بھی لگائیں گے۔ میں نے
دل ہی دل میں سوچا۔

یاسر نے آگے پڑھنا شروع کیا: اسلامی فوج کے مجاہد
شہر سے باہر نکل کر حضرت عمرؓ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ عیسائی یہ
سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے خلیفہ بڑی شان و شوکت والے ہوں گے
اس لئے وہ بھی انہیں دیکھنے کے لئے آگئے تھے۔ اتنے میں گرد
و غبار اڑتا نظر آیا۔ [illegible] حضرت عمرؓ دکھائی دیئے کسی
عیسائی نے مسکراتے ہوئے ایک مجاہد سے پوچھا۔ [illegible]

"خلیفہ [illegible] پر سوار ہیں؟" مجاہد نے [illegible] "نہیں جناب
خلیفہ تو وہ ہیں جن کے ہاتھ میں اونٹنی کی مہار ہے اور جو اونٹنی پر
سوار ہے وہ ان کا غلام ہے۔" عیسائی اس مساوات کو دیکھ کر
حیران رہ گئے۔

"سبق ختم!" کتاب بند کرتے ہوئے یاسر نے کہا

"پرانا ہضم" میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
مجھے اب گرو بابا کے ہاں جانے کی تیاری کرنا تھی۔

"اقدار اور اعمال" کے حوالے سے میری ڈائری میں
فی الحال ایک ہی نوٹ تھا کہ ایک زمانے میں بادشاہ کا سامنا
ہوتے ہی عوام کے سر جھک جاتے تھے اور اب یہ زمانہ آگیا ہے
کہ منتخب ہونے والا صدر سر جھکا کر اپنے ووٹروں کا شکریہ ادا
کرتا ہے۔ مزید مواد کی امید میں کاغذ پنسل میں نے جیب میں
رکھے اور نکل پڑا۔

"آپ کس مواد کی بات کر رہے تھے؟" گرو بابا کے ہاں
پہنچتے ہی میں نے پوچھا۔

جلی حروف میں لکھے نام والی ایک کتاب انہوں نے اٹھائی
"میڈان ناروے" نیچے ایک ذیلی سرخی تھی "نارویجن دوسروں
کی نظر میں" کتاب کو وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے
"پہلا باب عرب کے ایک بزنس ایگزیکٹو کے بیان سے شروع
ہوتا ہے۔ اسے تم پڑھ لو۔"

کتاب میں نے لی۔ یہ ۱۹۸۸ء میں ناروے سے شائع
ہوئی تھی اور انگریزی زبان میں تھی۔ پہلا باب نکال کے میں نے
پڑھنا شروع کیا۔ مجھے یاد ہے جب تخت کا وارث شہزادہ ہارالڈ
(ناروے کا موجودہ بادشاہ) شاہ خالد سے تعزیت کرنے کیلئے
سعودی عرب آیا تو شاہی آداب کا خیال رکھنے والے بعض لوگوں
کی آنکھیں حیرانی سے پھیل کر رہ گئی تھیں۔ سعودی عرب میں شاہی
خاندان اور کئی دوسرے کاروباری لوگوں کے پاس ذاتی جیٹ
طیارے موجود ہیں اور ناروے کا شہزادہ ایک مسافر کی طرح
عام مسافر جہاز سے پہنچا تھا۔

ایک دوسرے موقع پر ایک نارویجن ملاح کو اپنے بحری
جہاز پر ایک خوفناک حادثہ پیش آگیا جس سے اس کی کھوپڑی پر
ضربیں آئی تھیں۔ سعودی کے کسی بھی ہسپتال کے لئے یہ کیس

[illegible] حقیقی تھا جب [illegible] آیا تھا

[illegible] سے چند ہی [illegible] تو [illegible] ایمرجنسی [illegible] نے سمجھا کہ [illegible] کے کسی اعلیٰ عہدیدار کا بیٹا ہے۔ آپ ان کے چہروں کی حیرانی کا اندازہ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایک نام شہرہ تھا اور اسے عام طبی سہولت مہیا کی جا رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ فاتح کو برین سرجری (دماغ کی جراحی) کے لئے نارمل سے جانے کے لئے ایک پرائیویٹ جیٹ طیارہ ڈاکٹر اور نرسیں لے کر آیا تھا۔

" پڑھ چکے ؟ " گروبابا بولے

" جی ! " میں نے جواب دیا

" اپنے سوال کا جواب تمہیں مل گیا ؟ " انہوں نے پوچھا

" معلوم نہیں۔ " میں نے بتایا

" کیوں ؟ " وہ حیرانی سے بولے ، " تم نے پوچھا تھا اعلیٰ اقدار کیسے تخلیق ہوتی ہیں ؟ "

" جی ! " میں نے اتفاق کیا۔

" تو جواب یہ ہے کہ اعلیٰ اقدار انسان کے اعلیٰ اعمال [illegible]

[illegible]

رات کو سونے سے پہلے میری بیوی نے گروبابا کے پاس میرے جانے پر پوچھا تو بولنے کے بعد خود ہی کھلکھلا دیا کہ اس نے بتایا کہ جاتے ہوئے میں جتنا بھی بے چین ہوں واپسی پر کوئی بے چینی میرے ساتھ نہیں ہوتی۔

" آج صورت حال مختلف ہے۔ " میں نے اسے بتایا

" کیوں ؟ " اس نے پوچھا

" مجھے مغرب کی نئی نسل کے لئے مشرق کی ہم عصر دنیا سے اعلیٰ اقدار کی مثالیں درکار تھیں اور گروبابا نے بیٹھے مغربی شہزادوں کے قصے۔ " میں نے جواب دیا۔

" انسان کو دوسرے کی تھالی کا لڈو بڑا لگتا ہے۔ " میری بیوی نے کہا۔ پھر وہ چٹکی بجا کر بولی " تم مونیکا سے بات کرو شاید اس کے پاس مشرقی شہزادوں کا کوئی قصہ ہو۔ "

" شاید ؟ " میں نے کہا اور بتی بند کر دی۔ ◆

[زیر تصنیف قیام نامہ نارسے " آدھی رات کا سورج " ایک باب]

◆ بقیہ صفحہ ۲۴ ۔ اردو ادب میں بے ادبی کی تاریخ ◆

تمور صلیبی جنگوں کی صورت میں بھی تھا۔ ایسے لوگ نہ تو قرآن کریم سے واقفیت رکھتے تھے نہ غالباً کسی نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ قرآن پاک سے استفادہ کریں۔

دراصل تحقیقات کی ساری بنیاد ہی غلط ہے کسی خاص تحریک کے بغیر لوگوں نے یہ مفروضہ بالعموم تسلیم کر لیا کہ قدیم انسان صوتی اور نطقی آلات رکھنے کے باوجود گفتگو کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا صرف اشاروں سے کام چلاتا تھا۔ امریکہ میں بنی ہوئی بعض فلمیں اسی کو نشاندہی کرتی ہیں۔ اسی طرح بعض مغربی کتب میں بھی ایسے ہی مشاہدات اور تصاویر ہیں۔ ان تمام شواہد نے ایک عام خیال پیدا کر دیا کہ انسان بولتا نہیں تھا۔ ڈارون کی تخلیق نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا اس لئے کہ اگر اس کے نظریہ کے مطابق بندر۔ انسان بن گیا تو ظاہر ہے کہ بندر کو خوخیانے کے سوا اور کیا آتا رہا ہوگا۔

انسان جس تجسیم کے ساتھ وجود میں آیا وہ اس کی ساری جسمانی ساخت اور اعضا کی تکمیل کی حالت تھی احسن الخالقین کے بارے میں یہ سوئے ظن ممکن نہیں کہ اس نے نامکمل مخلوق پیدا کر دی ہوگی۔ یعنی انسان کے سارے اعضا اور آلات بعینہٖ اسی حالت میں صدیٔ اول سے موجود تھے جس طرح زمانہ حال میں پائے جاتے ہیں ان میں آلات نطق بھی شامل ہیں۔ ◆

[زیر تکمیل کتاب کے چند صفحات]

شاعر

ہم عصر اردو ادب نمبر

۹۶-۱۹۹۵ء

[دو جلدوں میں]

اردو شعر و ادب کا ایک خوب صورت

عالمی گاؤں

✪

اس عظیم تخلیق عالمی گاؤں کی جلدوں میں اپنی مصنوعات کے اشتہارات بھی شامل کیجئے۔ قارئین و قلم کار حضرات رعایتی شرح پر اشتہارات دیں۔ ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر نرخ نامہ طلب کیجئے۔ بڑے اور معیاری اشتہارات کی فراہمی میں آپ سے تعاون کی گذارش ہے۔